مُصنّف

نمبر

مجلس مُصنّفین علیگڑھ کا سہ ماہی علمی رسالہ

ستمبر ۱۹۴۸ء

مُدیر و ناشر

سیّد الطاف علی بریلوی۔ بی۔ اے (علیگ)

قیمت سالانہ:- للعہ چار روپے

بیت المصنف

کانفرنس کمپاؤنڈ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ یو۔پی

باہتمام منظور احمد خاں مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ طبع شد

مُصنّف

جلد ۶ | بابت ماہ ستمبر ۱۹۴۸ء | نمبر ۲۲

فہرست مضامین

ایڈیٹوریل مصنف علی گڑھ (سہ ماہی) بابتہ ستمبر ۱۹۴۸ء

مسلمان۔ انسان اور انسانیت

قصہ زیست کا کہہ تو چکا ہوں رات ابھی کچھ باقی ہی

اپنے دل کا اور لگا دوں ٹکڑا اس افسانے میں

گذشتہ ششماہی فی الجملہ اچھی گذری۔ ہندوستان کی مرکزی۔ صوبائی اور مقامی حکومتوں نے ہزایکسلنسی مسٹر راجگوپال آچاری اور آنریبل پنڈت جواہر لال نہرو کی پُرخلوص قیادت میں قیام امن اور مسلم اقلیت کے ساتھ بہتر سلوک کرنے میں کافی پیش قدمی کی جس کو ہر فرد مسلم شکر گذاری کے ساتھ محسوس کرتا ہی۔ اکھڑے ہوئے قدم از سر نو جمنے لگے اور لوگوں نے مفسدانہ تخیلات سے اپنے دماغوں کو آزاد کر کے تعمیری کاموں کی طرف لگانا شروع کر دیا ہی۔

اِکّا دُکّا فساد (جیسا کہ ابھی آگرہ میں ہوا) اور کشمیر و حیدرآباد کی خلش باقی ہی۔ وہ بھی دور ہو گئی تو یقین ہی کہ حسب ضرورت یکسوئی نصیب ہو جائے گی۔ ایک امر البتہ قابلِ ذکر ہی کہ مسلمانوں میں عام طور پر احساس کمتری اور غیر مسلم برادرانِ وطن میں احساسِ برتری پایا جاتا ہی۔ اس کیفیت کا نہ معلوم کیوں قدم قدم پر احساس ہوتا ہی۔ سفر ہو یا حضر خود اعتمادی زائل ہو گئی ہی۔ فاتح اور مفتوح کا سا فرق روزمرہ کی زندگی میں معلوم ہونے لگا ہی۔ کہا جاتا ہی کہ چونکہ ہند یونین کے مسلمانوں نے مسلم لیگ اور پاکستان کی پُرزور حمایت کی تھی لہٰذا اس کا یہ ردِ عمل ہی لیکن جن لوگوں نے حمایت نہیں کی وہ بھی عام طور پر بے جان اور افسردہ نظر آتے ہیں۔ آخر الذکر جماعت نے مدت العمر بڑے استقلال و پامردی کے ساتھ برسر اقتدار جماعت۔ کانگریس کا ساتھ دیا۔ تکالیف اٹھائیں اور قربانیاں دیں۔ ان کو تو یقیناً مطمئن اور پُرجوش ہونا چاہیے تھا۔ مگر در اصل ایسا نہیں ہی

وہ بھی بقول شخصے "روحانی تپ دق میں مبتلا ہیں"

عام مسلمانوں اور نیشلسٹ مسلمانوں کے برعکس ہمارے ایسے غیر مسلم برادران وطن جنہوں نے آزادی ملک کی تحریک میں کبھی ایک تنکا نہیں اٹھایا محض اس بنا پر کہ وہ غیر مسلم ہیں (پناہ گزینوں کے ماسوا) چین کی بنسری بجا رہے ہیں۔

چونکہ بدقسمتی سے ایشیائی ممالک میں ابھی تک انسانوں کی تقسیم مذہبی بنیادوں پر ہوتی ہے اور اس میں ہندوستان کا استثنیٰ نہیں ہے۔ اس لئے مندرجہ بالا صورت حال پر بھی صبر آجانے کی گنجائش ہے۔

"مَیں مسلمان ہوں۔ میں نے مسلمان ہی رہنے کا تہیہ کیا ہے لہٰذا اس کی جو بھی سزا دی جائے مجھے قبول کرنی چاہیئے" لیکن ایک بات پر صبر نہیں آتا۔ اور نہ آسکتا ہے۔

جن لوگوں نے مسلم لیگ اور پاکستان کا ہند یونین کے مسلمانوں کو حامی بنایا۔ ملک کی تقسیم کرائی اور پاکستان کو عملاً وجود میں لائے۔ ان کے ٹھاٹ پہلے سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ گورنمنٹ پاکستان کے نمائندے بن جانے کے بعد اُن کے سارے کبیرہ گناہ معاف ہوگئے۔ کٹر سے کٹر مسلم لیگی لیڈر ہماری سرحد کے اُس پار کا ہوجانے کی وجہ سے جب یہاں آتا ہے تو اُن کی عزت و توقیر میں کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ گورنمنٹ ہاؤسوں میں مہمان ہوتا ہے۔ پُرتکلف ڈنر کھاتا ہے سرکاری موٹریں اُن کی خدمت میں رہتی ہیں۔ جان و آبرو کی حفاظت کا انتہا درجہ اہتمام ہوتا ہے۔ اس کو کوئی صدمہ ہو تو ہمدردی کے تار اور خوشی ہو تو پیغامات تہنیت بھیجے جاتے ہیں حالانکہ اس نے اپنے علاقہ میں ہندوؤں اور سکھوں کو برباد کیا اور آج بھی علانیہ کشمیر میں ہماری حکومت سے برسرِ پیکار ہے اور ڈنکے کی چوٹ حیدرآباد کی حمایت کر رہا ہے لیکن ہمارے برادرانِ وطن اور حکومت پھر بھی اس کی بات سنتی ہے۔ تقریریں۔ اخباری بیانات اور تصویریں کو چھاپتی ہے۔

ہند یونین کے شکست خوردہ مسلمان۔ کان دبائے اور منہ چھپائے پڑے ہیں۔ آواز نکالتے ہیں اور سانس بھی لیتے ہیں تو احتیاط سے۔ قدم اٹھاتے ہیں تو پھونک پھونک کر پچھلے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔ آئندہ کی وفاداری کا یقین دلاتے ہیں مگر پاکستان اور حیدرآباد سے ہمدردی اور محض ہمدردی کے مفروضہ الزام سے وہ بری نہیں ہوسکتے۔ قابل تعزیر ہی رہتے ہیں۔ اخبارات اور قومی رہنماؤں کے غم و غصہ کی ساری تانیں انھیں پر

ٹوٹتی ہیں ؎

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

ایک عامی مسلمان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ اور نہ آسکتی ہے۔ لہذا وہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوتا ہے کہ عزت اور راحت۔ امن اور چین۔ زبان۔ کلچر۔ مذہب اور زندگی کی تمام دوسری قدروں کا تحفظ و اعتراف طاقت اور صرف طاقت پر موقوف ہے۔ انسانیت اور اصولِ انسانیت کی بنا پر انسانوں کے ساتھ حُسنِ سلوک میں ابھی دیر ..... اور بہت دیر ہے۔

اس صورتِ حال کا کیا علاج ہے؟ ہند یونین کی "غیر فرقہ وارانہ اور غیر مذہبی حکومت" کے زیر سایہ اپنے حال و مستقبل کا اطمینان حاصل کرنے کے لئے وفاداری کا اعلان کرتے کرتے تو دل تھک گیا اور زبان گھس گئی۔ مگر عنقاء "اعتبار" ہات نہ لگا۔ چنانچہ امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام صاحب آزاد بھی مسلمانوں کو یہ نصیحت کرنے پر مجبور ہوئے کہ

"بار بار اظہارِ وفاداری کر کے وہ اُسے مضحکہ خیز نہ بنائیں"۔ اسی طرح آنریبل پنڈت جواہر لال نہرو نے "مسلمانوں سے طلبِ وفاداری کے فعل کو سفاہت سے تعبیر کیا"۔

ان بزرگوں کی ہدایات کی روشنی میں اظہار و اقرارِ وفاداری کا سہارا بھی ختم ہوا اور سوال پیدا ہوا کہ آخر پھر کیا کریں؟

ہم اسی فکر میں غلطاں و پیچاں تھے کہ گورنمنٹ یو۔ پی کے شائع کردہ اخبار "اطلاعات" کا آزادی نمبر ہاتھ میں آیا۔ اور اس میں آنریبل حافظ محمد ابراہیم صاحب کا مفکرانہ مضمون "مسلمان اور ہندوستان" نظر سے گزرا جس سے بلاشبہ وہ روشنی نصیب ہوئی جس کی تلاش تھی اور جو ایک مسلمان کے مزاج اور اس کی فطری ساخت کے عین مطابق ہے۔

حافظ ابراہیم صاحب فرماتے ہیں:۔

(۱) میں باوجود اس کے جو ہندوستان میں آزادی آنے کے بعد ہو چکا ہے۔ یقین رکھتا ہوں کہ فرقہ پروری کو ہندوستان سے رخصت ہونا چاہیئے۔

(۲) جو شہری اس کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے وہ ہندوستان کی سب سے بڑی خدمت انجام دیتا ہے

(۳) وہ شہری جو مسلمان مذہب رکھتا ہے اپنی خود اعتباری اور استقلال کو قایم رکھ کر اس ملک کو عظمت کی طرف لے جانے کے لئے سب کچھ کر سکتا ہے۔

(۴) مسلمانوں کی تاریخ بتلاتی ہے کہ وہ جہاں گئے انھوں نے ملک کو بنایا۔ اس کی خدمت کی۔ ہندوستان میں بھی وہ عاجز نہیں رہ سکتے۔

(۵) مسلمانوں کو اپنے قول و عمل سے ہندوستان کے بننے اور اس کے اونچا رکھنے میں صرف مذہبی نہیں بلکہ اس کے لئے اپنے آپ کو لیڈر بنانا ہے۔

مطلب یہ کہ ہند یونین کے ساڑھے چار کروڑ مسلمان اپنے کو "مظلوم رعایا" اور تیس کروڑ غیر مسلموں کو "حاکم اعلیٰ" سمجھ کر اپنے اوپر جو پست ہمتی اور شکست خوردگی طاری کئے ہوئے ہیں اسے دور کریں اور خالصاً لوجہ اللہ ملک و ملت کی خدمت گذاری کے لئے میدان عمل میں نکل آئیں

تڑپ صحن چمن میں آشیاں میں شاخساروں میں — جدا پارہ سے ہو سکتی نہیں تقدیر سیمابی

ابتدا میں ممکن ہے ان پر طعنہ زنی کی جائے۔ نیت پر شبہ کیا جائے۔ ان کے متعلق غلط فہمیاں پیدا ہوں اور وہ مصائب و مشکلات تک کا شکار رہوں لیکن جب ان کی بے لوث ملکی و ملی خدمت۔ نیک نیتی اور جذبۂ اہلیت کار کا کافی مصدقہ ثبوت فراہم ہو جائیگا تو کامیابی و کامرانی خود بخود ان کے قدم چومے گی اور وہ آزاد ہند کے صحیح معنی میں "آزاد شہری" کی باوقار حیثیت حاصل کر لیں گے۔

کوئی کام ذہنی پس و پیش سے اور جھجک کر در پردہ نہ کیا جائے۔ یہی اسلام کی تعلیم ہے اور اسی پر مہاتما گاندھی کا آخر دم تک عمل رہا۔ مثلاً اگر ہم کو خاص اپنے ملکی و ملی مفاد میں کسی غیر ملک و قوم کی حمایت کرنی ہو تو بے جھجک کریں جس طرح کہ انگلستان کے ایک سیاسی مکتبۂ خیال کے لوگ ملایا کے "باغیوں" کی تائید کر رہے ہیں یا ماسٹر تارا سنگھ فلسطین کے یہودیوں کی طرفداری فرما رہے ہیں۔ مگر جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا۔ ملکی و ملی مفاد کے منافی خفیہ اور سازش کے طور پر ہرگز کچھ نہ کریں۔ یہ بہت نازک اور باریک نقطہ ہے جس کے لئے ایک بالغ نظر، تجربہ کار اور منظم جماعت میں شمولیت کی ضرورت ہے۔ سو اسکے واسطے ہمارے ملک میں ایک سے زائد مستند جماعتیں موجود ہیں۔ ان جماعتوں میں مسلمان اپنی اپنی ذہنی و دماغی تربیت و رجحان کے مطابق جوق جوق شریک ہو جائیں۔ اور اپنی تعلیم، سیاسی بصیرت اور قابلیت کار کو زیادہ سے زیادہ کام میں لاکر ہند یونین کی

شذرات

خدا حافظ | مجلس مصنفین علی گڑھ [illegible] علمی رسالہ "مصنف" فروری ۱۹۶۲ء میں ہم نے جاری کیا تھا۔ اور اب پورے سات [illegible] کے [illegible] میں اسے [illegible] بند کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔

اس کل مدت میں "مصنف" نے اپنے مخصوص انداز میں استقلال کے ساتھ ملک و [illegible] کی بہت سی بے ریا خدمات انجام دیں، نیز اردو زبان میں قیمتی معلومات و تاریخی نوادر کا اضافہ کیا وہ اہل علم ناظرین سے پوشیدہ نہیں ہے۔ علمی دنیا میں جس قسم کا اچھوتا اور اونچا معیار صحافت اس نے قائم کیا اس کا بھی علی گڑھ اور بیرون علی گڑھ کے اعلیٰ تعلیم یافتہ حلقوں میں عام اعتراف ہوا۔ لیکن تقریباً ایک سال سے ذاتی و سماجی زندگی میں نمایاں انقلاب برپا ہو جانے سے رسالہ قریب دو ہزار روپے کا مقروض ہو گیا ہے۔ اور جب تک یہ قرض بے باق نہ ہو مزید قرض لے کر اس کو چلانا ہمارے لئے ناممکن ہو گیا ہے۔

عجیب لطیفہ ہے! "مصنف" کا پہلا [illegible] ہم نے ادھار چھپوایا اور اس کی پہلی ہی اشاعت پر [illegible] ساڑھے چار سو روپئے مل گئے تھے اس کے بعد بھی عرصہ تک یہ صورت رہی کہ ہزار آٹھ سو روپئے رسالہ کی مد کے ہمارے پاس فاضل رہا کرتے تھے۔ لیکن جب حیدرآباد کی چار سو روپئے سالانہ کی امداد بند ہو گئی۔ رام پور کی گرانٹ تین سو کے بجائے ڈیڑھ سو کر دی گئی اور وہ بھی سال آئندہ سے نہیں ملے گی۔ نیز رسالہ کے مخصوص سرپرستوں اور قدردانوں کا حلقہ یکسر منتشر ہو گیا۔ تو ہماری زیر باری برداشت سے باہر ہو گئی۔ وہ تو گذشتہ سال ہی یہ پرچہ بند ہو جاتا اگر مخدومی آنریبل ڈاکٹر سید محمود صاحب وزیر گورنمنٹ بہار از راہ معارف پروری ہماری چار سو روپئے کے گرانقدر عطیہ سے بروقت امداد نہ فرماتے۔ لیکن یہ عارضی سہارے تا بکے۔ ہندیونین میں اردو کا دور ہی ختم ہو گیا۔ اس خیال کی تائید اس طرح ہوئی کہ دو ماہ ہونے کو آئے ہیں۔ ہم نے رسالہ کے عام خریداروں اور معزز ناظرین کی خدمت میں ایک اپیل (بصورت خط) پانچسو کی تعداد میں چھاپ [illegible] بھیجی تھی جس کے آخر میں دلی سوز و گداز سے یہ شعر بھی لکھا

بلبم رسید جانم تو بیا کہ زندہ مانم ۔۔۔ پس از اں کہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد

افسوس کہ یہیں مذکورہ بالا صحیح ثابت ہوئی۔ صرف حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی ناظم جمعیۃ العلمائے ہند دہلی۔ حضرت مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی اور جناب میر ... الی سید جواد علی شاہ صاحب رئیس گورکھپور سے۔ اٹھائیس روپے کے مجموعی عطیات وصول ہوئے اللہ بس باقی ہوس!

اگرچہ مندرجہ بالا بزرگوں کی قدردانی لاکھوں قدردانوں کی عنایت پر بھاری ہے اور اس سے ہمیں حد درجہ تسکین روحانی نصیب ہوئی لیکن موجودہ ہولناک گرانی اور شدید مشکلات کے زمانہ میں روپیہ کی ضرورت بہرصورت اپنی جگہ پر باقی رہی اور جس طرح حضرت مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی اپنا چودہ سال کا موقت الشیوع و موقر اخبار "صدق" بند کرنے پر مجبور ہوئے ہمارے لئے بھی یہی پالیسی اختیار کرنا ناگزیر ہوگیا۔

پھر ملیں گے اگر خدا لایا ویسے اللہ کی دین سے مجبور انسان کو کبھی مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ ہوسکتا ہے کہ حکومت وقت کی اردو کے بارے میں پالیسی راہ راست پر آجائے اور "مصنف" کو قرض سے سبکدوشی دلانے کے لئے بھی کوئی "مرد ... از غیب" ...... پیدا ہوجائے تو ہم خدمت کے لئے حاضر ہیں۔ ہم نے "مصنف" کو دانستہ نہ تو تجارتی اصول پر چلایا اور نہ اس سے کبھی کوئی ذاتی منفعت حاصل کی اس لئے جو جذبہ خدمت علم و ادب پہلے تھا وہ بحمد اللہ بدستور موجود ہے۔ کام کرنے کی سہولت بہم ہوتے ہی ہم حاضر ہوجائیں گے۔ ورنہ ما بخیر شما بسلامت۔

جہاں لادی وہاں سوا لادی "مصنف" پر جو قریب دو ہزار روپیہ قرض ہے اسی قدر بلکہ اس سے زائد خریداروں پر اس کا روپیہ واجب ہے لیکن اس کے باوجود ہم اپنا اخلاقی فرض سمجھتے ہیں کہ جن خریداروں کا زائد چندہ ہمارے ذمہ برآمد ہو وہ ہم واپس کردیں۔ لہذا

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

آخر میں ناشکرگذاری ہوگی اگر ہم اس موقع پر اپنے ان تمام زندہ اور مرحوم احباب اور بزرگوں کی خوشگوار۔ یاد۔ میں چند لفظ صرف کرنے کی سعادت حاصل نہ کریں جن کی دامے۔ درمے۔ قدمے۔ سخنے۔ بے لوث امداد و معاونت ہمیشہ ہماری شریک حال رہی۔ اچھا! اب رخصت ۔ ۵

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

بیت المصنف علی گڑھ
۱۰ ستمبر ۴۸ء

سید الطاف علی بریلوی

راہِ عمل — خدمتِ خلق

(مولانا ظہور احمد وحشی مرحوم)

بڑھا کے دل میں تپش سوز و ساز پیدا کر
لگا کے آگ جگر میں گداز پیدا کر
ملا کے خاک میں ہستی نیاز پیدا کر
طریقِ عشق میں کچھ امتیاز پیدا کر
فروغِ داغ سے سینہ کو نوبہار بنا
دُرِ سرشک سے دامن کو زرنگار بنا

وفا و مہر کے آثار ڈھونڈھ ہر شے میں
سُنا زمانے کو الفت کا راگ ہر لے میں
ڈبو دے روح کا پیمانہ عشق کی مے میں
جگہ لہو کی محبت کو دے رگ و پے میں
زفرق تا بقدم پیکرِ وفا بن جا
نگاہِ حسن نہ قدرت کا مدعا بن جا

زباں کو لہجۂ شیریں سے جانفزا کر دے
لبوں کو ذوقِ تبسم سے آشنا کر دے
نظر کو ٹوٹے ہوئے دل کا آسرا کر دے
یہ دست و پا کسی بیکس کے دست و پا کر دے
بتا دے سینہ کو مظلوم کی سپر بننا
سکھا دے دل کو لہو بن کے اشکِ تر بننا

اگر ہو دل تو وفاداریاں سکھا اس کو
اگر ہو آنکھ تو خونباریاں سکھا اس کو
جو ہو ضمیر تو بیداریاں سکھا اس کو
جو ہو زباں تو فسونکاریاں سکھا اس کو
وہ انبساط مخاطب کو دے تکلم سے
کہ غم سرور سے بدلے بکا تبسم سے

دلِ شکستۂ بے کس کا آسرا بن جا
غریقِ بحرِ مصائب کا ناخدا بن جا
ستم کشیدۂ غربت کا رہنما بن جا
چراغ بن کے جو چمکے وہ نقشِ پا بن جا
مذاقِ درد سے دل کی دوا بنا دل کو
بنا کے بندوں کا بندہ خدا بنا دل کو

زمانہ گرمِ طلب ہے کہ جاں نثار ملیں
ضرورتوں کی صدا ہے کہ غمگسار ملیں
یہ جستجو ہے وطن کو کہ دلفگار ملیں
پکارتی ہے یہ دُنیا کہ مرد کار ملیں
بغور سُن کہ پیامِ عمل کا ہے چرچا
زمانہ مانگ رہا ہے خراج بازو کا

اٹھا کے آنکھ سمندر کی دیکھ طغیانی
ہر ایک موج دکھاتی ہے شان طوفانی

نظر نہ روز ہے حدِ نگاہ تک پانی — دکھائی دیتا ہے دور ایک شکلِ انسانی

پھنسا ہوا کوئی موجوں کے پیچ و تاب میں ہے — خدا پناہ میں رکھے بڑے عذاب میں ہے

[illegible] واسطے آمادۂ اعانت ہو — اسے بچا لے اگر دل میں کچھ حمیت ہو

[illegible] تلاطمِ امواج میں جو ہمت ہو — نہ کر دریغ اگر جان کی ضرورت ہو

یہ موت زندگیِ جاودانِ انساں ہے — یہ آب بحرِ حقیقت میں آبِ حیواں ہے

اندھیری رات ہے ہر شخص گھر میں سوتا ہے — کہیں [illegible] دکان سے شعلہ بلند ہوتا ہے

مکین جاں بلب ہے آہ غم سے روتا ہے — کہ خانماں کوئی دم میں جان کھوتا ہے

جو تجھ میں ہمتِ مردانہ ہے تو بس آ جا — کسی طرح کا نہ کر دل میں پیچ و تاب آ جا

ستم زدوں کو بچا بیکسوں کی یاری کر — [illegible] کے لئے [illegible] ستمگاری کر

خدا کے واسطے دل سے غریبوں کی غمگساری کر — ہزار [illegible] سے اظہار [illegible] ستاری کر

تمیزِ مذہب و ملت نہ کر خدا کے لئے — [illegible] نوع پہ پھر خدا کے لئے

نظر اٹھا کہ وبا کا شکار ہیں کچھ لوگ — [illegible] سوگوار ہیں کچھ لوگ

ستا رہا ہے مرض بیقرار ہیں کچھ لوگ — یہ مستزاد کہ بے روزگار ہیں کچھ لوگ

نہ غمگسار نہ تیماردار ہے کوئی — نہ ان سے پرسشِ احوالِ زار ہے کوئی

جو دست و پا ہوں تو ان بیکسوں کی خدمت کر — جو مال و زر ہو تو امکان بھر اعانت کر

خلوصِ دل ہو تو شام و سحر عبادت کر — دوا انہیں کے پلا پاؤں داب منت کر

ہر اک ادا سے یہ سمجھا کہ غمگسار ہے تو — کوئی عزیز ہے تو کوئی رشتہ دار ہے تو

یتیم و بیوہ و بیمار و مفلس و ناچار — ستا رہا ہے جنھیں آسمانِ کج رفتار

جنھیں نصیب نے دی ہے خزاں بجائے بہار — کھٹک رہے ہیں جو اس گلکدہ میں صورتِ خار

زباں سے کہتے ہوئے حالِ دل جھجکتے ہیں — مگر وہ تیری عنایت کی راہ تکتے ہیں

مقیم ہوں کہ مسافر بعید ہوں کہ قریب — فقیر ہوں کہ غنی ہوں امیر ہوں کہ غریب

سعید ہوں کہ شقی ہوں رذیل ہوں کہ نجیب — سمجھ رہے ہیں تجھے اپنے درد دکھ کا طبیب

ہر ایک تجھ سے طلبگارِ حق ہے سن تو سہی — یہ کائنات کو ازبر سبق ہے سن تو سہی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

علمائے سلف اور حق پسندی

(علامہ الحاج ڈاکٹر نواب صدر یار جنگ بہادر مدظلہٗ)

لفظ حکام میں جس قدر جبروت اور قہاری اگلی تاریخ میں نظر آتی ہے اُس کی نظیر آجکل کے آئینی عہد میں ملنی ناممکن ہے۔ جس سلطنت کے زیر سایہ ہم رہتے ہیں وہ تو ایسی امن دوست اور رفاہ پسند ہے کہ ان مہیب صفات کا کوئی شمہ ان ممالک میں نہیں پایا جاتا وَالحمدُ للہ علیٰ ذٰلک مگر سارے عالم کے مخبر اخبار بھی ہم کو زمانۂ حال میں کوئی ایسا فرمانروا نہیں تبلاتے جس کے دربار میں حجاج ابن یوسف یا تیمور کی ہیبت کا نشان مل سکے۔ پس جب ہم اس دَورِ عافیت میں حق پسندی کا قحط پاتے ہیں تو اگلے زمانے میں اس صفت کا وجود عنقا ہونا چاہئے تھا۔ لیکن واقعات اس کے خلاف ثابت کرنے کو آمادہ ہیں۔ اُن واقعات کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ جن بزرگوں نے اگلے جلاد بادشاہوں کے عہد میں حق کو نباہا اُنھوں نے بڑا کام کیا۔

ایک مرتبہ حضرت ابن عمر (رضی اللہ عنہما) نے حجاج کو خطبہ پڑھتے دیکھا تو غضب آلود ہوکر برملا فرمانے لگے۔ خدا کا دشمن! خدا کی حرام کی ہوئی باتوں کو اس نے حلال کر لیا خدا کے گھر کو خراب کیا اور خدا کے دوستوں کو قتل۔ حجاج نے اپنی نسبت یہ سخت کلمات سنکر پوچھا کہ یہ کون ہے؟ کسی نے کہا عبداللہ ابن عمر۔! اتنا سنکر وہ سفاک آپ کی طرف مخاطب ہوا اور کہنے لگا کہ بڑے میاں اب تم سٹھیا گئے ہو اور تمہارے حواس بجا نہیں رہے ہیں منبر سے اُترا

تو دل میں بُخار بھرا ہُوا تھا اپنے ایک ملازم کو ایماء کیا اور اُس نے ایک زہر میں بجھا ہوا حربہ حضرت ابن عمرؓ کے پاؤں پر مار دیا اسی ہتھیار کی سمیّت آپ کی وفات کا باعث ہوئی۔ مزید عنایت دیکھئے کہ جو مرض خود پیدا کیا تھا اُس کی عیادت کو آیا۔ مگر حضرت عبداللہؓ نے نہ اُسکے سلام کا جواب دیا نہ کلام کیا[1]۔ جو واقعہ ہم آگے بیان کرتے ہیں وہ استقلال و ثابت قدمی کی ایک بے نظیر مثال پیش کرتا ہے! اور اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حق پرستی اُن بزرگوں کے دل ایسے مضبوط کر دیتی تھی کہ موت اُن کے سامنے کھڑی ہوتی اور وہ بے پروائی سے ہنستے! اور جلاد کے ہاتھ میں شمشیر برہنہ اُن کے واسطے کوئی خوفناک چیز ثابت نہ ہوتی ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ۔

جلیل القدر تابعی حضرت سعید ابن جُبیرؓ سے دولتِ بنی اُمیّہ مخالف ہو گئی تھی اور یہ چھپے پھرتے تھے۔ مگر ایسی زبردست سلطنت کے پنجے سے بچنا ناممکن تھا۔ والیِ مکہ نے ایک موقع پر ان کو پکڑ کر حَجاج کے پاس بھیج دیا۔ اُس کی جفا جو طبیعت کو گویا ایک ضیافت ہاتھ آئی۔ اوّل تو نام پوچھا۔ اُنھوں نے فرمایا کہ سعید ابن جُبیر۔ حَجاج اس قدر طیش میں تھا کہ اُس کو اُن کے نام کے اچھے الفاظ بھی تلخ معلوم ہوئے! اور جوشِ غضب میں کہا کہ انت شقی بن کسیر۔

سعید۔ میری والدہ میرا نام تجھ سے بہتر جانتی تھیں۔

حجاج۔ (اور بگڑا اور کہا) شقیت امك و شقیت انت یعنی تمہاری والدہ بھی بدبخت! اور تم بھی بدبخت۔

سعید۔ غیب کا جاننے والا تیرے سوا اور ہے۔

حجاج۔ (جلکر) دیکھو تو میں کو دُنیا کے بدلے میں کیسی لپٹیں مارتی ہوئی آگ دیتا ہوں۔

سعید۔ اگر میں یہ جانتا کہ یہ تیرے اختیار میں ہے تو میں تجکو اپنا معبود بنا لیتا۔

اب حَجاج نے (جو اُن کے قتل کے لئے بہانہ ڈھونڈھتا تھا) اُن سے مذہبی سوال شروع کئے جو پولیٹکل پہلو لئے ہوئے تھے! اور پوچھا کہ آنحضرتؐ کی نسبت تمہارا کیا قول ہے۔؟

سعید۔ آپ نبیِ رحمت اور امامِ ہُدیٰ تھے۔

حجاج۔ خلفاء کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔؟

سعید۔ لست علیھم بوکیل (میں اُن کا قاضی نہیں)۔

حجاج۔ اُن میں کون سب سے بہتر تھا؟

---

[1] ید۔ ج ۱۔ صفحہ ۳۲

سعید۔ ارضاھم لخالقی جو میرے مالک کی مرضی کا سب سے زیادہ پابند تھا۔
حجاج۔ کون سب سے زیادہ رضا جو تھا۔؟
سعید۔ علم ذٰلك عند الذی یعلم سِرّھم ونجواھم (اس کو وہ خوب جانتا ہے جو اُنکے بھیدوں سے اور پوشیدہ باتوں سے واقف ہے)۔

غرض عرصے تک اس قسم کے سوال وجواب رہے۔ مگر حضرت ابن جبیرؓ نے کوئی موقع گرفت کا نہیں پیدا ہونے دیا۔ اور اپنے صاف صاف مگر نپے تُلے جوابوں سے حجاج کی برہمی برابر بڑھاتے گئے آخر اُس نے کھسیا کر کہا۔

حجاج۔ اختر یا سعیدُ ای قتلة اقتلك (اے سعید بتاؤ میں کس شکل سے تم کو قتل کروں)؟
سعید۔ اختر یا حجاجُ لنفسك فو اللہ لا تقتلنی قتلة الا قتلك اللہ مثلھا (اے حجاج تو خود ہی پسند کر قسم رب کی جس طرح تو مجھ کو قتل کریگا اُسی طرح خدا تجھ کو قتل کریگا)۔
حجاج۔ کیا میں معاف کردوں۔
سعید۔ اگر عفو ہو تو خدا کی طرف سے ہو۔ رہا تو پس تو نہ کسی کو بری کرسکتا ہے نہ کسی کا عذر قبول۔

اسی بحث کے بعد حجاج نے آخری حکم دیدیا اور جلاد حضرت جبیرؓ کو باہر لائے۔ حجاج تو اپنی انتہائی طاقت صرف کرچکا تھا۔ لیکن خدا کے سعید بندے کو ابھی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ باہر آکر ہنسے۔ حجاج کو خبر ہوئی تو اُس نے پھر بلایا اور ہنسی کی وجہ دریافت کی۔ ابن جبیرؓ نے فرمایا۔ عجبت من جرأتك علی اللہ وحلم اللہ علیك (مجھ کو خدا کے مقابلے میں تیری جرأت پر اور تیری نسبت خدا کے حلم پر تعجب ہوا) حجاج اس گرم فقرے کو سُنکر اور بھڑکا اور جلادوں سے کہا میرے سامنے گردن مارو۔ اب ابن جبیرؓ شہادت کے لئے مستعد ہوگئے اور قبلہ رُو ہوکر فرمایا۔
وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِی فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالارضَ حَنِیفًا وَّمَا اَنَا مِنَ المُشْرِکِین۔[1]

حجاج۔ ان کا مونھ قبلے سے پھیر دو۔
سعید۔ اَیْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وجہ اللہ (جدھر تم پھر دگے اُسی طرف خدا کا مونھ ہے)۔
حجاج۔ اوندھا ڈال دو۔
سعید۔ مِنْھَا خَلَقْنٰکُمْ وَفِیْھَا نُعِیْدُکُمْ وَمِنْھَا نُخْرِجُکُمْ تَارَةً اُخْرٰی (ہم نے اُسی سے (یعنی زمین سے) تم کو پیدا کیا اور اُسی میں تم کو لوٹائیں گے اور اُسی سے ایک دفعہ تم کو پھر نکالیں گے)۔

---

[1] میں نے اپنا مونھ کیا اُسی کی طرف جس نے بنائے آسمان و زمین ایک طرف کا ہوکر اور میں نہیں شریک کرنیوالا۔

حجاج نے اُن کی بیباکی سے تنگ آکر جلّادوں کو اشارہ کیا کہ جلد اپنا کام کرو۔

سعید۔ تُم نے میں اس کی شہادت دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہے اور کوئی اُس کا شریک نہیں۔ اور اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ محمدؐ اُس کے بندے اور رسول ہیں۔ میری جان تو لے جب تو میدانِ حشر میں مجھ کو ملے گا تو میں تجھ سے لے لوں گا۔

حضرت ابن جبیرؓ کی زبان پر یہ الفاظ تھے کہ جلّاد کا ہاتھ اُٹھا اور اُن کا سر تن سے جُدا ہو گیا۔ اِنا للّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون ۃ ۵ھ

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلتیدن خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

بعد قتل اُن کے جسم سے خلاف معمول خون بہت نکلا۔ جس سے حجاج ے سفاک کو بھی حیرت ہوئی۔ اور اُس نے اپنے طبیب خاص تیاذوق سے اس کی وجہ دریافت کی۔ تیاذوق نے کہا کہ چونکہ اُن کی خاطر بالکل مطمئن تھی اور قتل کا خوف قطعاً اُن کے دل میں نہ تھا اس لئے خون اپنی اصلی مقدار پر قائم رہا۔ بخلاف اور مقتولوں کے کہ اُن کا خون ہیبت کے مارے پہلے ہی خشک ہو جاتا ہے۔ علاوہ اس طبی شہادت کے حضرت ابن جبیرؓ کے کلام کی برجستگی صاف کہہ رہی ہے کہ اُن کی طبیعت بالکل آسودہ اور آرمیدہ تھی اور اضطراب کا نام بھی اُن کے قلب میں نہ تھا۔ یہ شعبان ۹۵ھ کا واقعہ ہے۔ رمضان نے مذکور میں حجاج بھی راہیٔ عدم ہو گیا ۵ھ

دیدی کہ خونِ ناحق پروانہ شمع را چنداں اماں نداد کہ شب را سحر کند[۱]

انہیں کے ہم نام اور ہمعصر دوسرے تابعی حضرت سعید ابن المسیب کا ذکر ابن السائب کرتے ہیں کہ ایک روز وہ اور میں دونوں بازار میں بیٹھے تھے کہ خلیفۂ دمشق کا برید (نامہ بر) وہاں سے گزرا ابن المسیب نے اُس سے پوچھا کہ تم بنی مروان کے برید ہو۔؟

برید۔ جی ہاں۔

ابن المسیب۔ تم نے اُن کو کس حال میں چھوڑا۔؟

برید۔ بخیر۔

ابن المسیب۔ نہیں بلکہ تم نے اُن کو اس حال میں چھوڑا ہے کہ وہ آدمیوں کو بھوکا مارتے ہیں اور کتوں کا پیٹ بھرتے ہیں۔

برید یہ سُنکر بگڑ گیا اور آنکھیں نکال کر اُن کی طرف دیکھنے لگا۔ ابن السائب کہتے ہیں کہ میں

---

[۱] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۰۵ و عیون۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۲۳

دہشت زدہ ہوکر کھڑا ہوگیا کہ دیکھئے اب کیا ہو۔ یزید دیر تک تیور بدلے کھڑا رہا۔ مگر پھر کچھ سوچ کر چلدیا۔ جب وہ جا چکا تو میں نے کہا "ابن المسیب خدا تم کو نیکی دے تم کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑے ہو"۔ انھوں نے فرمایا "بیہودہ چپ رہ۔ جب تک میں حق پر قائم ہوں واللہ خدا مجھ کو دشمنوں کے قبضے میں نہ دے گا۔"

ایک دفعہ تینتیس ہزار درہم دولتِ مذکور کی طرف سے اُن کی خدمت میں پیش کئے گئے تو اُنھوں نے فرمایا کہ نہ مجھ کو بنی اُمیّہ کی پرواہ ہے نہ اُن کے مال دولت کی۔ میں خدا کے سامنے جاؤں گا اور وہ میرا اور اُن کا انصاف کرے گا۔ اِنھیں حق گوئیوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ خلیفہ عبدالملک نے جاڑے کے موسم میں اُن کو پٹوا کر سرد پانی ڈلوایا۔ اور ایک دوسرے موقع پر پچاس دُرّے لگوا کر سربازار تشہیر کرائی۔[۵]

عمر ابن ہبیرہ جب خلیفۂ دمشق یزید ابن عبدالملک کی جانب سے والیٔ عراق وخراسان مقرر ہوکر آیا تو اُس نے خواجہ حسن بصری۔ امام ابن سیرین اور امام شعبی کو طلب کیا اور اُن کے سامنے یہ مدبّرانہ تقریر کی "یزید ابن عبدالملک کو خداوند تعالےٰ نے اپنے بندوں پر خلیفہ مقرر کیا ہے اور اُن سے اُس کی اطاعت کا عہد لیا ہے۔ اور ہم سے (یعنی ملازموں سے) اُس کے حکم سُننے اور بجا لانے کا۔ مجھ کو جو عُہدہ خلافت کی طرف سے عطا ہوا ہے وہ آپ سب کو معلوم ہے۔ خلیفہ کی جانب سے ایک حکم مجھ کو ملتا ہے اور میں اُس کی بے تامّل تعمیل کرتا ہوں۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔"

خواجہ حسن بصریؒ نے اس پولیٹکل گفتگو کا جواب جن صاف اور سچّے الفاظ میں دیا وہ قابلِ شنید ہیں۔ اُنھوں نے فرمایا کہ "اے ابن ہبیرہ! یزید کے معاملے میں خدا تعالےٰ سے ڈر اور خدا تعالیٰ کے معاملے میں یزید کا خوف مت کر۔ خدا تعالےٰ تجھ سے یزید کے شر کو دفع کر سکتا ہے۔ مگر یزید اُس احکم الحاکمین کے قہر کو نہیں روک سکتا۔ وہ وقت بہت دُور نہیں ہے کہ خداوند عالم تیرے پاس اپنا ایک فرشتہ بھیجے گا جو تجھ کو شاندار تخت اور وسیع محل سے علیحدہ کر کے تنگ قبر میں پہنچا دے گا۔ وہاں سوائے تیرے اعمال کے کوئی تجھ کو نجات نہیں دلوا سکے گا۔ اے ابن ہبیرہ! اگر تو خدا کا گناہ کرے تو خوب سمجھ لے کہ خلیفہ کو اُس نے اپنے دین کا اور اپنے بندوں کا محافظ اور ناصر مقرر کیا ہے۔ پس خدا کے دین کے خلاف اس کے مقرر کئے ہوئے حاکم کی وجہ سے جسارت مت کر۔ کیونکہ خالق اکبر

---

[۵] ابن۔ ج ا۔ صفحہ ۲۰۷

کے مقابلے میں مخلوق کا حکم ماننا کسی طرح روا نہیں۔[1]

اسی یزید ابن ہبیرہ نے امام اعظم کو ایک دفعہ طلب کر کے عہدۂ قضا قبول کرنے کے واسطے کہا۔ امام صاحب چونکہ یہ بار اپنے ذمے لینا نہیں چاہتے تھے لہٰذا انکار کر دیا۔ ابن ہبیرہ اس انکار سے بگڑ گیا۔ اور گیارہ روز تک دس دس دُرّے روزانہ ان کے لگوائے۔ تاہم اُس کا اصرار ان کے انکار پر غالب نہ آسکا۔ اسی عہدۂ قضا کی بدولت امام ابو حنیفہ کے مقدر میں اور سختی لکھی تھی۔ جب منصور بغداد کا خلیفہ ہوا تو اُس کی نظر بھی اس منصب کے لئے امام ممدوح پر ٹھہری۔ چنانچہ اُن کو کوفے سے طلب کیا اور عہدۂ مذکور کے قبول کرنے کی فرمایش کی۔ امام صاحب اب بھی اپنی رائے پر سختی سے قائم تھے لہٰذا عذر کیا۔ منصور نے قسم کھا کر کہا کہ میں تم کو قاضی مقرر کروں گا۔ اُنھوں نے جواباً قسم فرمایا کہ میں اس عہدے کو منظور نہیں کروں گا۔ خلیفہ نے دوبارہ قسم کھائی۔ اُنھوں نے مکرر قسمیہ انکار کیا اور اپنے انکار کی وجہ یہ بیان کی کہ میں اپنے آپ کو اس منصب کے قابل نہیں سمجھتا۔ حاجب ابن ربیعہ نے (جو دربار میں حاضر تھا) خلیفہ کی خوشامد کی راہ سے کہا کہ امیر المومنین قسم کھا چکے ہیں پھر بھی تم انکار کئے جاتے ہو۔ امام فقہ نے فرمایا کہ امیر المومنین کے لئے کفارۂ قسم ادا کر دینا بہ نسبت میرے زیادہ آسان ہے۔ خلیفہ جب اُن کی رائے کو کسی طرح مقید نہ کر سکا تو خود اُن کو قید خانے بھیج دیا اور بحالتِ محبوسی ۱۵۰ھ میں امام اعظم نے وفات پائی۔

اِن دونوں واقعوں کے ساتھ ایک تیسرا واقعہ اور ملائیے۔ جس سے امتیاز مراتب کا نکتہ حل ہوگا۔ ایک زمانے میں حاکم کوفہ نے یہ حکم دیدیا تھا کہ ابو حنیفہؒ فتویٰ نہ دیا کریں۔ چنانچہ امام صاحب نے فتویٰ دینا چھوڑ دیا تھا۔ انھیں روزوں کا ذکر ہے کہ ایک دن امام ممدوح گھر میں تشریف رکھتے تھے بی بی اور بچے پاس تھے۔ صاحبزادی نے روزے کے متعلق ایک مسئلہ پوچھا۔ آپ نے فرمایا بیٹا! یہ مسئلہ اپنے بھائی حمّاد سے پوچھ لو مجھ کو حاکم کی طرف سے فتویٰ دینے کی ممانعت ہے۔ اس لئے میں تمھارے سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔[2]

کیا اس سے بڑھ کر حق پرستی ہوسکتی ہے۔ عہدۂ قضا قبول نہ کرنا اپنے نفس کا حق تھا جس کو اُنھوں نے حاکم اور خلیفہ کے مقابلے میں برسر دربار نہیں چھوڑا۔ اور فتویٰ نہ دینا حاکم کا حق تھا جس کو اُنھوں نے خلوت اور گھر کی چار دیواری کے اندر بھی ملحوظ رکھا۔

امام یزید ابن حبیب تابعی ایک دفعہ علیل تھے۔ ابن سُہیل والی مصر اُن کی عیادت کو آیا۔ اثنائے

۱؎ ابن - ج ۱۰ - صفحہ ۱۲۸ -
۲؎ ابن - ج ۱۰ - صفحہ ۴۰۲ و ج ۲ - صفحہ ۱۹۳ و ۱۹۴ و ۱۶۶ -

کلام میں اُس نے پوچھا کہ جس کپڑے پر مچھر کا خون لگا ہو اُس سے نماز جائز ہے یا نہیں[1] امام نے یہ سنکر غصّے سے مونھ پھیر لیا اور کچھ نہیں کہا۔ جب امیر نے چلنے کا قصد کیا تو اُس کو نظر بھر کر دیکھا اور کہا کہ تو روزانہ خدا کے بندوں کا تو خون بہاتا ہے اور مچھر کے خون کا فتویٰ پوچھنے چلا ہے[1]

خلیفۂ دمشق ہشام ابن عبدالملک نے اپنا ایک معتمد امام اعمش کوفی کے پاس اس غرض سے بھیجا کہ اُن سے حضرت عثمان کی خوبیاں اور حضرت علیؓ کی بُرائیاں لکھوا لائے۔ جب ایلچی نے خلیفہ کا رقعہ دیا تو اُنھوں نے اُس کو پڑھکر ایک بکری کے مونھ میں دیدیا۔ بکری اُس کو چبا چکی تو معتمد خلافت سے فرمایا کہ اپنے آقا سے کہدینا کہ اُس کے پروانے کا یہی جواب ہے۔ قاصد کو حکم تھا کہ جواب تحریری لائے لہٰذا اُس نے منت کی کہ جو کچھ جواب ہو لکھدیجئے۔ اصرار سے تنگ آکر اُنھوں نے یہ جواب لکھدیا۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ امابعد یا امیرالمؤمنین نو کان لعثمان رضی اللہ عنہ مناقب اهل الارض ما نفعتك ولو كانت لعلی رضی اللہ عنہ مساوی اهل الارض ما ضرتك فعليك بخويصة نفسك والسلام۔ (یعنی امیرالمومنین اگر حضرت عثمان میں سارے جہان کی خوبیاں تھیں تو تجھ کو کچھ نفع نہیں اور اگر حضرت علی میں دُنیا بھر کی بُرائیاں تھیں تو تیرا کچھ نقصان نہیں۔ پس تو خاص کر اپنے نفس کی خبر لے۔ والسلام۔

ابوجعفر منصور خلیفہ بغداد نے ایک بار امام مالک اور امام عبداللہ ابن طاؤس کو اپنے پاس بُلایا اور اثنائے ملاقات میں ابن طاؤس سے کہا کہ اپنے والد سے کوئی حدیث روایت کرو۔ اس فرمائش سے ابن طاؤس کے ہاتھ اس امر کا گویا موقع لگا کہ وہ خلیفہ کو اس کی بے اعتدالیوں اور سختی پر تنبیہ کرے۔ اور اُنھوں نے یہ حدیث انتخاب کر کے سُنائی حدثنا ان اشد الناس عذابًا یوم القیامة رجلٌ اشرکه الله تعالیٰ فی سلطانه فادخل علیه الجور۔ (یعنی میرے والد نے مجھ سے یہ حدیث بیان کی ہے کہ قیامت کے دن سب سے بڑھ کر عذاب اس کو ہوگا جس کو خدا تعالیٰ اپنی حکومت میں شرکت دے اور پھر وہ ظالمانہ حکومت کرے)۔

منصور سے قہار فرماں روا کے سامنے اور یہ جرأت۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ مجھ کو ابن طاؤس کے قتل کا پورا یقین ہوگیا اور میں نے اپنے دامن سمیٹ لئے کہ مبادا اُن کے خون کی چھینٹیں میرے کپڑوں پر پڑیں۔ خلیفہ دیر تک ساکت رہا پھر نگاہ اُٹھائی اور ایک اور سوال کیا۔ ابن طاؤس کے قلب پر اب بھی خلیفہ کا رعب غالب نہیں آیا تھا۔ اس سوال کا جواب بھی پوری آزادی سے دیا۔

---

[1] تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۱۶ [2] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۱۳

خلیفہ نے تنگ آکر کہا قوماعنی (یعنی میرے پاس سے دونوں اٹھ جاؤ)۔ ابن طاؤس نے فرمایا۔ ذالک ماکنا نبغی یہ تو ہماری عین مراد ہے۔ اور یہ کہکر اٹھ کھڑے ہوئے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اُس روز سے میں ابن طاؤس کے فضل کو مان گیا ہوں[1]۔

فقہ کے چار امام جن کی امامت آج تک چار دانگ عالم میں مسلم ہے اور کروروں نفوس انسانی پر اُن کی روحانی سلطنت صدہا برس سے قائم ہے اُن میں سے امام ابو حنیفہؒ کا حال آپ سُن چکے۔ امام مالکؒ کے ایک دفعہ ستر درے اس وجہ سے مارے گئے کہ کسی مسئلے میں حق کا اور حکومت کا مقابلہ تھا اور اُنھوں نے فتویٰ دینے میں حق کی رعایت کی تھی[2]۔

یہی سلوک امام احمد ابن حنبل کے ساتھ خلیفہ مامون الرشید کی خلافت میں عقائد کے ایک مسئلے کے اختلاف کی وجہ سے کیا گیا[3]۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ خلیفہ منصور کے چہرے پر مکھی بیٹھی اُس نے اڑا دی۔ مکھی حسب عادت پھر آن بیٹھی خلیفہ نے پھر اُڑا دی۔ غرض کئی دفعہ یہی اتفاق ہوا۔ آخر خلیفہ نے جھلا کر ابن سلیمان مشہور مفسر سے پوچھا کہ مکھی پیدا کرنے کی خدا کو کیا ضرورت پڑی تھی۔ اُس عالم ربانی نے فرمایا کہ متکبروں کا غرور توڑنے کے لئے پیدا کی گئی[4]۔

خلافت عباسیہ نئی نئی قائم ہوئی تھی اور خاندان بنی اُمیہ کے نیست و نابود کرنے اور ملک سے اُن کا اثر مٹانے کی کوششیں بڑی بیدردی اور سفاکی سے عمل میں آرہی تھیں کہ اسی اثنا میں عبداللہ ابن علی خلیفۂ سفاح کا چچا شام کا حاکم مقرر ہوا۔ امیر مذکور نے وہاں پہنچ کر اوّل تو خلافت کے بقیہ دعویداروں کی پوری صفائی کی اُس کے بعد ایک عظیم الشان دربار منعقد کیا۔ جس میں جاہ و جلال کا اظہار انتہا کو پہنچایا گیا تھا۔ چار جنگی صفیں ایوانِ دربار میں قائم تھیں جو مختلف مہیب ہتھیاروں سے مسلح تھیں۔ ان صفوں کے بیچ میں تختِ امارت نصب تھا۔ جب میر نے دربار میں آکر جلوس کیا تو شام کے مقتدا امام اوزاعی طلب ہوئے۔ امام ممدوح جس وقت دارالامارۃ کے دروازے پر پہنچے تو گھوڑے پر سے اُتار لئے گئے اور دو آدمیوں نے اُن کے بازو پکڑ کر تخت سے اتنا قریب لا کھڑا کیا کہ امیر خود اُن سے کلام کر سکے۔

امیر۔ (نے ان کو دیکھکر کہا کہ) تمہارا نام عبدالرحمن ہے؟

امام۔ (اوزاعی) جی ہاں۔ خدا امیر کو صلاحیت دے۔

امیر۔ بنی اُمیہ کی خونریزی کی نسبت تمہاری کیا رائے ہے؟

---

[1] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۳۲ [2] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۳۹۴ [3] ابن۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۶۴ [4] ابن۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۱۲

امام تمہارے اور اُن کے مابین چونکہ عہد تھا اس لئے تم کو لازم تھا کہ عہد و پیمان کی رعایت کرتے اور عہد شکنی نہ کرتے۔

امیر۔ (بگڑ کر) یہ ہم جانیں اور وہ جانیں۔ ہم میں باہم کوئی عہد نہ تھا۔

امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ امیر کے تیور پھرے دیکھ کر میرے قلب پر بیکسی کی سی حالت طاری ہوئی اور جان کا خوف معلوم ہونے لگا۔ اُسی وقت مجھ کو خیال آیا کہ عبدالرحمٰن! ایک دن اس سے بھی بڑے حاکم کے حضور میں حاضر ہونا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میرے دل کا اضطراب جاتا رہا اور قوت سی پیدا ہو گئی اور میں نے صاف صاف امیر سے کہا کہ بیشک اُن کا خون تم پر حرام تھا۔ اس زوردار فقرے کو سُن کر امیر طیش کے مارے تھرّا گیا۔ جوش خون سے آنکھیں سرخ ہو گئیں اور رگیں اُبھر آئیں۔ اسی غضب کی حالت میں کہنے لگا کہ ویحلك الله یہ تم نے کس طرح کہا۔

امام۔ اس طرح کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کسی مسلمان مرد کا قتل روا نہیں۔ جب تک کہ ان تین حالتوں میں سے ایک حالت پیش نہ آئے۔ یا تو وہ اس حال میں زنا کرے کہ اُس کی شادی ہو چکی ہو۔ یا قاتل ہو۔ یا مرتد ہو جائے۔

امیر۔ کیوں! کیا ہماری حکومت دینی نہیں؟ (گویا اس کا مطلب یہ تھا کہ چونکہ ہماری خلافت ازروئے دین ثابت ہے لہٰذا اُس کا مخالف تاریک دین ہوا)

امام۔ تمہاری حکومت دینی کیونکر ہو سکتی ہے؟

امیر۔ کیا آنحضرتؐ نے حضرت علیؓ کے لئے وصیت نہیں فرمائی۔

امام۔ اگر حضرت علیؓ کے لئے وصیت ثابت ہوتی تو دونوں حکَم مُقَرر نہ کئے جاتے۔ ؎ ہ نہ دیتے۔

امیر کے پاس چونکہ اس کا جواب کچھ نہ تھا اس لئے خاموش تو ہو گیا مگر شدت اشتعال کے سبب سراپا غضب معلوم ہوتا تھا۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ امیر کی خاموشی نے مجھ کو یقین دلا دیا کہ کوئی دم میں میرا سر قدموں پر آتا ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد خلاف توقع امیر نے ہاتھ کے اشارے سے حکم دیا کہ امام دربار سے باہر کر دیئے جائیں۔ چنانچہ یہ وہاں سے تشریف لے آئے۔ دارالامارۃ سے کچھ دُور نکلے تھے کہ ایک سوار ان کی طرف تیز آتا ہوا نظر پڑا۔ سوار کو دیکھ کر جان کا خوف امام اوزاعی کو اوّل سے بھی زیادہ ہوا۔ اور وقت اخیر سمجھ کر نماز شروع کر دی۔ جب سلام پھیرا تو سوار نے سلام کیا اور اشرفیوں کی ایک تھیلی منجانب امیر پیش کی۔ انھوں نے وہ اشرفیاں قبول کر لیں۔ اور گھر پہنچنے سے پہلے مستحقوں

ؔ؎ تو ان کا حکم پر رحم کرتے۔

کو تقسیم کر دیں[۵۱]

اسلام نے بیت المال کی بنیاد جن اُصول پر ڈالی تھی وہ خلافتِ راشدہ کے بعد بالکل بدل گئے تھے۔ اور مسلمانوں کا قومی مال محض خلفا و سلاطین کا جیب خرچ خیال کیا جاتا تھا۔ جو علمائے اسلام بیت المال کے اصلی اغراض سے واقف تھے اُن کے دل اس اسراف کو دیکھ دیکھ کر کڑھتے تھے اور جب اُن کو موقع ہاتھ آتا اُن کی زبان خلفاء کو بر ملا متنبہ کرنے سے باز نہیں رہتی تھی۔

حضرت سُفیان ثوری ایک دفعہ خلیفہ مہدی کے پاس گئے اور اُس سے کہا کہ مجھ کو یہ روایت پہنچی ہے کہ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ نے اپنے ایک سفرِ حج میں صرف بارہ اشرفیاں صرف کی تھیں۔ تمہارا اسراف جس حد کو پہنچا ہے وہ ظاہر ہے۔ خلیفہ نے خشمناک ہو کر کہا تم اپنی ہی ذلیل حالت میری بھی کیا چاہتے ہو۔ حضرت سُفیان نے جواب دیا کہ مجھ سے مت بنو مگر جس حال میں ہو اُس میں تو کمی کر دو۔[۵۲]

ایک دفعہ ہارون الرشید اور شاہزادے امام مالک کے یہاں گئے۔ خلیفہ نے امام صاحب سے حدیث سُنانے کی فرمائش کی امام ممدوح نے فرمایا کہ میں نے عرصے سے طریقۂ قراءت چھوڑ دیا ہے۔ اب اور لوگ مجھ کو حدیث سناتے ہیں۔ اور میں سنتا ہوں۔ ہارون الرشید نے کہا کہ بہتر ہے میں ہی سُناؤں گا۔ مگر اول عام آدمیوں کو اپنی مجلس سے باہر کر دیجئے۔ امام مالک نے جواب میں ارشاد کیا کہ اگر خواص کی خاطر سے عوام محروم کئے جائیں گے تو خواص کو بھی نفع نہیں پہنچ سکتا۔ یہ فرما کر اپنے ایک شاگرد ابن عیسیٰ کو حکم دیا کہ سبق شروع کریں۔ چنانچہ ابن عیسیٰ نے فوراً سبق شروع کر دیا اور خلیفہ کو خاموش رہنا پڑا۔[۵۳]

خلیفۂ مذکور نے ایک بار ابن ادریس کو بُلا کر عہدۂ قضا قبول کرنے کے واسطے کہا۔ اُنھوں نے انکار کیا تو رشید نے بگڑ کر فرمایا کہ کاش میں تیری صورت نہ دیکھتا۔ ابن ادریس نے متانت سے جواب دیا کاش میں تیری صورت نہ دیکھتا۔ اور یہ کہہ کر دربار سے چلے آئے۔[۵۴]

امیر سلیمان ابن علی نے اہواز سے ایک قاصد امام ادب خلیل بصری کے پاس بھیجا اور اُن کو امیرزادے کی تعلیم کے لئے طلب کیا۔ ایلچی کی خبر پاکر وہ ادیب منزل باہر آیا۔ خشک روٹی کا ایک ٹکڑا ہاتھ میں تھا۔ وہ ٹکڑا قاصد کو دیا اور کہا کہ لو میرے پاس تو یہی ماحضر ہے۔ اور جب تک یہ موجود ہے خلیل کو سلیمان کی پرواہ نہیں۔ اس کے بعد یہ اشعار لطیف فی البدیہہ تصنیف کرکے اُس کے حوالے کئے۔[۵۵]

---

[۵۱] مد - ج ۱، صفحہ ۱۶۲ [۵۲] مذ ست :- صفحہ ۱۸۵ [۵۳] مد ج ۲، صفحہ ۱۹۱ [۵۴] مد ج ۱، صفحہ ۲۵۸۔

ابلغ سلیمان انی عنه فی سعة | وفی غنی غیر انی لست ذا مال
سخی بنفسی انی لا اری احدا | یموت هزلا ولا یبقی علی حال
والفقر فی النفس لا فی المال نعرفه | ومثل ذاك الغنی فی النفس لا المال
فالرزق عن قدر لا العجز ینقصه | ولا یزیدك فیه حول محتال[1]

شہر دمشق ایک صدی تک دولتِ بنی اُمیہ کا دارالخلافہ رہا تھا۔ اس لئے خارجیت کا وہاں بڑا زور تھا۔ امام نسائی (جن کی سُنن صحاحِ ستہ میں شامل ہے) جب وہاں تشریف لے گئے تو ایک روز مسجد میں ایک شامی نے اُن سے پوچھا کہ حضرت معاویہ کے فضائل کیا کیا ہیں۔ امام ممدوح نے فرمایا کہ تو اس کو کافی نہیں سمجھتا کہ وہ اپنی جان بچالیجائیں جو تو اُن کے مناقب پوچھنے چلا ہے۔ اس فقرے کو سُنکر دمشقی بھڑک اُٹھے اور اس قدر ضربیں امام نسائی کے ایک نازک مقام پر ماریں کہ وہ بیہوش ہوگئے۔ حالتِ بیہوشی میں اُن کے رفقا اُن کو مسجد سے باہر لائے اور اُسی دردناک صدمے سے اُس امامِ حدیث نے وفات پائی۔[2]

امام سلفی کے درس میں ایک دن بادشاہِ مصر مع اپنے بھائی کے آکر شریک ہوا۔ اور وہاں بیٹھکر بھائی سے باتیں کرنے لگا۔ یہ سُوءِ ادب دیکھکر امام موصوف نے بادشاہ کو سرزنش کی اور فرمایا کہ ہم حدیثِ نبوی اس لئے نہیں پڑھ رہے ہیں کہ تم یہاں بیٹھکر باتیں کرو۔[3]

ابو غالب لغوی نے جب اپنی کتاب فنِ لغت میں تصنیف کی تو امیر مجاہد مرسیہ کے با اقتدار فرمانروا نے اپنے ایک معتمد کے ہاتھ ایک ہزار اشرفیاں ان کے پاس بھیجیں اور یہ فرمائش کی کہ کتاب مذکور کے دیباچے میں یہ الفاظ درج کر دیں مما الفه ابوغالب لابی الجیش مجاهد (یعنی اس کتاب کو ابوغالب نے امیر مجاہد کے لئے تصنیف کیا ہے)۔ ابو غالب نے عطیۂ شاہی واپس کر دیا اور کہلا بھیجا کہ اگر ساری دُنیا مجھ کو دیجائے تو بھی میں جھوٹ بولنا روا نہیں سمجھوں گا۔ میں نے یہ کتاب خاص کر امیر کے واسطے تالیف نہیں کی بلکہ عام نفع کے خیال سے لکھی ہے۔[4]

ابن السکیت مصنف "اصلاح المنطق" خلیفہ بغداد متوکل کی خدمت میں حاضر تھے کہ خلافت کے لختِ جگر معتز اور مؤید نمودار ہوئے۔ متوکل نے اُن سے پوچھا کہ یعقوب تم کو کون زیادہ محبوب ہے۔ میرے یہ دونوں بیٹے یا حسنینؓ۔ ابن السکیت نے جواب دیا کہ واللہ حضرت علی کا خادم قنبر تم سے اور تمہارے دونوں بیٹوں سے کہیں بہتر ہے۔ کیا اس تصریح کی ضرورت ہے کہ خلیفہ کے دل میں ان الفاظ نے

---

[1] نزہۃ صفحہ ۷۰ [2] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۲۹۔ [3] تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۹۶ [4] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۹۷

کیا ماشیر کی۔ جس زبان سے یہ الفاظ نکلے تھے وہ خلیفہ کے حکم سے باہر نکال لی گئی۔ اور زبان کے ساتھ روح نے بھی جسم سے مفارقت کی۔[ا]

قاضی ابن رشد مشہور فلسفی جب امیر منصور خلیفہ اندلس کے حضور میں کوئی علمی مسئلہ بیان کرتے تھے تو نشۂ کمال ان کے دل سے خلیفہ کی عظمت مٹا دیتا اور ان معمولی الفاظ سے عطاب کرتے اسمع یا اخی (یعنی سن لے بھائی)۔[ب]

مولانا شمس الدین رومی کی عدالت میں ایک معاملے میں سلطان بایزید نے شہادت دی تو شہادت سلطانی کو اُنھوں نے قبول نہیں کیا۔ جب سلطان نے وجہ پوچھی تو مولانا نے جواب دیا کہ سلطان نماز میں جماعت کا پابند نہیں اور تارکِ جماعت کی شہادت مردود ہے۔[ج]

سلطان محمد خاں نے ایک بار اپنا موسوم (مراسلہ) قاضی بروسہ مولانا شمس الدین کورانی کے پاس بھیجا۔ اُس میں کوئی بات خلاف شرع درج تھی۔ مولانا اُس کو دیکھکر اتنا برافروختہ ہوئے کہ سلطانی فرمان پھاڑ کر لانے والے کو باہر نکالدیا۔ سلطان کو ان کی یہ حرکت بہت ناگوار ہوئی اور غضب سلطانی کا یہ نتیجہ ہوا کہ مولانا کو عہدۂ قضا کے ساتھ سلطنت کے دم بھی چھوڑنی پڑی۔[د]

مولانا ابن خطیب ایک روز عید کی مبارکباد دینے ایوان سلطانی کو گئے۔ اُن دنوں وہ خزانۂ سلطنت کے وظیفہ خوار بھی تھے۔ اور سو درہم یومیہ اُن کو ملتے تھے۔ جب دربار کو چلے تو چند طلبہ ہمرکاب تھے۔ حضور سلطانی میں پہنچے تو سلطان نے ازراہ حسن اخلاق سات قدم بڑھکر استقبال کیا۔ مولانا نے بجائے جھک کر آداب بجالانے کے سلام لیا اور بجائے دست بوسی کے مصافحہ۔ اُن کے ایک شاگرد کو اُستاد کا یہ خلاف آداب برتاؤ ناگوار گزرا اور واپسی میں اُس نے کہا کہ آخر سلطان فرمانروائے وقت ہیں کچھ تو آپ کو جھکنا تھا۔ ابن خطیب نے فرمایا کہ آیا یہ فخر سلطان کے لئے کم ہے کہ ابن خطیب سا فاضل اُنکے پاس گیا۔ اور میں خوب جانتا ہوں کہ سلطان اسی کو غنیمت سمجھتے ہیں۔[ہ]

مولانا یوسف قاضی قسطنطنیہ ایک دن مسجد سے نماز پڑھکر نکلے تو دروازے پر صدر اعظم کے چوبدار کو حاضر پایا جو اُنکے بلانیکو آیا تھا۔ اسوقت مولانا کے سر پر چھوٹا سا عمامہ تھا چھوٹا عمامہ باندھکر بارگاہِ وزارت میں جانا خلاف ادب تھا۔ مگر عدالت مولانا کے دل نے گوارا نہ کیا کہ رب العزت سے زیادہ ادب اس کے ایک بندے کا کریں۔ اُسی عمامہ کو باندھے صدر اعظم کے حضور میں چلے گئے۔ وہاں پہنچے تو اعتراض ہوا۔ اُنھوں نے راستبازی سے اپنا خیال صاف صاف ظاہر کر دیا جس کو سُن کر وزیر اعظم نے بہت پسند کیا اور حضور سلطانی میں اس کی نقل کی۔[و]

منقول از علمائے سلف بار دوم ۱۳۲۶ھ

[ا] ... ۲۱۱ و ۲۱۲ - ۲۲ - ... [ب] ... عیون ... صفحہ ... [ج] شقائق جلد ۱ صفحہ ... [د] شقائق جلد ۱ صفحہ ... [ہ] شقائق جلد ۱ صفحہ ... [و] شقائق جلد ۱ صفحہ ۲۲۲

(از جناب قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر ایٹ لا پٹنہ)

سبد چیں غالب کے فارسی اشعار کا ایک مختصر مجموعہ ہے جو ۱۸۶۷ کے انطباع کے کئی سال بعد چھپا تھا، اور جس کی دوسری اشاعت[۲] اُن کی زندگی ہی میں غالباً کسی دوسرے نام سے طبع ہوئی تھی تیسری[۳] اشاعت ۱۹۲۵ء میں منطبع ہوئی ہے اور اس کے مرتب مالک رام صاحب ہیں۔

الف کا جو نسخہ میں نے دیکھا ہے وہ بنگال رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانے میں ہے۔ تعداد صفحات ۴۲ اور سطر ۱۲ سطروں کا ہے۔ پہلے صفحے پر کتاب کا نام وغیرہ ہے اور دوسرے پر دیباچہ جو ج کے خلاف کسی عنوان کے بغیر درج ہوا ہے۔ اشعار تیسرے صفحے سے شروع ہو کر چالیسویں پر ختم ہو جاتے ہیں، اور اسی صفحے پر چند سطروں کا "خاتمۃ الطبع" ہے۔ آخر کے دو صفحے غلط نامے نے لئے ہیں۔ صفحۂ اول اور "خاتمۃ الطبع" کی عبارتیں جو ج میں نقل نہیں ہوئیں درج ذیل ہیں:-

صفحۂ اوّل:- "ومن یتوکل علی اللہ فہو حسبہ، بفضل الٰہی ایں نگارش رنگین نو آئین مسمّٰی بہ سبد چیں بقیۂ دیوان حضرت غالب مدظلہ العالی در مطبع محمدی باہتمام محمد مرزا خاں طبع شد۔"

خاتمۃ الطبع:- "الحمد للہ کہ ایں نگارش نو آئین مصنفۂ نجم الدولہ دبیر الملک، اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ غالب بتاریخ سیزدہم ماہ ربیع الثانی سال یک ہزار و دو صد و ہشتاد و چہار[۴] ہجری النبوی در مطبع محمدی باہتمام

---

[۱] الف، ب، ج = سبد چیں کی اشاعت اول و ثانی و ثالث علی الترتیب۔ د = کلیات نظم فارسی اشاعت اول۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب کا مملوکہ نسخہ جو میری نظر سے گزرا ہے ناقص الآخر ہے۔ اس سے سالِ طبع کا پتا نہیں چلتا۔ عرشی صاحب جنکے پیش نظر د کی ایک "پرانی نقل" تھی حواشی انتخاب غالب (صفحہ ۲۲۹) میں لکھتے ہیں کہ ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۵ء میں چھپا تھا۔ لا = کلیات نظم فارسی اشاعت دوم۔ یہ پہلی بار ۱۲۷۹ھ میں طبع ہوئی اور اس کے بعد کئی بار چھپی ہے۔ اس وقت جو نسخہ سامنے ہے ۱۹۲۳ء کا مطبوعہ ہے۔ خ = انتخاب غالب۔ کلب علیخاں کی فرمایش سے خود غالب نے ۱۸۶۶ء میں اپنے اشعار فارسی و اردو کا انتخاب کیا تھا۔ م = مکاتیب غالب مرتبۂ عرشی صاحب اشاعت ثانی۔ ن = کلیات نثر فارسی طبع اول مشتمل بر پنج آہنگ، مہر نیمروز و دستنبو۔ ا ر د = اردوئے معلّٰی مطبوعۂ کریمی لاہور۔ یادگار = یادگار غالب حالی، نوار احدی الہ آباد۔

[۲] ب بہت کمیاب ہے اب تک اسکے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ جن کرمفرما کے پاس اس کا ایک نسخہ ہے فی الحال ایران میں ہیں۔

[۳] مطابق ۱۸۶۷ء

[۴] ناشر اور بہ ظاہر مرتب کے نزدیک:

محمد مرزا خاں واقع دہلی کوچۂ چیلہ گذر فیض آباد با تمام رسید و بحسن اختتام انجامید۔"

غالب دیباچے میں رقم طراز ہیں :-

"آنچہ پس از انطباع کلیات فارسی گفتہ شد و آنچہ یاراں از دیرین مسودات داشتند و من از آں خبر نہ داشتم، و اینک بمن رسانندند در اوراق جداگانہ ضبط شد و آں را سبد چیں نام نہادہ آمد۔"

غالب نے غالباً بے ارادہ حقیقت سے کسی قدر انحراف کیا ہے۔ ان کے فحوائے کلام سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ تمام اشعار جو انطباعِ ۵ (ترتیب چاہیئے) کے بعد منظوم ہوئے ہیں، الف میں شامل ہیں، مگر ایسے کچھ اشعار الف سے باہر بھی ہیں۔ مثلاً یہ تین رباعیاں :-

"سر تا سر دہر مشرقستاں کو باد الخ" (م صـ۳۶)، "خواب کر شد ز شوکتِ اقبالش الخ" (م صـ۳۷)

"نوروز و دو عید از دو جانب امسال الخ" (م صـ۶۵)، جو علی الترتیب سنہ ۱۲۸۱ھ، ۱۲۸۲ھ اور مارچ ۱۸۶۶ء کی ہیں۔ اور ۲ شعروں کا وہ قطعہ جس کا ذکر ص۱۱۶ پر ہے اور جس کا مصرع آخر یہ ہے "آمدہ سال رحلتش داغِ جگر گداز ہائے" یہ قطعہ سنہ ۱۲۷۶ھ کا لکھا ہوا ہے۔ غالب کا یہ کہنا بھی صحت سے دور ہے کہ پرانے اشعار میں سے صرف وہی الف میں درج ہوئے ہیں جن کی انھیں "خبر" نہ تھی، اور جو دوستوں سے انھیں ملا تھا۔ ترکیب بند صبیہ جو الف میں شامل ہے اور جس کی نسبت حالی کا بیان ہے کہ :-

"مرزا صاحب کے عزیزوں اور دوستوں نے کلیات فارسی میں ..... چھپنے نہیں دیا" (یادگار صـ۳۲) کبھی ایسی نظموں میں نہیں ہو سکتا جسے غالب نے فراموش کر دیا ہو۔ نظم کی بلند پایگی سے قطع نظر اس کا تعلق انکی زندگی کے ایک ایسے واقعے سے ہے جس نے انھیں بے انتہا متاثر کیا تھا۔ ایک رباعی جس کا مصرع اول یہ ہے :- ع اے داوہ بباد عمر در لہو و فسوس

د اور کلیات ۶ کے ۲ قدیم نسخوں میں جنھیں غالب کی نظر سے گزرنے کا شرف حاصل ہے، موجود ہے۔ ۵ میں اس کا نہ ہونا یقین ہے کہ محض سہو کاتب پر مبنی ہو۔ اگر غالب کی ہدایت کو اس میں دخل ہوتا تو وہ اسے اس انتخاب میں شامل نہ کرتے جو اُنھوں نے کلب علی خاں کے لئے کیا تھا (انتخاب صـ۱۶۷)، الف میں اس کے اندراج کے لئے غالب احباب کے ممنون نہ ہوں گے۔ گلشن بے خار مصنفہ شیفتہ

---

۵ کتب خانہ شرقیہ بانکی پور میں ایک نسخہ ۱۲۵۲ھ اور ایک ۱۲۵۶ھ کا ہے۔ یہ سہیں اختتام کتابت ہیں۔ ۱۲۵۲ھ کے نسخے کا نام مصنف غالب نامہ نے میخانۂ آرزو بتایا ہے۔ اس نسخے پر یہ نام ثبت نہیں، اور نہ کسی دوسرے نسخے پر اس وقت تک یہ یا کوئی دوسرا خاص نام مرقوم ملا ہے۔ علی بخش خاں مرتب پنج آہنگ نے کلیات نظم فارسی کے پہلے نسخے کی نسبت پنج آہنگ کی تمہید میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کا نام میخانۂ مذ... مجھے مولوی عبدالحق صاحب کی اس رائے سے جو انھوں نے ایک خط میں ظاہر کی ہے اتفاق ہے کہ علی بخش خاں نے 'میخانۂ آرزو' سر انجام نام بتایا ہے۔

کا قطعۂ تاریخ کلیات کے ایک قلمی نسخے میں ہے، لیکن الف میں خود گلشن بےخار سے لیا گیا ہوگا جو لا سے بہت پہلے چھپ چکا تھا۔ چار رباعیاں:۔

"جائے کہ ستارہ شوخ چشمی ورزد الخ" (ن ص۱۹۵)، "در کالبد شہر رواں باز آمد الخ" (ن ص۲۰۳)،
"از دہر علم وایہ زہر ورے جست الخ" (ن ص۲۰۵)، "ذیں عالم ہیچ بہ درروانی ماتیم الخ" (ن ص۲۰۶)، بھی غالباً دستنبو سے لی گئی ہیں، اور یہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں کہ ترتیب الف کے وقت غالب ان کے وجود سے بے خبر تھے۔

یہ نہ سمجھا جائے کہ الف میں وہ تمام پرانے اشعار جو کسی نہ کسی وجہ سے لا میں شامل نہ ہو سکے تھے موجود ہیں۔ (۱) جس طرح لا میں کچھ کلام مصلحت کی بنا پر جگہ نہ پا سکا تھا، غالب کی مصلحت اندیشی الف میں بھی کچھ کلام کے عدم شمول کا باعث ہوئی۔ مثلاً وہ مثنوی جو غالب نے ظفر کی زبان سے ان کے مذہبی عقائد کی بابت لکھی تھی، اور جو ۱۲۷۰ھ میں لکھنؤ سے ایک دوسری مثنوی کے ساتھ طبع بھی ہوئی تھی۔ یہ مثنوی غالب کے شیعی احباب کی رنجش خاطر کا سبب ہوئی تھی، الف میں اندراج ان کی مزید برہمی کا باعث ہوتا۔

(۲) غالب کا کچھ پرانا کلام ایسا بھی ہے جو ادبی نقطۂ نظر سے چنداں اہمیت نہیں رکھتا، یہ خوب ممکن ہے کہ غالب نے اسے فراموش کر دیا ہو، اور دوستوں نے یاد دلایا بھی ہو تو وہ اسے محفوظ رکھنے کے قابل نہ سمجھے ہوں۔ کلیات کے قلمی نسخے مکتوبہ ۱۲۵۳ھ میں ایسا کچھ کلام موجود ہے۔

(۳) یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ جزیں غالب کے نزدیک الف میں شامل کرنے کے لائق ہوں، لیکن اس کی ترتیب کے وقت مل نہ سکی ہوں۔

(۴) غالب نے ان سے کچھ ایسے اشعار جو لا میں تھے، الف میں لے لئے تھے، لیکن ان میں ابھی ایسے بہت سے اشعار ہیں جو نہ لا میں ہیں نہ الف میں۔

(۵) غالب کی ایک غزل جس کا مطلع یہ ہے:۔

شب ہائے غم کہ چہرہ بہ خوناب شستہ ایم | از دیدہ نقش وسوسۂ خواب شستہ ایم (لا ص۵۵)

لا کے علاوہ نہ اد نسخہ ۱۲۵۴ھ میں بھی ہے۔ اس زمین کی بیت ذیل:۔

تر دامنی نصیب کس از اہل دیں مباد | مائیم ولوث بادہ کہ از آب شستہ ایم (خ ص۱۴)

جو نہ کسی قلمی کلیات میں اب تک ملی ہے اور نہ کلیات کے کسی مطبوعہ نسخے میں، اور ۱۸۶۳ء میں اس قابل سمجھی گئی تھی کہ غالب کے انتخاب میں آئے۔ الف میں کیوں نہ شامل ہوئی اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

ترتیب الف کے وقت پرانے اور نئے اشعار جو چھوٹ گئے تھے ان میں کس حد تک داخل ہو سکے

---

۵۷ یہ مثنوی متفرقات غالب میں شامل ہے۔ (ص۱۴۵) اس کے متعلق معلومات کے حصول کے لئے متفرقات مع ضمیمہ اب اس کے مقدمے کے صفحات ۱ تا ۲۰، یادگار ص۲۳ اور ص۱۹۵ ملاحظہ ہوں۔

اس کا مجھے علم نہیں۔ غالب نے دیباچے میں لکھا ہے کہ ابیات الف "در شمار بہ ہزار بیت نتواند رسید"
لیکن مکررات سے قطع نظر، ان کی تعداد ۱۲۷۷ ہے۔ ان میں سے ایک رباعی کے دو شعر: ؎

نام اب و جد و عم نہ گیرند ایں قوم　　　فیض از دم مادراں پذیرا آمد ایں قوم
از مادر و از مادرِ مادر گویند　　　کس در کس امیر ابن امیر ند ایں قوم (الف ص۳۱۶)

ج میں موجود نہیں، باقی ۱۲۷۵ ہیں۔ اس رُباعی کا حذف جائز بلکہ بعض اصحاب کی رائے میں مستحسن قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن اس کے متعلق مرتب کی کامل خاموشی کسی طرح قابل تعریف نہیں۔ ۹۔ اشعار ج میں ایسے ہیں جو الف میں نہیں، یہ مرتب نے بڑھائے ہیں۔ مکررات کو چھوڑ کر ج کے کل اشعار ۱۲۸۰ ہیں۔ یہ زائد اشعار کہاں سے لئے گئے ہیں؟ اس کے بارے میں مرتب کا بیان ہے:۔

"میرزا صاحب کا بہت سا کلام تھا، جو مختلف کتابوں میں منتشر پڑا تھا، اور ان کے کسی مجموعے میں آج تک شامل نہیں ہوا تھا، ہم نے اسے بھی اکٹھا کر کے اس مجموعے میں شامل کر دیا ہے۔ امید ہے کہ کلیات نظم و نثر کے باہر ان کا جتنا کلام ہے آپ اس ایڈیشن میں پائیں گے۔"

حقیقت یہ ہے کہ مرتّب نہ تو غالب کے کل کلام کو "جو مختلف کتابوں میں منتشر پڑا تھا" ج میں جمع کر سکے، اور نہ انھوں نے ایسے اشعار کو جو "کلیات نظم و نثر" میں موجود ہیں، اس میں شامل کرنے سے کامل احتراز کیا ہے۔ مثال کے لئے اس مثنوی کو لیجئے جو ظفر کے متعلق ہے اور جس کا ذکر اوپر آیا ہے۔ نہ یہ ج میں ہے اور نہ وہ مثنوی[۵] جو غالب نے اپنے بھانجے کی فرمائش سے لکھی تھی اور جو ۱۲۸۳ھ میں نول کشور نے چھاپی بھی تھی۔ ان دونوں کے سوا اور بھی کلام ہے جو ج میں نہیں۔ اُن کے ماخذ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) کلیات[۶] نثر غالب جس سے یہ بیت منقول ہے: ؎

شاہی و درویشی ایں جا باہم ست　　　پادشاہ عہد قطب عالم ست (ج ص۵، ن ص۱۳۹)

یہ بیت اس مثنوی کی ہے جو ظفر کی مدح میں ہے، نہ معلوم اس کے اور ابیات ج میں جگہ نہ پا سکے۔

(۲) ل جس سے ذیل کی رُباعی لی گئی ہے:۔ ؏

ایں کردہ بہ ہنر زرفشانی تعلیم الخ (ج ص۹، ل ص۱۴)

(۳) م جس سے بیت آخر قطعۂ ۲۷ (ج ص۱۳، م ص۷)، قطعات ۴۴ تا ۴۶ (ج ص۱۲، ۱۳، م ص۱۳، ۱۴، ۱۶)
قطعہ ۴۸ (ج ص۱۶، م ص۹) اور ج ص۶ کا چوتھا اور پانچواں شعر ماخوذ ہے (م ص۱۵، ۱۸)۔

---

[۵] معتقد م م ص۳۳ ملاحظہ ہو۔

[۶] یہ ممکن ہے کہ مرتب نے یہ بیت ن سے نہیں کہیں اور سے لی ہو لیکن اس کا اصلی ماخذ ن ہی ہے۔

(۴) ا ر دو جس میں قطعات ۳۵ و ۳۶ (ج صـ۵۵ ا ر دو صـ۲۳۳و۲۳۴) قطعات ۴۰ تا ۴۲ (ج صـ۵۹ و ۶۰ ار دو صـ۲۲ و ۳۲۱ و ۱۷۷ و ۴۸۳ و ۴۹۲) رباعی ۱۸ (ج صـ۷۹ ار دو صـ۱۷۷) اور ج صـ۷۵ کا پہلا اور دوسرا شعر (ار دو صـ۱۴۱ و ۴۹۵) موجود ہے صـ۷۵ کا دوسرا شعر :-

فرخ آں روز کہ از خانۂ زنداں بروم سوئے شہر خود ازیں وادی ویراں بروم

بہ خوبی ممکن ہے کہ غالب کا نہ ہو۔ غالب کے کسی خط میں اس کا پایا جانا اس کا ثبوت نہیں کہ غالب کا زادۂ طبع ہے۔

(۵) یادگار جس سے قطعہ ۴۳ (ج صـ۶۱ یادگار صـ۶۰) اور غزل ۱۰ (ج صـ۸۷ + یادگار صـ۵۷ +) لی گئی ہے۔

(۶) دیوان اردو جو شجاع الدین احمد خاں تاباں مرحوم کے خانداں میں محفوظ ہے۔ قطعہ ۴۹ (ج صـ۶۳) اس کے آخر میں ہے۔

(۷) تذکرۂ غوثیہ[۹]۔ جس سے قطعہ ۴۵ (ج صـ۶۴) ماخوذ ہے۔

(۸) تیغ تیز جس سے ایک مثنوی نقل ہوئی ہے (ج صـ۹۵ تیغ تیز صـ۲ +)۔

(۹) واقعات دار الحکومت دہلی حصۂ دوم جس سے قطعہ ۳۷ (ج صـ۵۸ لیا گیا ہے)۔

(۱۰) نامعلوم ماخذ جس سے قطعہ ۴۷ (ج صـ۶۲) منقول ہے۔

ان کے علاوہ اور ماخذوں کی طرف مرتب نے توجہ نہیں کی۔

مرتب نے اپنے ماخذوں کی نشان دہی کا کوئی معقول طریقہ اختیار نہیں کیا۔ نظموں کی بہت بڑی تعداد ایسی ہے جس کے ماخذ کی نسبت ج میں کوئی اطلاع نہیں ملتی۔ ان میں سے بہت زیادہ وہ نظمیں ہیں جو الف میں ہیں، لیکن بعض ایسی بھی ہیں جو الف میں نہیں۔ ج صـ۸ کے متفرق اشعار، رباعیات ۱۷ و ۱۸ اور قطعہ ۴۴ ماخذوں کے ذکر سے خالی ہیں، اور ان میں سے کوئی الف میں نہیں۔ قطعہ ۴۲ کے ۵ ابیات میں سے ۴ الف میں موجود ہیں، صرف پانچواں اس میں نہیں م سے لیا گیا ہے، لیکن مکمل قطعے کا ماخذ م بتایا ہے، جو صورت حال کو صحیح طور پر نہیں ظاہر کرتا۔ قطعۂ ۴۳ کے لئے مرتب نے اردو کا حوالہ دیا ہے، گر یہ الف میں بھی ہے۔ پڑھنے والا ضرور اس نتیجے پر پہنچے گا کہ الف اس سے خالی ہے۔ قطعہ ۴۹ کے بارے میں مرتب نے لکھا ہے (ج حاشیہ صـ۶۳) کہ یہ اور اس کے بعد کے "قطعے" مہر صاحب سے ملے ہیں، لیکن اس کے بعد صرف ایک قطعہ ہے۔ یہ بالکل پتا نہیں کہ قطعہ ۴۷ کہاں سے لیا ہے۔

حواشی ج میں جو معانی درج ہیں وہ حاشیۂ صـ۹ کے معانی کے سوا الف سے ماخوذ ہیں، اس کے

---

[۹] یہ کتاب میرے پاس نہیں، میں نہیں کہہ سکتا کہ اس میں کوئی قطعی ثبوت اس امر کا کہ قطعہ ۴۵ غالب کا ہی، موجود ہے یا نہیں۔

متعلق مرتب نے کوئی اطلاع نہیں دی۔ مرتب نے یہ اچھا کیا ہے کہ علائی کا ایک قطعہ جو قطعہ ۳۰ سے تعلق رکھتا
ہے حاشیہ ص۵۴ پر رسالہ "زمانہ" لاہور سے لیکر درج کر دیا ہے۔

مرتب نے جیسا کہ وہ خود مدعی ہیں اشعار ج میں جس ترتیب سے پیش کیے ہیں، وہ الف سے مختلف
ہے۔ ج میں ص۷ سے ص۲۳ تک قصائد، ترکیب بند اور ترجیع بند ہیں، الف میں یہ نظمیں ج ہی کی ترتیب کے
ساتھ ص۳ سے ص۲۰ تک ہیں۔ ج میں ص۲۴ پر جو مثنوی ہے، الف کے ص۳۶ پر ہے۔ ج میں ص۳۵ سے
ص۵۱ تک ۲۶ قطعے ہیں جو الف میں ص۲۴ سے ص۳۴ تک ہیں۔ ج میں قطعات ۲۷ تا ۳۳ ص۵۱ سے ص۵۶
تک ہیں اور الف میں ص۳۷ تا ص۴۰ پر درج ہیں۔ قطعہ ۳۴ ج میں ص۵۶ پر اور الف میں ص۳۶ پر ہے۔
ج کے قطعات ۳۵ تا ۵۰ جو ص۵۷ سے ص۶۴ تک ہیں، الف میں موجود نہیں۔ ج کے ص۶۵ پر جو مثنوی
ہے وہ بھی الف میں نہیں۔ ج میں ص۶۶ سے ص۷۱ تک ۷ غزلیں ہیں جو الف میں ص۲۰ سے ص۲۴ تک
ہیں۔ ج کی آٹھویں غزل جو ص۷۱ پر ہے الف میں ص۳۸ پر اور ج کی نویں غزل جو ص۷۲ پر ہے الف میں
ص۴۰ پر ہے۔ ج کی دسویں غزل (ص۷۲ و ۷۳) الف میں نہیں۔ متفرق اشعار جو ج ص۷۴ پر ہیں الف میں
ص۲۴ پر ہیں، ج ص۷۵ کے متفرق اشعار سے الف خالی ہے۔ رباعیات ۱ تا ۱۵ ج میں ص۷۶ سے ص۷۹
تک ہیں اور الف میں ص۳۴ سے ص۳۶ تک۔ رباعی ۱۶ ج کے ص۷۹ پر اور الف کے ص۳۶ پر مثنوی کے
بعد ہے۔ رباعیات ۱۷ تا ۲۰ ج میں ص۷۹ و ص۸۰ پر ہیں، اور یہ الف میں نہیں۔

ایک نظم کو جس کی بیت افتتاحی یہ ہے: ؎

تعظیم غسلِ صحت نواب کم پگیر   زاں عید کاں مضاف بود جانبِ غدیر (ج ص۱۵)

غالب نے الف میں قطعہ کہا ہے، مرتب نے اسے عنوان قصائد کے تحت درج کیا ہے۔ اس کا پہلا شعر مطلع
ہے اور اس کے اشعار کی تعداد ۳۶ ہے۔ مگر اس کا لہجہ قصائد کا نہیں۔ قطعے کی تعریف میں اختلافات ہیں، میں
اس وقت اس جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتا کہ اسے قطعہ کہنا چاہئے یا قصیدہ: ؎

نوروز و دو عید از دو جانب امسال   خوب ست زروے وضع و نیک ست بہ فال (ج ص۶۳)
امید کہ ایں سہ عید نذر نواب   آرند دوام عمر و عزّ و اقبال

داد و دہش تو روز افزوں بادا   بر دولتِ تو زمانہ مفتوں بادا (ج ص۶۲)
ایں عید و دو صد ہزار عید دیگر   بر ذات تو فرخ و ہمایوں بادا

مرتب کے نزدیک یہ دونوں نظمیں قطعے ہیں، لیکن یہ فاحش غلطی ہے۔ یہ دونوں رباعی کے مقررہ اوزا
میں ہیں، اور انھیں رباعی کے سوا کچھ اور نہیں کہنا چاہئے۔ میں اس سے ناواقف نہیں کہ غالب نے م میں

پہلی رُباعی کو قطعہ کہا ہے، اگر غلطی میں تقلید کیا ضرور ہے؟ ج صفحہ پر یہ بیت :- شاہی و درویشی ـــــ الخ 'متفرق اشعار' کے ذیل میں درج ہے، لیکن یہ بیت مثنوی کی ہے۔ ج صفحہ پر مثنوی کے اشعار عنوان 'نظم' کے تحت مرقوم ہیں، ج صفحہ ۲۲ پر عنوان مثنوی کے تحت جو مثنوی مندرج ہے۔ یہ اشعار اس کے بعد کیوں نہیں لکھے گئے سمجھ میں نہیں آتا۔ نیا عنوان قائم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

ج میں بہت سی نظمیں ایں جو کسی نہ کسی واقعے سے وابستہ ہیں اور ان میں فن جمل کے مطابق اُن واقعات کے سنین موجود ہیں۔ مرتّب کا فرض تھا کہ وہ یہ دکھائیں کہ مادّہ ہائے تاریخ سے مطلوبہ سنین نکلتے ہیں یا نہیں اور نکلتے ہیں تو کس طرح۔ انھوں نے بالالتزام اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ قطعہ اول میں گلشن بے خار کے اتمام کی تاریخ ہے۔ اس کی بیت آخر یہ ہے :ے

گر کسے لب تشنۂ تاریخ اتمامش بود ۔۔۔ جو بہائے آب ہم در گلشن بے خار ہست (ج صفحہ ۳۵)

اگر پورے دوسرے مصرع کو لیجئے تو اس سے مطلوبہ اعداد سے کہیں زیادہ نکلتے ہیں۔ صرف 'جو بہائے آب' اور 'گلشن بے خار' کے اعداد کو ملانے سے ۱۲۸۴ مستخرج ہوگا جو غالب چاہتے ہیں۔ ایک قطعے کے آخری دو ابیات یہ ہیں :ے

قطعۂ تاریخ آں فرخ بنا ۔۔۔ ہم در آنجا صورتِ ارقام یافت
شست پا چوں راحت و آرام جست ۔۔۔ ہر دو را در گوشۂ حمام یافت (ج صفحہ ۳۵)

یہ پہلے سے معلوم نہیں کہ غالب کو کون سے اعداد مطلوب ہیں۔ پہلے مصرع سے ۱۲۴۲ نکلتا ہے اور دوسرے سے ۱۴۴۲۔ ان دونوں مصرعوں کے اعداد نہ مل کر کام دے سکتے ہیں نہ الگ الگ۔ صریحاً تعمیہ ہے۔ خواہ خارجی ہو یا داخلی یا دونوں، مگر اس وقت سمجھ میں نہیں آتا کہ غالب کیا چاہتے ہیں۔ 'چشمۂ زمزم صفت مسجد کعبہ بنا' (ج صفحہ ۴۲) میں کوئی دشواری نہیں، ۱۲۶۹ نکلتا ہے۔ قطعہ ۱۳ (ج صفحہ ۴۲) کے آخری اشعار یہ ہیں :ے

گفتم از خوبی رخش ماناب خورشید ست گفت ۔۔۔ سال ایں فرخ ولادت نیّر اعظم بگو
گفتمش دیگر چہ گوئی زیر لب خندید و گفت ۔۔۔ بائے زاید باید انگند از بگو ایں ہم بگو

نیّر اعظم سے ۱۲۷۱ نکلتا ہے۔ غالب اس میں سے ب کے عدد ۲ نکالنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ 'خاقانی ہند مُرد افسوس' (ج صفحہ ۴۳) سے بے تکلف ۱۲۷۱ نکلتا ہے۔ اور 'خجستہ بہار ادب' (ج صفحہ ۴۹) سے بھی بے تعمیہ ۱۲۸۳ مستخرج ہوتا ہے۔ ظفر نامۂ ابد' (ج صفحہ ۵) سے ۱۲۸۲ نکلتا ہے اور الف میں یہی لکھا ہو لیکن ج میں غالباً کاتب کی غلطی سے یہ ۱۲۸۲ ہوگیا ہے۔ "رستخیز" سے ۱۲۷۷ نکلتا ہے اور نبی بخش حقیر کی وفات ۱۲۷۰ھ میں ہے، مرتب کا 'رستخیز' کے اعداد ۱۰۰۹ بتانا حیرت انگیز ہے۔ (ج صفحہ ۶) ایک قطعہ ہے :ے

نہادہ بنا احسن اللہ خاں ۔۔۔ سر رہ بد انساں دردل کشا
کہ غالب پے سالِ تعمیر او ۔۔۔ رقم زد دردل کشا مرحبا (ج ص ۴۲)

مادۂ تاریخ "دردل کشا مرحبا" ہی، مگر اسکے اعداد الف اور ج دونوں میں سے کسی میں مرقوم نہیں۔ اس سے ۱۰۶ نکلتا ہی، جو ظاہر ہو کہ کسی طرح عدد مطلوب نہیں ہوسکتا۔ میرا قیاس ہی کہ 'مرحبا' طباعت کی غلطی ہی۔ اس کی جگہ دراصل 'حبذا' ہوگا۔ اس صورت میں ۱۲۷۰ نکلے گا جو قرین قیاس ہے۔

الف کے بعض اغلاط بجنسہٖ ج میں منتقل ہو گئے ہیں، اور کچھ نئے اغلاط بھی ہیں جو ج میں داخل ہو گئے ہیں کہیں کہیں دونوں میں املا کا بھی فرق ہی۔ بعض اغلاط کی تصحیح اور املا کے بعض اختلافات کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہی:-

(۱) ص۸ زمانہ دار = زمانہ وار ۔ (۲) ص۱۵ رواکردہ = رواں کردہ ۔ (۳) ص۱۶ برترانۂ سودا و درد میر = برترانۂ سودا و درد و میر ۔ (۴) ص۱۸ ثنائے کنم = ثنا مے کنم ۔ (۵) ص۱۹ نگاری = انگاری ۔ (۶) ص۱۹ ارنائیں = ارنائیس ۔ (۷) ص۲۰ زہے = خہے ۔ (۸) ص۲۲ انگلینڈ = انگلنڈ ۔ (۹) ص۲۹ مے ریز مدے = مے ریزم ۔ (۱۰) ص۳۹ صدو شصت = صدو شست ۔ (۱۱) ص۴۰ اوستاد = استاد ۔ (۱۲) ص۵۲ الگزنڈر = الکزنڈر ۔ (۱۳) ص۶۶ غم زیادہ = غم زبادہ ۔ (۱۴) ص۷۰ ارداح = ارواح و ۔ (۱۵) ص۷۵ بیخودی = بخودی ۔ (۱۶) ص۷۶ اندریں = ایں ۔ (۱۷) ص۸۰ تواب کہ شد زشوکت

اقبالش بخشیدن باج ملّا از اقبالش (الف و ج) اس بیت میں ایطائے جلی ہے۔ دوسرے مصرع میں 'اقبالش' کی جگہ 'افضالش' بے تکلف آسکتا ہی۔ (۱۸) ص۲۰ بقاست قرض و نیم حمزہ و زبہر من اند = الف اور ج ـــــ دونوں میں بقا ہے، اور الف کے غلط نامے میں اس کی صحت نہیں ہوئی۔ یہ 'لقا' ہے۔ غالب کا مصرع ہی

درمعنی اسے مرا صفحہ لقا کی ڈاڑھی

دیباچۂ سبد چیں کے آخر میں غالب نے لکھا ہے:-

"اکنوں کہ ناسور کہن راتراوش نماند، کلک از کف فرو گذاشتہ ام ہمیں اگر سخن در اندیشہ خواہد گزشت روشناس صفحہ نخواہد گشت"

الف میں جو نیا کلام ہی، اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ اس زمانہ کا ہی جب غالب کے دماغی قوی انحطاط پر تھے۔ بعض اصحاب کا یہ خیال کہ آخر عمر میں غالب نے قاآنی کا تتبع شروع کیا تھا، اس کلام سے ثابت نہیں ہوتا، ہاں کسی کا یہ کہنا البتہ صحیح ہی کہ اس زمانے میں بھی اُن کی ظرافت کم نہ ہوئی تھی +

قاضی عبدالودود

ازبکستان کی علمی سرگرمیاں

(۲)

(از جناب ل۔ احمد صاحب اکبر آبادی)

پچھلے سال اس عنوان سے "معنف" میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں وہاں کے بعض علمی و کلچری اداروں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ تازہ اطلاعات سے ایک اور علمی ادارے کا حال معلوم ہوا ہے۔ جو دوسری قسط کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

ان مضامین کے شائع کرنے سے میرا اصل مقصود یہ ہے کہ ہندوستان اور وسط ایشیا کے مسلمانوں کے مابین کلچری رابطہ و تعلق جو عہد تاریخ میں بہت قریبی رہ چکا ہے پھر سے قائم ہو اور اس نئے دور میں ایک دوسرے سے نئی باتیں سیکھیں اور سکھائیں۔ ل۔ احمد

جمہوریہ ازبکستان کی جامعہ علوم نے جس کا مستقر جمہوریہ کا پایۂ تخت تاشقند ہے۔ اس مستقر سے اپنی پہلی کانفرنس کا اجلاس سمرقند میں منعقد کیا۔ سمرقند دنیا کے سب سے زیادہ پرانے شہروں میں سے ایک ہے، اور فاتح عالم امیر تیمور کا پایۂ تخت رہ چکا ہے۔ آل تیمور کے دورِ حکمرانی میں سمرقند کا شمار دُنیا کے بہت بڑے علمی و کلچری مرکزوں میں ہوتا تھا۔ انتہا ہے کہ حافظ شیرازنے کسی کے "خال ہندو" کی نذر کیلئے بخارا کے ساتھ سمرقند ہی کو منتخب کیا تھا۔ سوویٹ عہد میں بھی سمرقند اور اس کی یونیورسٹی بہت بڑا علمی و کلچری مرکز ہے، اور اس یونیورسٹی کا شمار بھی بہت بڑی یونیورسٹیوں میں ہے۔

اکیڈمی کے اجلاس میں شرکت کرنے والے ممبروں کو پہلے دو دن سمرقند اور مضافات شہر کی سیر کرائی گئی۔ اور یہ ایک حسین اتفاق تھا کہ یہی دن مسلمانوں کے تہوار "قربان" کے دن تھے۔ اس لئے ساری آبادی بازاروں، باغوں اور تاریخی یادگاروں کی سیر کے لئے نکل آئی تھی۔ مطلع بالکل صاف تھا اور نیلگوں آسمان کے پس منظر پر لوگوں کے رنگارنگ لباس، اُزبک و تاجیک گھوڑا سوار اور دو رویہ درختوں کے زرد پتے اور پھر پارکوں کا سبزہ زار ایک پُربہار اور مسرت خیز نظارہ تھا۔

کانفرنس کے ایجنڈے میں ایسی تجویزیں زیادہ تھیں جن کا تعلق سمرقند کی تاریخ اور اس کے متعلق تحقیق و تفتیش سے تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ ایسے جدید موضوع پر بھی غور و فکر کیا گیا جس کا تعلق ازبکستان کی پیداواری قوتوں کی ترقی سے تھا۔ مثلاً وسط ایشیا کی تاریخ موالیہ پنیچرل ہسٹری سے متعلق ہوئی دریافتیں ہوتی ہیں یا ازبکستان میں جو غیر ملکی پودے لگائے جانے والے تھے یا مقامی زراعت پر وہاں کے نباتات کا کیا اثر پڑتا ہے۔ وغیرہ موضوعات پر بھی بحث و تمحیص کی گئی۔

اجلاس کی پہلی نشست میں پہلا مقالہ اکیڈمی کے صدر پروفیسر طاش محمد قاری نیازوف نے پڑھا اس مقالے میں پروفیسر نیازوف نے شاہزادہ الغ بیگ، امیر تیمور کے پوتے کی تعمیر کرائی ہوئی رصدگاہ کے متعلق اپنی تدقیق و تحقیق کے نتیجے پیش کئے۔

الغ بیگ دنیا کے بڑے ہیئت دانوں میں سمجھا گیا ہے، اور اس کے بنائے ہوئے زائچے صدیوں تک تمام مہذب ملکوں میں فلکیات پر مستند مانے جاتے تھے پچھلی صدی ہی نہیں بلکہ بیسویں صدی کے شروع تک اس کی بعض دریافتیں مسلمہ طور پر مقبول تھیں اور ان کی صحت و کاملیت دنیا کے سائنسدانوں کے لئے وجہ حیرت بھی ہوئی تھی۔ الغ بیگ کو چند رجعت پرستوں نے جن میں خود اس کا بیٹا شریک تھا، قتل کر دیا تو رصدگاہ کے علمی مشغلے کو جاری رکھنے والا کوئی دوسرا نہ تھا چنانچہ اس کی دیکھ ریکھ موقوف ہو گئی اور وہ رصدگاہ زمانے کی دستبرد کا شکار بن گئی، یہانتک کہ اس کا سراغ بھی غائب ہو گیا۔

اس صدی کے شروع تک یوں خیال کیا جاتا تھا کہ الغ بیگ کی رصدگاہ تباہ و مسمار ہو کر بے پتا ہو گئی اور اس کی جائے وقوع بھی معلوم نہ کی جا سکی۔ گر ۱۹۰۸ء میں روسی سائنسداں فیاتکین FYATKIN کی تلاش و جستجو سے نہ صرف جائے وقوع متحقق ہو گئی بلکہ ریت کی تہوں میں دبے ہوئے کھنڈروں کا بھی سراغ چل گیا۔ اس تحقیقات میں فیاتکین کو ایک آلۂ پیمائش بھی دستیاب ہو گیا۔ مگر کسی وجہ سے اس وقت مزید تحقیق جاری نہ رہ سکی۔

سویٹ عہد میں قاری نیازوف اور دوسرے ماہروں کی کوشش سے کھدائی کا کام مکمل ہوا اور اس عمارت کے متعلق بیش قیمت معلومات حاصل ہوئیں۔

قاری نیازوف نے اپنے مقالے میں بیان کیا ہے کہ اس تحقیق و تلاش کے بعد یہ ممکن ہو گیا ہے کہ اس رصدگاہ کی تعمیری نوعیت کو قطعیت کے ساتھ بیان کیا جا سکے جو اپنے عہد تعمیر میں دنیا کی بے مثال عمارت تھی اور ساری دنیا میں صرف قسطنطنیہ کی عمارت ایا صوفیہ اس کی ہم پایہ عمارت کہی جا سکتی تھی۔ قاری نیازوف کا خیال ہے کہ تعمیر اور نقشہ کشی سے ثابت ہوتا ہے کہ کمال ذہانت اور اعلے فن تعمیر سے

کام لیا گیا تھا۔ اُس نے یہ بھی بتایا ہے کہ اگرچہ اُس زمانے میں خوردبینی آلات معلوم تھے مگر اِس رصدگاہ سے سورج اور ستاروں کی چال کا صحیح صحیح حساب لگایا جا سکتا تھا، اور الغ بیگ کے زائچے اور حساب آج بھی دُنیا کے سائنسدانوں کی حیرانی کا موجب ہیں۔ قاری نیازوف نے اپنے مقالے کے شروع میں کہا کہ:-

"میری تحقیق ایسے قلمی نسخوں پر مبنی ہے جو ابھی تک نامعلوم تھے، اور جن میں کے محض تو وسط ایشیا کے ہی کتب خانوں میں تحریر ہوئے تھے۔ اور یہ نسخے زیج اکاڈمی کے ادارہ شرقیات کے کتب خانے کا بیش قیمت جزو ہیں۔"

"اس مطالعے سے معلوم ہوا ہے کہ رصدگاہ کی مرکزی عمارت اسطوانی (CYLINDRICAL) وضع کی تھی، اور ایک بڑے گنبد کی طرح اٹھتی گئی تھی۔ اس عمارت کی کئی منزلیں تھیں، اور اس سے ملحق اور بھی متعدد عمارتیں تھیں جو آلات پیمائش وغیرہ کے لئے اسطور کا کام دیتی تھیں یا ان میں بیٹھ کر ہیئت داں اپنا کام کرتے تھے۔ عمارت ایک بہت بڑے باغ کے بیچ میں تھی اور الغ بیگ اس باغ میں زیادہ وقت صرف کیا کرتا تھا۔"

آگے چل کر قاری نیازوف نے بتایا ہے کہ:-

"الغ بیگ کی مدد کے لئے فلکیات کے ماہروں کی خاصی بڑی تعداد کام کرتی رہتی تھی، اور یہ علماء جو نتیجے اخذ کرتے تھے، خود ہی انکا تجزیہ بھی کرتے تھے کہ غلطی کا کوئی امکان ہی نہ رہے۔"

ماہرین کی تلاش سے پیمائش کا جو آلہ دستیاب ہوا تھا اس کے متعلق قاری نیازوف نے بتایا ہے کہ:-

"اس آلے کو غلطی سے "مزولہ" یعنے دائرے کا ربع (QUAIM - UT) باور کر لیا گیا۔ اصل میں وہ ایک خاص قسم کا آلہ تھا جسے اُس زمانے میں "فہری" (FAHRI) کہتے تھے، اور وہ ایک زاویہ پیما (EXTANT) تھا۔"

قاری نیازوف کے اس تحقیقی مقالے نے یہ جدید دریافت پیش کر کے فلکیات کے ماہروں کو الغ بیگ کا طریقۂ کار سمجھنے کے لئے ایک نیا زاویہ دے دیا ہے۔ اس لئے کہ اب تک کی تمام تحقیق کا مدار اس خیال پر تھا کہ الغ بیگ کا آلۂ پیمائش مزولہ یعنی ربع دائرہ تھا، اور اس خیال نے رصدگاہ کے تعمیری نقشے کی نوعیت کو سمجھ سکنا ناممکن بنا رکھا تھا، جدید علمائے سائنس حیران تھے کہ الغ بیگ کا آلۂ پیمائش سمت الراس کے مطابق بنا اور اس کا رُخ جنوبی تھا سماوی نصف الارض کے ستاروں کی گردش کا معائنہ وہ کیسے کر سکا؟ قاری نیازوف کی تحقیقات نے یہ بتا کر کہ وہ آلۂ پیمائش فہری یعنے زاویہ پیما تھا، اس لئے جنوبی رُخ کا معائنہ کیا جا سکتا تھا، سائنسدانوں کی حیرانی کو رفع کر دیا ہے۔ نیازوف نے اس مقالے میں یہ بھی بتایا کہ:-

"ایک بہت بڑے قطعے (SECTION) کی [illegible] یہ بھی [illegible] ہو جاتا ہے کہ الغ بیگ اپنے کام کی تنظیم

کانفرنس کے ایجنڈے میں ایسی تجویزیں زیادہ تھیں جن کا تعلق سمرقند کی تاریخ اور اس کے متعلق تحقیق و تفتیش سے تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ ایسے جدید موضوع پر بھی غور و فکر کیا گیا جس کا تعلق ازبکستان کی پیداواری قوتوں کی ترقی سے تھا۔ مثلاً وسط ایشیا کی تاریخ مواد یا نیچرل ہسٹری سے متعلق ہوئی دریافتیں ہوتی ہیں یا ازبکستان میں جو غیر ملکی پودے لگائے جانے والے تھے یا مقامی زراعت پر وہاں کے نباتات کا کیا اثر پڑتا ہے۔ وغیرہ موضوعات پر بھی بحث و تمحیص کی گئی۔

اجلاس کی پہلی نشست میں پہلا مقالہ اکیڈیمی کے صدر پروفیسر طاش محمد قاری نیازوف نے پڑھا اس مقالے میں پروفیسر نیازوف نے شاہزادہ الغ بیگ، امیر تیمور کے پوتے کی تعمیر کرائی ہوئی رصدگاہ کے متعلق اپنی تدقیق و تحقیق کے نتیجے پیش کئے۔

الغ بیگ دنیا کے بڑے ہیئت دانوں میں سمجھا گیا ہے، اور اس کے بنائے ہوئے نقشے صدیوں تک تمام مہذب ملکوں میں فلکیات پر مستند مانے جاتے تھے پچھلی صدی ہی نہیں بلکہ بیسویں صدی کے شروع تک اس کی بعض دریافتیں مسلمہ طور پر مقبول تھیں اور ان کی صحت و کاملیت دنیا کے سائنسدانوں کے لئے وجہ حیرت بھی ہوئی تھی۔ الغ بیگ کو چند رجعت پرستوں نے جن میں خود اس کا بیٹا شریک تھا، قتل کر دیا تو رصدگاہ کے علمی مشغلے کو جاری رکھنے والا کوئی دوسرا نہ تھا چنانچہ اس کی دیکھ ریکھ موقوف ہو گئی اور وہ رصدگاہ زمانے کی دستبرد کا شکار بن گئی، یہانتک کہ اس کا سراغ بھی غائب ہو گیا۔

اس صدی کے شروع تک یہی خیال کیا جاتا تھا کہ الغ بیگ کی رصدگاہ تباہ و مسمار ہو کر بے نشان ہو گئی اور اس کی جائے وقوع بھی معلوم نہ کی جا سکی۔ مگر سنہ ۱۹۰۸ء میں روسی سائنسداں فیاتکین FYATKIN کی تلاش و جستجو سے نہ صرف جائے وقوع متحقق ہو گئی بلکہ ریت کی تہوں میں دبے ہوئے کھنڈروں کا بھی سراغ چل گیا۔ اس تحقیقات میں فیاتکین کو ایک آلۂ پیمائش بھی دستیاب ہو گیا۔ مگر کسی وجہ سے اس وقت مزید تحقیق جاری نہ رہ سکی۔

سوویٹ عہد میں قاری نیازوف اور دوسرے ماہروں کی کوشش سے کھدائی کا کام مکمل ہوا اور اس عمارت کے متعلق بیش قیمت معلومات حاصل ہوئیں۔

قاری نیازوف نے اپنے مقالے میں بیان کیا ہے کہ اس تحقیق و تلاش کے بعد یہ ممکن ہو گیا ہے کہ اس رصدگاہ کی تعمیری نوعیت کو قطعیت کے ساتھ بیان کیا جا سکے جو اپنے عہد تعمیر میں دنیا کی بے مثال عمارت تھی اور ساری دنیا میں صرف قسطنطنیہ کی عمارت ایا صوفیہ اس کی ہم پایہ عمارت کہی جا سکتی تھی۔ قاری نیازوف کا خیال ہے کہ تعمیر اور نقشہ کشی سے ثابت ہوتا ہے کہ کمال ذہانت اور اعلے فن تعمیر سے

کام لیا گیا تھا۔ اُس نے یہ بھی بتایا ہے کہ اگرچہ اُس زمانے میں خوردبینی آلات معلوم تھے مگر اس رصدگاہ سے سورج اور ستاروں کی چال کا صحیح صحیح حساب لگایا جا سکتا تھا، اور اُلغ بیگ کے زائچے اور حساب آج بھی دُنیا کے سائنسدانوں کی حیرانی کا موجب ہیں۔ قاری نیازوف نے اپنے مقالے کے شروع میں کہا ہے:۔

"میری تحقیق ایسے قلمی نسخوں پر مبنی ہے جو ابھی تک نامعلوم تھے، اور جن میں کے کچھ تو وسط ایشیا کے ہی کتب خانوں میں تحریر ہوئے تھے۔ اور یہ نسخے ازبک اکاڈمی کے ادارۂ شرقیات کے کتب خانے کا بیش قیمت جزو ہیں۔"

"اس مطالعے سے معلوم ہوا ہے کہ رصدگاہ کی مرکزی عمارت اسطوانی (CYLINDRICAL) وضع کی تھی، اور ایک بڑے گنبد کی طرح اٹھتی گئی تھی۔ اس عمارت کی کئی منزلیں تھیں، اور اس سے ملحق اور بھی متعدد عمارتیں تھیں جو آلات پیمائش وغیرہ کے لئے اسٹور کا کام دیتی تھیں یا ان میں بیٹھ کر ہیئت داں اپنا کام کرتے تھے۔ عمارت ایک بہت بڑے باغ کے بیچ میں تھی اور اُلغ بیگ اس باغ میں زیادہ وقت صرف کیا کرتا تھا۔"

آگے چل کر قاری نیازوف نے بتایا ہے کہ:۔

"اُلغ بیگ کی مدد کے لئے فلکیات کے ماہروں کی خاصی بڑی تعداد کام کرتی رہتی تھی، اور یہ علما جو نتیجے اخذ کرتے تھے، خود ہی ان کا تجزیہ بھی کرتے تھے کہ غلطی کا کوئی امکان ہی نہ رہے۔"

فیاتکین کی تلاش سے پیمائش کا جو آلہ دستیاب ہوا تھا اس کے متعلق قاری نیازوف نے بتایا ہے کہ:۔

"اس آلے کو غلطی سے "مزولہ" یعنے دائرے کا ربع (QUAIM - UT) باور کر لیا گیا۔ اصل میں وہ ایک خاص قسم کا آلہ تھا جسے اُس زمانے میں "فہری" (FAHRI) کہتے تھے، اور وہ ایک زاویہ پیما (EXTANT) تھا۔"

قاری نیازوف کے اس تحقیقی مقالے نے یہ جدید دریافت پیش کر کے فلکیات کے ماہروں کو اُلغ بیگ کا طریقۂ کار سمجھنے کے لئے ایک نیا زاویہ دے دیا ہے۔ اس لئے کہ اب تک کی تمام تحقیق کا مدار اس خیال پر تھا کہ اُلغ بیگ کا آلۂ پیمائش مزولہ یعنی ربع دائرہ تھا، اور اس خیال نے رصدگاہ کے تعمیری نقشے کی نوعیت کو سمجھ سکنا ناممکن بنا رکھا تھا، جدید علمائے سائنس حیران تھے کہ اُلغ بیگ کا آلۂ پیمائش سمت الراس کے مطابق بنا اور اس کا رُخ جنوبی تھا سماوی نصف الارض کے ستاروں کی گردش کا معائنہ دیکھئے کیسے کر سکا؟ قاری نیازوف کی تحقیقات نے یہ بتا کر کہ وہ آلۂ پیمائش فہری یعنے زاویہ پیما تھا، اس لئے جنوبی رُخ کا معائنہ کیا جا سکتا تھا، سائنسدانوں کی حیرانی کو رفع کر دیا ہے۔ نیازوف نے اس مقالے میں یہ بھی بتایا کہ:۔

"ایک بہت بڑے قطعے (SECTION) کی قدرت سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ اُلغ بیگ اپنے کام کی تنظیم

میں بھی مذکور تھا، دائرے کے چھٹے حصے کی قوسی شکل کا آلہ متوازی سمرقند سے آفتاب کا معائنہ کرنے کے لئے بالکل کافی اور نہایت مناسب آلہ ہے، اور مربع دائرے کی شکل کے آلے کا خیال ہی مغالطہ میں ڈال دینے والی چیز تھا۔ الغ بیگ کے اس زاویہ پیما کا قطر بہت بڑا اور اس کی قوس کا نصف دائرہ چالیس میٹر تھا ز ایک میٹر ۲۰۴۹ اعشاریہ ۲۹ کے برابر ہے)۔"

زاویہ پیما کی مدد سے الغ بیگ کے حسابات اس قدر صحیح تھے کہ سائنس کی نئی دُنیا ان کی صحت پر آج بھی حیران ہے۔ ہیئتی لوگ اس حساب کو مقادیر ثابتہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ الغ بیگ کا گردشِ شمسی کے معائنے کا طریقہ صحیح ترین اور مصدقہ مانا جاتا ہے۔

قاری نیازوف نے یہ بھی بتایا کہ الغ بیگ کے مقادیر ثابتہ کی صحت کا راز اس کے آلۂ پیمائش یعنے اس کے زاویہ پیما کے بہت بڑے سائز میں تھا۔ اس وقت تک کے تمام معلوم آلوں سے اس آلے کا سائز بہت بڑا تھا، اور زاویہ پیما گردش آفتاب کے حساب میں جتنی کامل صحت سے کام دیا یہی وجہ ہے کہ الغ بیگ کے گردشِ سیارگاں کے زائچے اتنے صحیح نہ تھے جتنا اس کا گردشِ شمسی کا حساب صحیح تھا۔

قاری نیازوف کا مقالہ ختم ہونے پر اکیڈیمی کے سارے ممبر رصدگاہ کے کھنڈر دیکھنے گئے اور مقالے کے بیانات کی تصدیق ٹھوس مثالوں کو دیکھ کر کی۔

اکیڈمی کے اس سمرقندی اجلاس میں قاری نیازوف کے اہم مقالے کے علاوہ بھی نہایت دلچسپ تحقیقی مقالے پڑھے گئے۔ ازبک اکیڈمی کے مراسلتی ممبر سمیونوف نے عہدِ تیموری کے مشہور مورخ شرف الدین الیزدی کی تالیف فتح نامہ کا ایک قلمی نسخہ پیش کیا جو تمام تر طلاکار اور مصور تھا۔ اس نسخے میں تصویریں بکثرت دیگئی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ اس زمانے میں وسط ایشیا کے صناعوں کا اپنا ایک جدا اسکول تھا اور ان کی ٹیکنک بہت دلچسپ تھی۔ یہ اسکول ایرانی فن نقاشی سے بلاشبہ بہت زیادہ متاثر تھا مگر اس کے باوجود اس کی اپنی خصوصیات بھی تھیں اور وہ نمایاں تھیں۔ ان میں سے ایک خصوصیت یہ تھی کہ ان کے یہاں رمزیت (SYMBOLISM) برائے نام اور واقعیت نگاری (REALISM) بہت نمایاں اور واضح ہے۔

اکیڈمی ممبر بومنتوف نے ملا عبدالقادر بیدل پر ایک پرمغز مقالہ پڑھا۔ بیدل ہندوستان کا سترھویں صدی کا مشہور صوفی، مفکر اور شاعر تھا۔

پروفیسر سعید نے "نوائی کا تغزل" کے عنوان پر ایک نہایت دلچسپ مقالہ پڑھا۔ ملا علی شیر نوائی ازبک قومی ادب کا موجد و بانی ہی نہیں بلکہ قومی ہیرو بھی مانا جاتا ہے۔

الحاصل اکیڈمی کا یہ اجلاس نہایت شاندار و کامیاب اجلاس تھا، اور بہت سے عملی نتیجے بھی برآمد ہوئے۔

رُباعیاتِ گویا جہاں آبادی

احدیت

اے نور یہ تنویرِ فراواں تیری — ہے ذرّوں میں تفسیرِ درخشاں تیری
ظلمت بھی نہیں تیرے کرم سے محروم — تاروں سے شبِ ماہ بداماں تیری

رسالت

معراج صفات کا پتا دیتی ہے — صد رفعتِ ذات کا پتا دیتی ہے
تا منزلِ منتہا ہے کاملِ انساں — مقصودِ حیات کا پتا دیتی ہے

نفسیات

تم پھول بنو اور بنا لو مجھے بُو — تم اپنے چمن ہی میں رہو میں ہر سُو
طے کر لے گا دل منزلیں ناکامی کی — ہو جائے گا گم بعد ہمارا من و تو

آئینے کو پہلو میں لئے بیٹھا ہے — کچھ اس طرح جیسے کہ چھپے بیٹھا ہے
اللہ غنی کیفِ جمالِ ہستی — ہستی ہی کو دل کھوئے بیٹھا ہے

آؤ نہ چلو سیرِ گلستاں کریں — ہم خود کو نہاں، تم کو نمایاں کر لیں
ہو جائے گی پھر آپ ہی تکمیلِ بہار — غنچوں کو شریکِ غمِ حرماں کر لیں

جب وہ نظر آیا تو نظر آیا میں — نظروں میں تھا نظروں میں اِدھر آیا میں
اتنا سا رہا موج میں پردہ باقی — تا حشر تڑپنے کو اُبھر آیا میں

جمالیات

گو ماہِ کرم سیرِ سحابے آمد — دریائے جمال در حُبابے آمد
اللہ غنی تجلیاتِ رخسار — در شیشۂ اشک آفتابے آمد

خود کا ہکشاں نے یہ بتایا ہے تجھے
تاروں سے گزرتے ہوئے پایا ہے تجھے
اے حسن خدا اتنا بتادے مجھ کو
کیوں کر مری حیرت نے چھپایا ہے تجھے

کلیوں کے تبسم تو سبھی دیکھتے ہیں
تاروں کے تکلم تو سبھی دیکھتے ہیں
اے دیدۂ مشتاق ذرا آگے بڑھ
وہ ہیں، مہ و انجم تو سبھی دیکھتے ہیں

عشق

اے شب کو ستاروں میں ٹہلنے والے
پردے سے سرِ شام نکلنے والے
بن کر مِہ نظارا سما جا دل میں
ورنہ مرے آنسو ہیں مچلنے والے

جب خاک پہ آنسو کو تڑپتا دیکھا
ساقی نے کئی بار اُٹھایا دیکھا
دیکھا تو عجب شیشۂ مے آیا نظر
جس میں گلِ رخسار کا جلوہ دیکھا

اقبال کو بخشا تھا پیامِ مشرق
ساقی نے دیا ہے مجھے جامِ مشرق
تفسیر اشارات[1]، بہارِ دارین
خورشیدِ رسالت، سرِ بامِ مشرق

غزل

بادہ و جام نہ ابر و مہتاب
عکسِ رخسار سے رنگیں ہے نقاب
اللہ اللہ جمالِ ساقی
شیشۂ مے نظر آتے ہیں حباب
بھولی بسری ہیں شعاعیں، موجیں
شوقِ ساحل میں مسلسل بے تاب
اک تموّج ہے حیاتِ میکش
دور میں آپ سے باہر ہے شراب
اشک ہیں نغمۂ سازِ ہستی
ہر توہم سرد ہے گویا مضراب

---

[1] اشارات صفحہ ۳۱۵ رباعیوں کا ایک مجموعہ ہے۔

نواب شمس الامراء کے ادبی کارنامے

(از جناب مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی حیدرآباد دکن)

حیدرآباد کے جاگیرداران میں پائیگاہی جاگیردار کئی حیثیتوں سے دوسرے جاگیرداروں پر فوقیت
کھتے ہیں، ان کی جاگیروں کا رقبہ ہندوستان کی بعض دیسی ریاستوں سے بڑا ہے۔ رقبہ کی طرح
بادی اور آمدنی بھی کافی ہے۔ امرائے پائیگاہ سلاطین آصفیہ کے داماد بنتے رہے ہیں۔ اس کے قطع نظر
لم و فن کی قدردانی اور اہلِ علم کی سرپرستی کے لحاظ سے بھی امرائے پائیگاہ کو امتیاز حاصل رہا ہے۔

عصر حاضر میں مزدور اور سرمایہ داروں کی جو چپقلش ہر طرف رونما ہے۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں
ہے۔ کسان اور مزدور اس امر پر شاکی ہیں کہ ان کی محنت کا پورا معاوضہ نہیں ملتا۔ زمیندار اور سرمایہ دار ان
ں محنت سے فائدہ اُٹھایا کرتے ہیں۔ واقعات کے لحاظ سے یہ خیال صداقت پر مبنی نظر آتا ہے۔ مگر
م گزشتہ زمانہ پر نظر ڈالیں تو واضح ہوتا ہے کہ ہمارے جاگیردار یا سرمایہ دار دولت سے اگر خود مستفید
ہوتے تھے تو اس کے ساتھ ساتھ وہ اہلِ علم کی سرپرستی بھی کرتے، شعراء اور ادیبوں کی دستگیری سے
دریغ نہیں کرتے تھے۔ وہ طلبہ کے لئے تعلیمی سہولتیں فراہم کیا کرتے اور اُن کو وظائف دیا کرتے
علماءِ وقت کو روزینے جاری کرکے ان کو فکرِ معاش سے مستغنی کرتے۔ تاکہ وہ طلبہ کو مفت درس دیا
یں۔ غرض کہ اگر ایک طرف وہ اپنی ذات پر خرچ کرتے تھے تو دوسری طرف علم کی ترویج میں خرچ
رنے سے بھی دریغ نہیں ہوتا تھا۔

اسی قسم کی ایک ممتاز ہستی نواب شمس الامراء امیر کبیر کی تھی۔ نواب فخر الدین خاں امیر کبیر
س الامراء کے جدِ اعلیٰ ابو الخیر خاں عالمگیری عہد کے ایک نامور شخص تھے۔ جو حضرت بابا فرید الدین گنج شکر
ں اولاد میں تھے۔ حضرت آصف جاہ اوّل کے ہمراہ رکاب دکن آئے۔ شکر کھیرہ کی مشہور لڑائی
ں کارنمایاں انجام دے کر آصفی دربار میں خاص رسوخ و اثر قائم کر لیا۔ ابو الخیر خاں اور آپ کے
رند ابو الفتح خاں اپنی زندگی تھے۔ آصفجاہ اوّل اور ثانی کے متوسل رہے اور ہر وقت سفر و حضر میں
ھ رہا، میدانِ جنگ میں سینہ سپر ہو کر دادِ شجاعت دی۔ اور جاں بازی کے جوہر دکھائے تو

میدانِ سیاست میں سیاسی مرد میدان بنے۔ سلاطینِ آصفی کو دکن میں اپنی سلطنت کے مستحکم کرنے اور برقرار رکھنے کے لئے جو معرکے سر کرنے پڑے اس میں ان دونوں باپ بیٹوں کا بڑا حصہ ہے۔ آصفجاہ ثانی نے ابو الفتح خاں کی اسی مردانگی و جانبازی کے باعث اپنے باڈی گارڈ کا افسر اعلیٰ مقرر کرکے جمعیت اور رسالہ پائیگاہ کے لئے جاگیر عطا فرمائی۔ پائیگاہ کی فوج کے افسروں کو پندرہ پندرہ سو ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ اور اُس وقت کے خالصہ کی شاہی فوج کے قطع نظر جن کو کئی کئی ماہ تک تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ پائیگاہ کے سپاہی ماہوار اپنی تنخواہ حاصل کرتے تھے۔ اُس زمانہ میں یہ ایسا امتیاز تھا جو کسی دوسری جاگیردار کے ملازمین کو حاصل نہیں تھا۔ بہرحال اُمراء پائیگاہ نے اپنی وفاداری اور جاں بازی سے سلطنت آصفیہ کے بقاء اور اس کے استحکام میں پورا حصہ لیا ہے۔

ابو الفتح خاں کے فرزند محمد فخر الدین خاں ہیں جن کی ولادت ۱۱۹۵ھ میں ہوئی۔ اپنے باپ کے انتقال کے وقت جو ۱۲۰۵ھ میں ہوئی آپ ہنوز کمسن تھے۔ والدہ کی زیر نگرانی تعلیم و تربیت ہوئی بلکہ دربار شاہی اور ایوانِ بادشاہی میں پروان چڑھے۔ آبائی خطابات اور جاگیریں تو باپ کے مرتے ہی مرحمت ہو چکے تھے۔ جوان ہولے پر آصفجاہ ثانی نے اپنی دختر نیک اختر بشیر النساء بیگم صاحبہ سے آپ کا عقد کر دیا۔ اس طرح آپ پہلے پہل خاندانِ شاہی میں منسلک ہو گئے۔ شمس الملک شمس الامراء کے علاوہ امیر کبیر کا جدید خطاب ملا۔ جاگیر میں اضافہ ہوا۔ آصفجاہ ثانی کے انتقال تک آپ موردِ عنایاتِ شاہی بنے رہے۔ اس کے بعد آصفجاہ ثالث اور رابع کے دَورِ حکمرانی میں اسی طرح عزّت و حرمت اور نام آوری سے زندگی بسر کرتے رہے ۱۲۷۹ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ شمس الامراء کے زمانہ میں جس قدر لڑائیاں دولتِ آصفیہ کو لڑنی پڑیں اُن میں پائیگاہی فوج برابر شریک ہو کر حق نمک ادا کرتی رہی۔

امیر کبیر کے اخلاق و عادات | آپ کی علمی قابلیت اور لیاقت، آپ کی خودداری اور قدرشناسی اہلِ علم کی سرپرستی وغیرہ کے متعلق بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ آپ اپنے وقت کے صاحب تدبیر اور بڑے مدبر تھے۔ آپ نے اپنی جاگیرات کا انتظام اس عمدگی سے کیا تھا کہ جاگیر کی رعایا ہر وقت خوش و خرم خوشحال اور فارغ البال رہی۔ دوسرے جاگیرداران کی طرح آپ نے رعایا پر بے جا ٹیکس اور محصولات کا بار نہیں ڈالا تھا۔ پائیگاہ کی فوج عمدہ ساز و سامان سے ہر وقت مستعد اور تیار رہا کرتی۔

آپ اپنے وقت کے صاحب علم و فضل تھے، مشرقی علوم کے ساتھ مغربی زبانوں انگریزی اور فرانسیسی پر عبور حاصل تھا۔ علم ریاضی۔ ہیئت۔ طبیعات۔ فلسفہ سے زیادہ دلچسپی تھی۔

علم دوستی، علم پروری کے لحاظ سے آپ کا نام زندگی جاوید کا مستحق ہے۔ کئی مدرسے قائم کئے۔ طلبہ کو وظائف عطا کئے۔ شعراء اور مصنفین کو صلے دے کر بہت افزائی فرمائی۔ آپ کی سرپرستی اور داد و دہش کے باعث بیسیوں اربابِ قلم اصحاب فن نے اپنے افکار اور خیالات کو کتابوں کی صورت میں منظرِ عام پر پیش کر کے خراجِ تحسین حاصل کیا۔

امیر کبیر نواب شمس الامراء کا سب سے زیادہ اہم اور قابل قدر کارنامہ یہ ہے کہ آج سے ایک سو سال پہلے آپ نے مغربی زبانوں سے علم طبیعات، ریاضیات، ہیئت اور طب کی کتابوں کو اُردو میں منتقل کر کے شائع فرمایا۔ اور پھر ان کی تعلیم کا انتظام فرمایا۔ حقیقت یہ ہے کہ نواب شمس الامراء کا یہ کارنامہ ایسا درخشاں اور ممتاز ہے کہ جس کو زمانہ مٹا نہیں سکتا اور حوادثات محو نہیں کر سکتے اب ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ آپ کے ان دو کارناموں کی صراحت کرتے ہیں۔

دار الترجمہ | عام طور سے ڈاکٹر گلگرائسٹ کو دار الترجمہ کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ کیونکہ ۱۸۰۳ء میں انھوں نے اس کام کو شروع کیا تھا۔ گو اس میں شک نہیں کہ انھوں نے فارسی اور سنسکرت سے اردو میں سلیس اور عام فہم زبان میں کتابیں مرتب کریں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ امر ملحوظ رہے کہ اس کے چالیس پچاس سال کے بعد بھی جو کتابیں اہل علم مرتب کرتے تھے وہ عام فہم اور آسان زبان میں نہیں ہوتی تھیں۔ یعنی ڈاکٹر گلگرائسٹ کی پیروی کسی نے نہیں کی۔ چنانچہ اس کے ثبوت میں سید احمد خاں مرحوم کی آثار الصنادید کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ جو ۱۸۴۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ اُس زمانہ کے رواج کے مطابق مقفّیٰ اور مسجّع عبارت میں مرتب ہوئی ہے۔ ڈاکٹر گلگرسٹ کے ترجموں کے متعلق دوسری بات یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ کام کیا وہ اپنے ہم وطن اصحاب کی خاطر تھا تاکہ وہ جلد سے جلد اُردو زبان سے واقف ہو جائیں۔

چنانچہ زیادہ تر قصے اور کہانیوں کی کتابیں یہاں تیار ہوئی ہیں۔ اگرچہ تاریخ اور اخلاق کی بعض کتابیں بھی مرتب ہوئی ہیں۔ مگر ان کی تعداد ایک دو سے زیادہ نہیں ہے۔ اور پھر سب سے زیادہ قابلِ غور یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے انگریزی یا فرنچ زبان سے کسی کتاب کا ترجمہ نہیں کیا تھا۔ علم سائنس کی کوئی کتاب ان کے دار الترجمہ سے مرتب اور شائع نہیں ہوئی ہے۔

اس کے مقابل میں نواب شمس الامراء کا کارنامہ ہر حیثیت سے قابل ستائش اور لائق تحسین معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ سب سے پہلے انھوں نے ہی علم سائنس کی کتابوں کے ترجمہ کا انتظام فرمایا تھا۔ اور سائنس کے مختلف شعبوں کی کتابیں جو ا ں ۔ انگریزی یا فرنچ میں لکھی گئی تھیں

اُن کا ترجمہ فرمایا۔ دوسرے یہ کہ آپ کے ترجمہ کے بعد عام طبقے علم سائنس سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اخبارات میں سائنس کے مضامین شائع ہونے لگے۔ آسان عام فہم زبان میں کتابیں مرتب ہونے لگیں۔

نواب شمس الامراء کا دارالترجمہ ۱۲۵۲ھ مطابق ۱۸۳۴ء میں قائم ہوا تھا۔ دارالترجمہ میں سات اصحاب مامور تھے۔ جو یہ ہیں :۔ غلام محی الدین حیدرآباد۔ میر امان علی دہلوی۔ مسٹر جونس۔ موسیو سنڈرسی۔ میر شجاعت علی۔ رتن لال۔ مسٹر جوزف۔

افسوس ہے کہ اس دارالترجمہ کی تیار شدہ پوری کتابوں کی تفصیل ہم کو نہیں معلوم لیکن جو مواد دستیاب ہوا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ (۳۵) سے زیادہ کتابیں مرتب ہوئی تھیں۔ ان کی فن کی تقسیم یہ ہے :۔

(۱) ریاضی عملی و نظری۔ (۲) طبیعات۔ (۳) کیمیا۔
(۴) حیوانات۔ (۵) ہیئت۔ (۶) طب ڈاکٹری و یونانی۔

جو مواد ہم کو دستیاب ہوا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۲۷۳ھ تک یہ دارالترجمہ قائم تھا۔ جو کتابیں یہاں تیار ہوتی تھیں اُن میں سے اکثر شائع ہوگئی ہیں۔ لیکن بعض مخطوطات نواب ظہیر یار جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ پوری کتابیں شائع نہیں ہوئی۔

یہ موقع نہیں ہے کہ میں تفصیل کے ساتھ اُن کتابوں کا حال لکھوں جو یہاں سے ترجمہ ہوکر شائع ہوئی ہیں لیکن ایک دو کتابوں کی کسی قدر صراحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔

ستہ شمسیہ :۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے چھ کتابوں کا مجموعہ ہے یا یہ کہ یہ چھ حصّوں پر مشتمل ہے اس کا حجم (۲۰۸۷) صفحات پر حاوی ہے۔ پہلی جلد میں جر ثقیل۔ ہیولا اور اس کے اقتضاءات کشش۔ انجماد۔ کشش ثقل۔ مرکز جر ثقیل کی دیگر قوتوں کا تذکرہ ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے سو سال پہلے فنی حیثیت سے جو معلومات تھیں وہ قابل قدر تھیں۔ مثلاً کثافت۔ جسامت۔ وزن وغیرہ کے متعلق جو معلومات تھیں وہ اُس زمانہ میں تقریباً تھیں اب بالکل صحت کے ساتھ ان کی پیمائش کی جاسکتی ہے۔ پیچ۔ ترازو۔ حرکت سے متعلق کلیات وغیرہ کو پیش کر دیا گیا ہے۔

دوسری جلد میں علم ہیئت کا بیان ہے۔ اس میں ثوابت۔ نظام شمسی۔ حرکت زمین۔ چاند اور دوسرے اقمار۔ موسم۔ مد و جزر۔ ایام کے اعتدال حقیقی اور کبیسہ وغیرہ کا بیان ہے۔ ثوابت میں

پہلے جبکہ یہ کتاب شائع ہوئی تھی اُس وقت عام طور سے ستاروں کو وہمی نظر سے دیکھا جاتا تھا مریخ کو جلاد۔ مشتری کو سعد تصور کرتے تھے۔ شمس الامراء کے ان ترجموں کے باعث توہم پرستی کے دائرہ سے باہر ہو کر اُردو کی علمی دُنیا میں صحیح معلومات پیش ہوئیں۔ ستاروں کے مختلف مداروں کی گردش اور اُن کے محوروں کا میلان اُن میں تناسب موسمی تبدیلیاں اور ان کی حرارت وغیرہ کا صحیح خیال ہمارے سامنے پیش ہوا۔ اس میں چاند گرہن اور سورج گرہن کے متعلق بھی کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔

تیسری جلد کو علم آب سے موسوم کیا گیا ہے۔ لیکن دراصل مائیات ہونا چاہئے۔ کیونکہ اس میں مائیات سے ہی بحث کی گئی ہے۔ ارشمیدس کے اصول کو ایک سَو سال پہلے اردو میں وضاحت کے ساتھ بیان کرنا قابلِ تعریف ہے۔ آب پیما ہائیڈرومیٹر کے بیان کے علاوہ سیلفس کے اصول کو بھی سمجھایا گیا ہے۔ پانی میں تیرنے والے اجسام کے متعلق بھی کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔

چوتھی جلد علم ہَوا سے متعلق ہے۔ اس میں ہوا کے وزن۔ دباؤ۔ لچک۔ ہوائی پمپ۔ گونج وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ کلیہ بائل کو آج سے سَو سال پہلے بہت اہم خیال کیا جاتا تھا۔ اور اب تک اس کی اہمیت کا اندازہ اِس سے کیا جا سکتا ہے کہ ایف اے کے نصاب میں شامل ہے۔ ہَوا اور گیسوں پر دباؤ کی وجہ سے جو حجمی تبدیلی ہوتی ہے اس کو اسی کلیہ کے ذریعہ ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں بادپائی اور طیش پیمائی کے متعلق بھی بہت کچھ معلومات ہیں۔

پانچویں جلد میں انعکاس۔ نور اور نور کے اجزاء محدب عدسے قوس قزح وغیرہ کا بیان ہے۔ آج سے سَو سال پہلے اس کو "علم النظارئین" سے موسوم کیا گیا ہے۔ مگر اب اس کو علم مناظر کہتے ہیں۔ عصرِ حاضر میں علم مناظر کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک تو ہندسی مناظر اور دوسرے کو طبعی مناظر کہتے ہیں۔ اس پانچویں جلد میں ہندسی مناظر کا بیان ہوا ہے۔ اس میں انعکاس۔ انعطات نور کو وضاحت سے سمجھایا گیا ہے۔ سفید نور کی ساخت یعنی یہ کہ رنگوں کا آمیزہ ہے ثابت کر دیا گیا ہے۔ "عدسے" اور کروی آئینوں کے ضابطوں کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ دُوربین اور خوردبین کی اہمیت کو اشکال کے ذریعہ سے دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

چھٹی جلد میں برق اور مقناطیس کا بیان ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ مقناطیس کس طرح بنتا ہے۔ اصلی مقناطیس کیا ہے۔ دوسرے دھاتی اجسام پر اس کا کیا اثر رونما ہوتا ہے۔ اس میں مقناطیسیت کے مختلف نظریوں کا تذکرہ نہیں ہے۔ کیونکہ سَو سال پہلے اس کے متعلق کافی معلومات نہیں تھیں۔

موجودہ زمانہ میں برق کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی سکونی برقیات، رودانی برقیات اور جدید برقیات زیر بحث کتاب میں زیادہ تر سکونی برق سے بحث کی گئی ہے۔ برق بار کے اقسام اور اس کو حاصل کرنے کے طریقے بیان کئے گئے ہیں۔ برقی باروں میں دفع اور کشش کے کلیہ کو بھی وضاحت سے سمجھایا گیا ہے۔ سکونی برقیات کے متعلق بعض مشینوں کو بھی نقشوں کے ذریعہ بتایا گیا ہے۔ مثلاً لیدن کا مرتبان وغیرہ۔

اس تفصیل سے واضح ہو سکتا ہے کہ "ستہ شمسیہ" کے ذریعہ آج سے سو سال پہلے کس طرح سائنس کے مضامین کو دنیائے اردو کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب بہت مقبول تھی۔ کیونکہ کئی مرتبہ اس کی طباعت ہوئی ہے۔ چنانچہ پہلی مرتبہ تو ۱۲۵۶ھ میں اور اس کے بعد دوسری مرتبہ ۱۲۶۱ھ میں طبع ہوئی۔ ان دونوں مرتبہ یہ خط نسخ میں ٹائپ ہوئی ہے۔ تیسری بار ۱۲۸۳ھ میں مدراس کے مطبع اسلامیہ میں طبع ہوئی ہے۔ اور نستعلیق خط ہے۔ چوتھی بار ۱۳۱۶ھ میں دہلی میں منشی امیر احمد صاحب کے مطبع میں طبع ہوئی ہے۔

۱۲۵۶ھ سے ۱۳۱۶ھ تک اس کتاب کا شائع ہونا اسکی مقبولیت کی کافی دلیل ہے۔

اگر اس موقع پر "ستہ شمسیہ" کے دیباچہ کی عبارت کا نمونہ پیش کیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ اس سے اس وقت کی زبان کا اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ دیباچہ کا اقتباس حسب ذیل ہے:

"بعد حمد و نعت کے بندہ نیازمند درگاہ ایزدی کا محمد فخر الدین خاں المخاطب بہ شمس الامرا اس طور سے گذارش رکھتا ہے کہ اکثر اوقات کتابیں چھوٹی بڑی علوم فلاسفہ کی جو زبان فرنگ میں مرقوم ہے بہ سبب میلان طبیعت کے کہ بہت اس طرف شوق رکھتا تھا۔ میری سماعت میں آئیں۔ اس جہت سے چند مسائل ان کے ازبر تھے۔ اور اگرچہ بعضے فلاسفہ زبان عرب و عجم میں بھی مشہور ہیں۔ چنانچہ علم جرثقیل اور علم المناظر وغیرہ مگر اس قدر نہیں ہیں۔ جیسا کہ اب اہل فرنگ نے ان کو دلائل و براہین سے بدرجۂ کمال اثبات کیا ہے بلکہ بعضے علوم اہل فرنگ میں ایسے رواج پائے ہیں کہ ان کے نام بھی یہاں کے لوگوں نے نہیں سنے۔ چنانچہ علم آب اور ہوا اور برق اور مقناطیس اور کیمسٹری وغیرہ اس واسطے مدت سے ارادہ تھا کہ مبتدیوں کے فائدے کے لئے کوئی کتاب مختصر جامع چند علوم کی زبان فرنگ سے ایسی ترجمہ کیجاوے۔ کہ فرصت قلیل میں اس کی معلومات سے طالبوں کو کچھ کچھ فائدہ میسر ہووے۔ کس واسطے کہ اگر بڑی بڑی کتابوں کا ترجمہ ہوگا تو طالبوں کے ذہن پر اس کے مطالعہ کا بار ہوگا۔ اور مختصر رسالوں کے دیکھنے سے ان کی طبیعت آشنائے علوم ہو جائے گی۔ پھر طالبین از خود ارادہ مبسوط کتاب کے دیکھنے کا کریں گے۔ چنانچہ ان دنوں میں حسب مدعا

چند رسالے مختصر علوم فلاسفہ کے بطریق سوال و جواب کے لکھے ہوئے ریورنڈ جان جائس صاحب کے انگریزی زبان
میں جو ۱۸۱۱ء میں بیچ شہر لندن کے چھاپے گئے تھے ہم پہنچے۔ .... بفضل حق سبحانہٗ تعالیٰ
کے یہ چھ رسالے ترجمہ ہوئے مگر بعضے اسماء انگریزی اصطلاح کے جو زبان عربی اور فارسی میں نہ میسر ہوئے
ان کو اسی زبان اصلی پر بحال رکھنے میں آیا۔ اور یہ چھ رسالے جو ترجمہ کئے گئے چھ علم پر مشتمل ہیں۔ اس
واسطے ان کا نام ستہ شمسیہ رکھا گیا .... اور مادہ تاریخ اس رسالہ کا گزرانا
ہوا حافظ مولوی شمس الدین فیض کا یہ ہے: "شمس الامراء کی ہے یہ تالیف"۔

نفس مضمون کا مختصر نمونہ ملاحظہ ہو:-

"تلمیذ خرد۔ تمام اجسام پر خواہ سطح زمین سے قریب ہوں یا بعید کشش ثقل کیا یکساں عمل کرتی ہے؟
استاد۔ نہیں کشش ثقل یعنی قوت جاذبہ اس قدر گھٹتی ہے جس قدر کہ جسم کی دوری کا
مرکز زمین سے بڑھتا ہے۔ اس واسطے کہ قوت جذب کی علاقہ رکھتی ہے۔ مرکز زمین سے نہ سطح زمین سے۔
تلمیذ خرد حضرت یہ امر بے مثال دریافت کرنا کمال دشوار ہے اگر کوئی مثال کہ اس کے وسیلے
سے یہ امر مشکل میرے فہم ناقص میں آوے ارشاد فرمائیں۔
استاد۔ مناسب ہے۔ سو ایک فوٹ کے بعد پر شمع سے ایک معین روشنی کا جو تمہاری کتاب
پہنچتا ہے --- ---- اور اس سے کتاب پڑھ سکتے ہو۔ پس اگر دو فیٹ شمع سے پیچھے ہٹو گے تو اس
صورت میں اگرچہ دوچند بعد شمع سے ہوا پر اول سے چار چند کم روشنی پہنچے گی۔ جو مربع دوچند دوری کا یعنی
مضروب فی نفسہ دو کا ہے۔ اور اسی طرح ۳ اور ۴، ۵ اور ۶ فیٹ کے فاصلے پر ۹، ۱۶، ۲۵، ۳۶
چند کم اول سے پہنچے گی۔"

مطبع یا پریس | نواب شمس الامراء نے جہاں دارالترجمہ قائم کیا تھا وہاں ایک پریس بھی قائم فرمایا تھا تاکہ
کتابوں کی اشاعت میں سہولت ہو۔ یہ پریس ۱۲۵۱ھ ۱۸۳۲ء میں قائم ہوا تھا۔ اور "سنگی چھاپے خانہ
شمس الامراء" سے موسوم تھا۔ اس پریس میں کتابیں نسخ میں ٹائپ ہوتی تھیں۔ پریس میں تصویر کشی
کا بھی انتظام تھا۔ لیتھو میں سائنسی آلات اور نقشے وغیرہ طبع ہوتے تھے۔ اس زمانہ میں عام طور سے
ہندوستان میں بھی مطبعوں کا رواج نہیں تھا۔ صرف کلکتہ یا مدراس میں ایک دو پریس تھے۔

مدرسے | نواب شمس الامراء نے صرف سائنس کی کتابوں کے ترجمہ اور ان کی اشاعت پر اکتفا نہیں
کیا بلکہ ان کی تعلیم کا بھی انتظام فرمایا تھا۔ یوں تو آپ نے کئی مدرسے قائم فرمائے تھے۔ مگر ان میں سب سے
بڑا مدرسہ "مدرسہ فخریہ" سے موسوم تھا جو ۱۲۴۷ھ میں قائم ہوا تھا۔ اس مدرسہ میں عربی۔ فارسی۔

کے ساتھ ان کتابوں کی تعلیم ہوتی تھی جو نواب صاحب کے دارالترجمہ میں تیار ہوتی تھیں۔ بالفاظ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جامعۂ عثمانیہ کے ایک سو سال قبل حیدرآباد میں اردو زبان میں علم سائنس کی تعلیم کا انتظام تھا اور اُس کے بانی نواب شمس الامراء تھے۔

جو معلومات ہم کو دستیاب ہوئی ہیں اُن سے پایا جاتا ہے کہ نواب صاحب نے یورپ سے سائنس کے تجربوں کے لئے آلات بھی طلب فرمائے تھے اور خود ان کا تجربہ کرتے تھے اور مدرسۂ فخریہ کے طلبہ کو بھی یہ تجربے بتائے جاتے تھے۔

اُس مدرسہ میں جو تعلیم ہوتی تھی وہ کس قدر مفید اور سود مند تھی؟ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب حیدرآباد میں سرکار نے ۱۲۶۰ھ میں ڈاکٹری کی تعلیم کے لئے مدرسہ قائم کیا تو اُس میں تعلیم کے لئے مدرسۂ فخریہ کے طلبہ ہی کو انتخاب کیا گیا تھا۔ اور اُن میں سے بعضوں نے ڈاکٹری میں اچھی ناموری حاصل کی تھی۔ مثلاً افضل الحکماء ڈاکٹر محمد فیض اللہ، شمس الحکماء ڈاکٹر محمد اشرف، ڈاکٹر میر باقر علی، ڈاکٹر محمد اکبر وغیرہ۔

نواب شمس الامراء کی سرکار سے مدرسۂ فخریہ اور دیگر مدارس کے طلبہ کو وظائف بھی دئے جاتے تھے، کتابیں مفت مرحمت ہوتی تھیں۔ اساتذہ کو پنشن قرار ما ہوار ملتی تھی۔ عرصہ دراز تک مدرسۂ فخریہ بدستور قائم رہا۔ اس کا تنزل ۱۲۷۹ھ کے بعد شروع ہوا۔ اِس وقت وسطانیہ کی صورت میں شمس آباد میں قائم ہے۔

اُردو نصاب کورس: نواب شمس الامراء کا یہ کارنامہ بھی قابل تحریر ہے کہ آپ نے اپنے مدارس کیلئے ایک نصاب بھی مرتب کیا تھا جو انتخابات میں دستیاب ہوئے ہیں۔ اُن سے پتہ چلتا ہے۔ ادب کے ساتھ اخلاق اور دینیات: ریاضی، طبیعات علم موسیقی وغیرہ کے معلومات نصابی کتابوں میں شریک کئے گئے تھے۔

کتب خانہ: اس امر کا بیان ہو چکا ہے کہ نواب شمس الامراء نہ صرف علم دوست بلکہ خود بھی ذی علم تھے۔ آپ کو مطالعہ سے پوری دلچسپی تھی۔ نہ صرف عربی۔ فارسی کتابیں مطالعہ کرتے بلکہ انگریزی اور فرنچ زبانوں کی کتابوں کا مطالعہ بھی ہوا کرتا تھا۔ اُس زمانہ میں جو کتابیں فلسفہ اور سائنس کی انگلستان اور پیرس میں شائع ہوتیں ان کو طلب کر کے مطالعہ فرماتے تھے۔ آپ نے ایک عمدہ کتب خانہ فراہم کر لیا تھا۔ مطالعہ کی اہمیت اس قدر تصور کی گئی تھی کہ مدرسۂ فخریہ کے لئے بھی ایک علیحدہ کتب خانہ ایک مہتمم کی نگرانی میں فراہم کر دیا گیا تھا۔

آپ کے مطالعہ کے شوق کا پتہ اس سے چل سکتا ہے کہ اُس زمانہ میں جو فارسی اور اردو اخبار جو ہندوستان میں شائع ہوتے تھے اُن کو طلب کر کے مطالعہ فرماتے اور ان کو ضائع نہیں کیا جاتا بلکہ مجلّد کر دیا جاتا۔ چنانچہ آج تک کئی اخبار کے مجلد فائل نواب ظہیر یار جنگ کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں،، ان کی نقل میں نے اپنے ایک مضمون جو رسالہ ہمایوں ماہ مئی ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا ہے کی ہے۔

شمس الامراء کی تصانیف | نواب شمس الامراء صاحب تصنیف تھے ان کی دو کتابوں کا پتہ چلا ہے۔ ایک "شمس الہندسہ" سے موسوم ہے اور دوسری "فن جال" میں لکھی گئی ہے۔ یہ دونوں کتابیں فارسی میں ہیں۔ شمس الہندسہ نہایت ضخیم کتاب ہے۔ اس کو انگریزی کتاب سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ شمس الامراء کے چاروں فرزندوں کو بھی تصنیف و تالیف سے دلچسپی تھی ان میں سے بڑے فرزند نواب رفیع الدین خاں کی تصانیف اردو میں ہیں جن کی حسب ذیل کتابیں دستیاب ہوئی ہیں:۔

(۱) رسالہ علم ہندسہ۔ (۲) اعمال جرثقیل۔ (۳) رفع الحساب۔
(۴) تکملہ رفع الحساب۔ (۵) رسالہ لاگرتم۔ (۶) رفع الصنعت۔
(۷) رفیع البصر۔ (۸) رفع الترکیب۔ (۹) رسالہ شطرنج۔

ان ناموں سے واضح ہو سکتا ہے کہ یہ کتابیں زیادہ تر علم ریاضی سے متعلق ہیں۔ چنانچہ اُن کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب میں کر دی ہے۔

شعراء اور اہل علم کی سرپرستی | اسلامی علمی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ ہمارے بادشاہ رؤساء اور امراء اہل علم کی سرپرستی میں ہمیشہ حصہ لیتے رہے اور اصحاب علم و فن کی دستگیری کو اپنا شعار بنایا تھا۔ شمس الامراء کے متوسل شعراء کے قطع نظر ہمیں آپ کے دربار میں مورخ، فلسفی اور ریاضی دان اصحاب بھی ملتے ہیں۔ جنہوں نے کئی ایک کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ جو آج تک بھی باقی ہیں۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب شمس الامراء کی سرپرستی اردو زبان کے لئے آبحیات سے کم نہیں تھی۔ آپ کی سرپرستی میں تاریخیں لکھی گئی ہیں۔ علم ریاضی اور ہیئت کی کتابیں مرتب ہوئی ہیں۔ کیمیاء اور طبیعات کی کتابیں مدون ہوئیں۔ طب اور حیوانات کی کتابیں عالم وجود میں آئیں۔ بہرحال آپ نے اپنے دارالترجمہ کے علاوہ بھی غیر اصحاب کو معاوضہ دیکر علمی کام لیا ہے۔

تبصرہ | صفحات گزشتہ میں نواب شمس الامراء امیر کبیر کے علمی کارناموں کی صراحت اختصار کے ساتھ بیان کر دی گئی ہے۔ جس سے واضح ہو گا کہ آج سے ایک سو سال پہلے نواب صاحب کے علم و فن

کی کس قدر سرپرستی فرمائی تھی اور آپ کی وجہ سے کس طرح اُردو زبان میں علمی سرمایہ فراہم ہوا۔

مغربی زبانوں سے علم سائنس کی کتابوں کا اُردو ترجمہ کرنا اور پھر ان کی تعلیم کا انتظام کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ جس کو غیر اہم تصور کر کے نظر انداز کر دیا جائے۔ جبکہ اس کام کے ایک سو سال بعد جب اس قسم کا کام آغاز ہونے والا تھا تو ایک بڑی جماعت کو اس کا یقین نہیں آتا تھا کہ اُردو جیسی تہی مایہ زبان میں مغربی علوم سائنس کا خزانہ منتقل ہو سکتا ہے۔ اور منتقل ہو تو اس کی تعلیم اور اُردو میں دی جا سکتی ہے۔ کیا یہ امر قابلِ حیرت نہیں ہے کہ نواب شمس الامراء نے آج سے ایک سو سال پہلے اس کو عملی طور پر ثابت کر دکھایا تھا۔

مدرسوں کے قیام کے ساتھ آپ نے کتب خانہ۔ پریس۔ نصاب وغیرہ کے متعلق جو قابل قدر خدمات انجام دی ہیں وہ بھی ہر آئینہ لائق ستائش ہیں۔

آپ کو ذاتی طور پر علم ریاضی اور سائنس سے پوری دلچسپی تھی۔ اگر سیاسی مصروفیت موقع دیتی تو آپ ایک فلاسفر اور ریاضی داں کی حیثیت سے پیش ہو سکتے تھے۔ آپ فطرتی طور پر انجینیر اور آرکٹکٹ تھے۔ آپ ایک ایسے زمانہ میں تھے جبکہ حکمراں قوم کے مقابل اپنے مشاہیر کی قدر نہیں ہوتی تھی۔ پھر سیاسی فضاء بھی ایسی تھی کہ علمی کام کی جانب پوری توجہ مبذول نہیں کیجا سکتی تھی۔

آج تک آپ کے علمی کارنامے پوشیدہ تھے۔ اربابِ بصیرت کے لئے کوئی مواد نہیں تھا۔ اب یہ توقع بے جا نہیں ہے کہ ہم اپنے جلیل القدر ہستیوں کو اُن کے کارناموں کے مطابق وہ جگہ عطا کریں گے جس کے وہ فی الحقیقت مستحق ہیں۔ فقط

نصیرالدین ہاشمی

شہزادہ جواں بخت جہاندار شاہ

مترجمہ عزیز الرحمٰن صاحب ایم۔ اے (علیگ)

خواجہ منظور حسین صاحب شعبۂ انگریزی مسلم یونیورسٹی کے صدر ہیں۔ لیکن آپ کو اُردو ادب سے بھی گہرا شغف ہے۔ زمانۂ طالب علمی میں اُردو میگزین کے کامیاب مُدیر تھے۔ اُس کے بعد بھی کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ لیکن اِس قدر خاموشی کے ساتھ کہ محترمی پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کو جو علی گڑھ کے ہم سب لکھنے والوں کے "رازداں" ہیں علم ہو تو ہو کسی اور کو نہیں ہے۔ قریب دو سال ہوئے تو یوں ہی "سیر را ہے" معلوم ہوا کہ خواجہ صاحب کسی بہت بڑی تصنیف میں عرصہ سے مصروف ہیں جو شاید اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی کے سیاسی ادب سے متعلق ہے اور اس سلسلہ میں موصوف نے صدہا قلمی و مطبوعہ دواوین کی چھان بین کے علاوہ انگریزی زبان کی بکثرت تاریخوں، سفرناموں اور ڈائریوں وغیرہ سے بھی اخذ مضامین کر کے ان کا اُردو ترجمہ کرایا ہے۔ ایک ذہین و طبّاع نوجوان عزیز الرحمٰن صاحب ایم۔ اے سابق ریسرچ اسکالر شعبۂ تاریخ ترجمہ کی خدمت پر مامور تھے۔

متذکرۂ بالا حال معلوم ہونے پر ایک روز خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضری دی گئی۔ یہ پتہ لگنے میں تو کامیابی نہ ہوئی کہ زیر تصنیف کتاب کا نام کیا ہے۔ کس حد تک تیار ہو گئی ہے اور کب شائع ہو گی۔ البتہ تاریخی مضامین کے اصل و تراجم کا ایک ڈھیر آپ نے ضرور دکھایا۔ اور چونکہ ادب سے زیادہ مجھے تاریخ سے دلچسپی ہے اس لئے میں نے اُن کی اچھی طرح سیر کی۔ جناب خواجہ صاحب کی مہربانی سے ایک ترجمہ 'غدر کے بعد دلّی میں دفینوں کی تلاش' کے عنوان سے 'معنف' میں شائع بھی کیا جو کافی مقبول ہوا۔

خیر! یہ بات تو پُرانی ہو گئی۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں نوّے سال بعد دلّی میں پھر 'غدر' ہوا اور جس طرح پہلے "غدر" میں صدہا علمی ذخائر برباد ہوئے یا منتشر ہوئے۔ اس مرتبہ بھی دلّی اور بعض دوسرے مقامات پر ہزارہا قیمتی چیزیں اپنے اپنے 'مقام' سے ہٹ کر خدا معلوم کہاں کی کہاں پہونچ گئیں۔ خواجہ منظور صاحب کا ذخیرۂ تراجم بھی۔ (اگرچہ بفضلہٖ خواجہ اور اُن کے متعلقین اور اُن کا گھر محفوظ ہے۔) نہ جانے کس طرح یونیورسٹی مارکیٹ کے ایک

پنساری کی دوکان پر پہونچ گیا ـــ غالباً کافی مقدار میں یہ تراجم جب "پڑیا سازی" کی نذر ہوکر برباد ہو چکے تھے تو [illegible] اعلیٰ کی ان پر اتفاقاً نظر پڑی اور وہ باقی ماندہ "ردّی" کو پنساری سے لے آئے ـ متعدد مکمل و غیر مکمل مضامین اس طرح ان کے ہاتھ لگ گئے (اور وہ اب بلاشبہ میری ملکیت ہیں) انہیں مکمل مضامین میں سے ایک مضمون جناب خواجہ صاحب اور عزیز الرحمٰن صاحب کے شکریہ کے ساتھ نذر ناظرین کیا جاتا ہے

مصنف سید الطاف علی بریلوی

ہندوستان کی تاریخ میں مغل سلطنت کے زوال کے زمانہ کا مطالعہ بہت ہی [illegible] ہے ـ یہ ایک ایسی ذلیل کہانی ہے جس میں بے اعتباری ـ غدّاری ـ حرص و طمع ـ لوٹ مار اور قتل و غارتگری کا بول بالا نظر آتا ہے ـ تاہم اس میں بعض حصّے روشن اور تابناک بھی ہیں ـ جن کے پڑھنے میں دلچسپی محسوس ہوتی ہے اور جو اس تکلیف دہ تاریکی [illegible] (جو اس) [illegible] دور پر چھائی ہوئی ہے وقتی طور پر نجات دلا دیتے ہیں ـ بعض اوقات اُس حکومت کی بجھتی ہوئی راکھ میں ایک چنگاری ایک ایسی شریف رُوح بھی مل جاتی ہے جو اپنے زمانہ کی تباہ شدہ حالت پر دُکھی نظر آتی ہے اور جو ماضی کی شاندار حالت کو از سرِ نو زندہ کرنے کے لئے بے چین دکھائی دیتی ہے ـ اگر اُس زمانہ میں کوئی آدمی پیدا ہوا بھی تو زمانہ اُس کے لئے موزوں نہ تھا ـ سلطنت [illegible] ایک بہادرانہ مگر بے نتیجہ کوشش کے بعد یہ شریف اور بہادر رُوح دل شکستہ ہو کر گمنامی [illegible] میں گم ہو گئی ـ

اسی قسم کی ایک مثال اٹھارویں صدی کے آخری نصف حصہ میں شہنشاہ شاہ عالم کے سب سے بڑے فرزند شہزادہ جواں بخت جہاندار شاہ کی شخصیت کی صورت میں ملتی ہے ـ اُن کی ابتدائی زندگی کے حالات بہت کم معلوم ہیں ـ مگر یہ قطعی یقینی ہے کہ سلطنت دہلی کے ولیعہد کی نہایت اعلیٰ تعلیم و تربیت ہوئی تھی ـ جو واقعات کتابوں میں درج ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ شہزادہ بہت سی قابلیتوں اور صلاحیتوں کے مالک تھے ـ

فرینکلن مصنف "تاریخ شاہ عالم" کی روایت کی بنا پر شہزادہ موصوف کی ولادت ۱۷۴۰ء کے لگ بھگ ہوئی ـ اکیس سال کے بعد ۱۷۶۱ء میں وہ پہلی مرتبہ پبلک زندگی کے سامنے آئے ـ پانی پت کی تیسری لڑائی ٹھیک اسی زمانہ میں ہوئی تھی ـ فتحمند احمد شاہ ابدالی مع اپنی فوجوں کے دہلی آیا ـ دہلی کا تخت اُس وقت خالی تھا کیونکہ شہنشاہ عالمگیر ثانی اپنے وزیر کے اشارے سے قتل کئے جا چکے تھے ـ انتقام کے خوف سے دغاباز وزیر پایۂ تخت سے فرار ہو چکا تھا تخت کے جائز وارث

شاہ عالم بہار میں پناہ گزیں تھے۔ ایسی حالت میں ابدالی اگر چاہتا تو اپنے آپ کو ہندوستان کا بادشاہ بنا لیتا اور اس کا اعلان کر دیتا۔ مگر اس کی فوج کابل جانے کے لئے بے تاب تھی اور اس سے اصرار کر رہی تھی کہ وہ اپنے ملک واپس لوٹے۔ لہٰذا احمد شاہ ابدالی نے شاہ عالم کو دہلی واپس آنے کی دعوت دی اور اُن سے اُن کے موروثی تخت پر قبضہ کرنے کے لئے کہا۔ اس درمیان میں اس نے شہزادہ جواں بخت جہاندار شاہ کو سلطنت کا عارضی حکمراں اور شاہ عالم کا نائب مقرر کر دیا۔

نجیب الدولہ ایک افغان کو امیر الامراء بنایا گیا اور امورِ سلطنت کا انتظام اس کے حوالہ کیا گیا۔[1] بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس نوجوان شاہزادے نے جسے ایسے نازک موقع پر ایک اتنے اہم عہدے کے فرائض انجام دینے پڑے۔ اپنی قابلیت اور صلاحیت کا ثبوت عمدہ طور پر دیا۔ انھوں نے وزیر سے نہایت عمدہ تعلقات رکھے اور اپنے آپ کو امراء دربار کا پسندیدہ بنایا۔ دس سال تک وہ اس عہدے کے فرائض انجام دیتے رہے اور اُنھوں نے عام و خاص ہر شخص کا اعتبار اور تعظیم و تکریم حاصل کر لی جب اُن کے والد دہلی واپس آئے تو شہزادے نے پبلک زندگی سے علیحدگی اختیار کر لی اور پرائیویٹ زندگی بسر کرنے لگے۔ ان کو کفالت کی غرض سے ایک مستقل جاگیر مل گئی اور اُنھوں نے ایک خاموش گھریلو زندگی بسر کرنی شروع کی۔ یہ خاندانی فرائض انجام دینے لگے اور گھریلو مسرتوں سے لطف اندوز ہونے لگے۔

دہلی واپس آنے کے بعد شاہ عالم نے ایک بہت قابل شخص کو اپنا وزیر بنایا۔ یہ نجف خاں تھے یہ کئی سال تک نہایت وفاداری کے ساتھ اپنے آقا کی خدمت کرتے رہے۔ جب ۱۷۸۲ء میں نجف خاں کی وفات ہوئی تو متعدد حریف و رقیب امراء نے کوشش کی کہ وہ اس اعلیٰ عہدے پر فائز ہوں افراسیاب خاں جو وزیرِ متوفی کے پروردہ تھے، شاہی انعامات اور مہربانی سے سرفراز ہوئے۔ چند ہی دنوں میں مرزا محمد شفیع اپنے تحکمانہ لب و لہجہ اور سخت برتاؤ کی وجہ سے بہت بدنام اور نامقبول ہو گئے۔ اُنھوں نے امراء کے اثر و اقتدار کو کم کرنے کے لئے ان کی جاگیریں ضبط کرنی چاہیں اور اس طرح اپنے خلاف عام شکایت اور ناپسندیدگی کے جذبات پیدا کر دیے۔

ان حالات میں شاہزادہ جواں بخت نے محسوس کیا کہ انھیں اس وقت مداخلت کرنی چاہئے۔ وہ یہ گوارا نہ کر سکتے تھے کہ وہ خاموش اور بے کار بیٹھے رہیں اور امراء کے باہمی نزاعوں اور مخالفتوں

---

[1] بحوالہ مآثر الامراء۔ باب نجیب الدولہ و عماد الملک حاشیہ۔

کی وجہ سے شاہی اختیار اور اقتدار روز بروز زائل ہوتا چلا جائے۔ اُنھوں نے خاموشی کے ساتھ غیر مطمئن اور شاکی امراء کی سیادت و سربراہی قبول کرلی اور جب اُن کی تجویزیں پوری طرح مکمل ہوگئیں تو اُنھوں نے ہر امر کی اطلاع شاہنشاہ کو کردی۔ بادشاہ سلامت کو یہ مشورہ دیا گیا کہ وہ مرزا شفیع کو برخاست کردیں۔ سازشیوں نے بادشاہ سلامت کو یہ یقین دلایا کہ وہ اپنی متحدہ قوت سے مرزا مذکور کو کسی قسم کی مدافعت اور مقابلہ کے قابل نہ رہنے دیں گے۔ کمزور جسم اور کمزور دل و دماغ کے شاہنشاہ نے اسے مان لیا۔ مرزا شفیع کو کسی طرح اس سازش کی سن گن مل گئی اور قبل ازیں کہ اُن پر حملہ ہو اور وہ زد میں آئے وہ نکل بھاگا۔

اب بادشاہ سلامت نے انتہائی مسرت کے ساتھ شاہزادہ موصوف کو اُمورِ شاہی کے انصرام و اہتمام کا تنہا ذمہ دار بنایا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب محل کے متواتر اور پے بہ پے انقلابات کا خاتمہ ہوجائے گا۔ مگر ادھر دونوں رقیب حریف (یعنی) مرزا شفیع اور افراسیاب خاں نے اپنے اختلافات دُور کرلئے۔ غرض یہ تھی کہ وہ دونوں مل کر نئے انتظامات کا مقابلہ کریں اور اسے شکست دیں۔ ان دونوں نے اپنے مفاد میں اشتراک پیدا کیا اور شاہزادہ کی مخالفت پر متحد ہو گئے اور بادشاہ سلامت کے پاس آخری مطالبہ بھیجا اور اُس نے یہ مطالبہ کیا کہ مرزا شفیع کو فوراً دوبارہ وزیر اعظم کے عہدے پر مقرر کیا جائے۔

شاہزادہ موصوف نے انتہائی جوش کے ساتھ بادشاہ سلامت کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے ارادے پر استواری کے ساتھ قایم رہیں۔ مگر بادشاہ سلامت تو اتحادیوں کی قوت سے خوف زدہ ہو کر حواس باختہ ہو رہے تھے۔ اُنھوں نے یہ طے کیا کہ نافرمان امراء کی دلجوئی کی جائے اور اُنھیں خوش کیا جائے۔ اُن امراء نے شاہزادہ کے بعض ہمراہیوں کو قتل کردیا اور بعض کو گرفتار کرلیا۔ مرزا شفیع اپنے سابقہ عہدے پر بحال کئے گئے اور افراسیاب خاں ان کے نائب بنائے گئے۔ شاہزادہ موصوف کو پس پشت ڈال دیا گیا اور افراسیاب خاں نے ان کے ساتھ ذلیل برتاؤ کیا۔

کچھ ہی دنوں کے بعد مرزا شفیع۔ افراسیاب خاں کی منظوری اور اشارے سے قتل کئے گئے۔ اور اب شاہی دربار میں افراسیاب خاں بیحد طاقتور ہو گئے۔ افراسیاب خاں میں مدبرانہ صلاحیتیں بالکل نہ تھیں۔ یہ بیحد خود غرض آدمی تھے اور دُور اندیشی تو ان میں ذرا بھی نہ تھی۔ بیدست و پا شاہنشاہ اُن کی سیادت اور ریاست سے بیحد نالاں اور خشمگیں تھے۔ شاہزادہ موصوف اور شاہی خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ افراسیاب کا جو ذلیل اور رُسواکن برتاؤ تھا اُسے شاہزادے بے حد

ناپسند کرتے تھے۔ اُن لوگوں کی نگاہیں ہر طرف پڑ رہی تھیں اور ایک ایسے مخلص دوست کی تلاش میں تھیں جو انھیں اس ناقابل برداشت حالت سے نجات دلا سکے۔

اُسی زمانہ میں دارالخلافہ میں یہ خبر پہونچی کہ مسٹر وارن ہسٹنگز۔ نواب وزیر سلطنت آصف الدولہ سے ملاقات کی غرض سے لکھنؤ آئے ہوئے ہیں۔ ابتک انگریزوں نے شاہنشاہ کے ساتھ ذی عزت اور پُر احترام برتاؤ کیا تھا۔ لہٰذا شاہنشاہ کو پوری توقع تھی کہ مسٹر ہسٹنگز اُنھیں افراسیاب خاں کی غلامی سے ضرور ہی نجات دلا دیں گے۔

مگر جن حالات میں وہ گھرے ہوئے تھے ان میں وہ اس کا خیال بھی دل میں نہ لا سکتے تھے کہ گورنر جنرل کو اپنی خواہشات سے اطلاع دیں۔ شہزادہ موصوف کو معلوم تھا کہ ان کے ذی مرتبہ والد کے ذہن و دماغ میں کیا خیالات آرہے تھے۔ فرزندانہ محبت سے مجبور ہو کر اُنھوں نے یہ طے کر لیا کہ اگر اپنے والد کی وہ اس طرح خدمت کر سکیں اور اس کی ضرورت ہو تو وہ اپنی جان بھی ان کے لئے قربان کر دیں گے۔

انھوں نے ایک بہادرانہ اور خطرناک تجویز پر عمل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اُس دن کے کوئی پچیس سال پہلے ان کے والد کو بھی ایسی ہی صورت پیش آئی تھی۔ شاہنشاہ عالمگیر ثانی شہزادہ کے دادا کو بدطینت وزیر عمادالدین نے اپنی تکلیف دہ اسیری میں گرفتار کر رکھا تھا۔ شاہ عالم اُس وقت نوجوان تھے اور اُن کے ذہن میں بلند خیالات تھے۔ وزیر اُن کی پوری طرح نگرانی اور نگہبانی کرتا تھا۔ مگر شاہ عالم نے نگہبانوں کو قتل کر کے راہِ فرار اختیار کی اور قلعہ کی دیوار کے ایک شکستہ حصّہ سے گھوڑا دَوڑا کر نکل گئے۔ جب سنتریوں کو اس واقعہ کا علم ہوا تو انھوں نے قلعہ کی چھت سے اُن پر گولیوں کی بوچھار کر دی مگر اُنھوں نے اپنے گھوڑے کو دریائے جمنا میں کودا دیا اور یہ وفادار جانور ان کو دریا کے پار لے گیا اور بخیریت و عافیت دریا پار اُتار دیا۔

شہزادہ نے طے کیا کہ وہ اپنے والد کی مثال کی پیروی کریں گے۔ ۱۴ اپریل ۱۷۸۴ء کی ایک طوفانی رات کو بھیس بدل کر وہ اپنی اقامت گاہ واقع قلعۂ معلّیٰ سے روانہ ہوئے۔ وہ قلعہ کی عمارت کی چھت پر چڑھ گئے اور ایک چھت سے دوسری چھت پر ہوتے ہوئے اُس مقام پر پہونچے جہاں دریا کے کنارے اِن کے احباب اِن کا انتظار کر رہے تھے۔ زاں بعد وہ ایک رسّی کے ذریعہ سے قلعہ سے نیچے زمین پر اُترے اور اس طرح سنتریوں کی نگاہ بچا کر دریا کے پار اُتر گئے۔[۵]

---

[۵] بحوالہ ایچ۔ جی۔ کین۔ مغلیہ سلطنت کا زوال۔

وہ سیدھے لکھنؤ روانہ ہوئے۔ ان کو توقعات تھیں کہ نواب آصف الدولہ اور مسٹر وارن ہیسٹنگز ان سے عملی ہمدردی کا مظاہرہ کریں گے اور ان کے ساتھ اشتراک عمل کریں گے۔ اُنھوں نے طے کیا کہ ان لوگوں کی مدد سے وہ بادشاہ سلامت کو ان کے بے ایمان وزرا سے نجات دلا سکیں گے۔ اور اُن کی زوال پذیر قوت کو کسی اُستوار بنیاد پر قائم کر سکیں گے۔ جیسے ہی ان کے فرار کا علم ہوا۔ شاہنشاہ۔ بلکہ دراصل افراسیاب خاں نے بادشاہ کی طرف سے انگریزی گورنر جنرل اور نواب آصف الدولہ کو خطوط لکھے کہ وہ شہزادہ کو بلا کسی تاخیر کے واپس بھیج دیں۔

یہ معلوم کر کے مسٹر ہیسٹنگز کو قدرتی طور پر شاہزادے کا استقبال کرنے میں تامل ہوا۔ مگر جب اُنھوں نے اِس امر پر غور کیا کہ اگر شہزادہ کہیں اور چلا گیا تو بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی تو اُنھوں نے یہ طے کیا کہ شاہزادہ کے شایانِ شان استقبال کیا جائے۔ جب شاہزادہ موصوف شہر لکھنؤ کے قریب پہونچے تو مسٹر ہیسٹنگز اور نواب آصف الدولہ شہر کے باہر تین میل شہزادہ کے استقبال کیلئے گئے۔

تیموری خاندان کے اِس نوجوان شاہزادے کی شریف صورت اور مہذب اوضاع و اطوار دیکھ کر ہیسٹنگز پر بڑا اثر پڑا۔ جب اُنھوں نے شاہزادے کو معمولی لباس میں دیکھا تو اُن کا دل دُکھ گیا۔ لہٰذا اُنھوں نے طے کر لیا کہ وہ شاہزادے کی ہر طرح طرفداری کریں گے۔ اُنھوں نے ممبرانِ کلکتہ کونسل کے پاس جو رپورٹ ارسال کی اُس میں لکھا:-

"ممبرانِ کلکتہ کونسل نے شاہزادے کے لئے وہی نرمی اور عطوفت محسوس کی ہوتی یا یوں کہئے اگر ایسے نرمی کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان کے لئے وہی نرمی اور رحم محسوس کرتے جو کہ میں نے اُس وقت محسوس کی تھی جب میں اُن سے پہلی مرتبہ ملا تھا۔ وہاں اُس وقت تو ہان کے میدان میں شاہزادہ بلا کسی شان و شوکت کے تھے۔ ان کے جلو میں کوئی نہ تھا۔ اِن کے پاس سر چھپانے کے لئے بمشکل ایک خیمہ تھا۔ اور اگر کوئی ساز و سامان ان کے پاس تھا بھی تو یہ وہی تھا جو اُس زمانہ میں لوگوں نے ازراہ مہمان نوازی اُن کے لئے مہیا کر دیا تھا۔

اُس وقت شاہزادے کی دماغی حالت میں انتشار تھا۔ اُن کے دماغ میں ایک طرف تو وہ غرور اور نخوت تھی جو اُن کے مرتبہ و عہدہ کے آدمی کے لئے فطری ہے اور دوسری طرف یہ احساس بڑی شدت کے ساتھ موجود تھا کہ اِس وقت ان کی حالت بالکل ناگفتہ بہ ہے اور وہ دوسروں کے رحم و کرم پر ہیں۔

اگر اس کے بعد ان کے طرزِ عمل میں تبدیلی پیدا ہوئی ہوتی اور اُنھوں نے وہ کردار اختیار کر لیا ہوتا جو اُنکے حسب و نسب کے منافی ہوتا۔ اگر آیندہ اُن کی گفتگو اور طرزِ عمل سے جھوٹی شیخی ٹپکتی۔ ان میں سخت مزاجی پائی جاتی۔ اِن میں سفلہ پن دکھلائی دیتا۔ یا بدتمیزی جھلکتی اور اُن میں جو ایسا ل پیدا ہو جاتیں جو ایسے آدمیوں میں

عموماً پیدا ہو جاتی ہیں جو کسی بڑے خاندان میں پیدا ہوتے ہیں اور جنہیں زندگی کی عام دشواریوں کا علم نہیں ہوتا۔ اور جنہیں سیاسی مصلحتوں اور ضرورتوں کی بنا پر سستی سہل انگاری اور آرام کا عادی بنا دیا جاتا ہے۔ اور اسی ماحول میں اِن کی تربیت اور پرورش کی جاتی ہے تو میں نے صرف اس پر اکتفا کی ہوتی کہ ظاہری آداب و رسوم ادا کر دیا اور صرف اپنے طرز عمل کی شستگی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ظاہری آداب و رسوم کے علاوہ ان کے لئے کوئی بہت زیادہ اچھا خیال نہ قائم کروں۔

آئندہ ۱۰ ماہ میں میں اُن سے تقریباً روزانہ ملتا رہا اور میں نے اِن کو ہمیشہ نرم دل اور شریف و نفیس مزاج۔ عزتِ نفس سے بھرپور اور صحیح الرائے اور غیر معمولی طور پر دُور بین اور بے حد ترقی یافتہ ذہانت کا مالک پایا۔ میں نے دیکھا کہ وہ راضی برضا اور ایک ایسے معتدل عمدہ مزاج کے مالک ہیں جو میں نے جہاں تک میرا علم اور حافظہ کام دیتا ہے کسی دوسرے آدمی میں نہیں پایا۔"

موہان سے شہزادے لکھنؤ لائے گئے۔ یہاں اِن کا شاہانہ تزک و احتشام سے استقبال کیا گیا۔ ان کی کفالت کے لئے مسٹر ہسٹنگز نے نواب سے اصرار کر کے ۴ لاکھ روپیہ سالانہ مقرر کرا دیا۔ شہزادے نے اپنے میزبانوں کو اطلاع دی کہ ان کی آمد کی غرض یہ تھی کہ بادشاہ سلامت کی خدمت کے ذرائع پیدا کئے جائیں۔ اِنہوں نے اُن لوگوں سے فوجی اعانت طلب کی۔

نواب وزیر اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لئے تمام تر انگریزوں کی فوج پر بھروسہ رکھتے تھے۔ اور گورنر جنرل کو بذاتِ خود اس قسم کے کسی معاملہ میں قدم رکھنے کا اختیار نہ تھا۔ لہٰذا اُنہوں نے اپنے ہمراہیوں سے جو کلکتہ میں تھے اس کے متعلق رائے لی۔ اِن لوگوں نے متفقہ طور پر دہلی کی سیاست میں دخل دینے سے انکار کر دیا۔

لہٰذا مسٹر ہسٹنگز نے طے کیا کہ وہ شہزادے کی واپسی دہلی کے لئے اپنے اثر اور رسوخ سے کام لیں گے۔ شہزادے نے اس تجویز کو منظور کر لیا۔ مگر ان کی خواہش تھی کہ ان کے ہمراہ اتنی فوج کر دی جائے جو ان کی حفاظت کے لئے کافی ہو۔ اور یہ بھی چاہا کہ اُن کو اس مرتبہ بھی اتنی ہی جاگیر دی جائے جتنی سابق وزیر نواب نجف خاں کے زمانہ میں ملی ہوئی تھی۔ اُنھوں نے یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ اُن کو سکھوں کی سرکوبی کی اجازت دی جائے۔ اُس زمانہ میں سکھ شاہی علاقوں پر شدت سے حملہ آور ہو رہے تھے اور شاہی علاقوں میں تصرف کر رہے تھے۔ یہ نہایت مناسب و شریفانہ شرائط تھیں اور ان کی بنا پر مسٹر ہسٹنگز نے بادشاہ سلامت سے گفتگوئے مصالحت شروع کی۔

مسٹر ہسٹنگز کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ افراسیاب خاں نے اِسے منظور کر لیا کہ شاہزادہ

انگریزی افواج کی ۴ کمپنیوں کے ہمراہ دہلی واپس جائیں۔ انھوں نے یہ بھی وعدہ کیا کہ رہتک اور سنگانہ شہزادہ کی جاگیر مقرر کر دئے جائیں گے۔ اِس کے صلہ میں شاہزادہ کے لئے یہ لازمی ہو گا کہ وہ وزیر موصوف کی حمایت کریں اور ان کے مشورے کے مطابق ہر کام کریں۔

اِس مضمون کا ایک عہدنامہ باقاعدہ تحریر کیا گیا اور شہزادہ دہلی کے ارادہ سے فرخ آباد روانہ ہوئے۔ ٹھیک اِسی موقعہ پر مسٹر ہسٹنگز کو اچانک کلکتہ جانا پڑا۔ کیونکہ اُسی زمانہ میں مسٹر ڈالیلر کی موت ہو گئی۔ یہ بنگال پریسیڈنسی کے انتظامات کے ہسٹنگز کے بجائے انچارج تھے۔

اِس کے چند ہی دنوں کے بعد افراسیاب خاں قتل کر دئے گئے۔ اس واقعہ سے اور اس کے بعد دربار میں جو بدنظمی پھیلی اُس سے شاہزادہ کے دل میں از سر نو حوصلے پیدا ہوئے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ وہ موقعہ آگیا ہے جو زندگی میں کبھی کبھی آیا کرتا ہے۔ بادشاہ سلامت کی خواہش تھی کہ شاہزادہ موصوف فوراً دہلی واپس ہوں اور کاروبارِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ میجر براؤن برطانوی سفیر دارالخلافہ نے بھی یہی اقدام کرنے کی رائے دی۔ لہٰذا شاہزادہ موصوف نے گورنر جنرل سے استدعا کی کہ وہ افواج سے اِن کی مدد کریں۔ کیونکہ بلا فوج کے وہ حالات پر قابو نہ پاسکیں گے۔ مگر وہ اس قسم کے کسی معاملہ میں ہاتھ ڈالنے کے لئے تیار نہ تھے۔ انگریزوں نے ان کا ذکر مہاراجہ سندھیا سے کیا۔ سندھیا نے اس کا وعدہ کیا کہ وہ شاہزادہ کی واپسی دہلی میں ہر ممکن مدد کریں گے۔

مگر اُس زمانہ میں حالات اور واقعات کی رفتار بہت تیز تھی اور اطمینان کے ساتھ گفت و شنید کرنیکا ہرگز موقعہ نہ تھا۔ افراسیاب خاں کی موت کے فوراً ہی بعد سندھیا ان کے جانشین ہوئے اور فوج کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ انھوں نے بادشاہ سلامت سے ملاقات کی اور بادشاہ نے اُن پر نوازشات کی بارش کی۔

اب سندھیا نے شاہزادہ کو دہلی بلایا اور اُنھیں یقین دلایا کہ اُنھیں اپنے ہمراہ فوج لانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ شاہزادہ موصوف سندھیا پر اعتماد اور بھروسہ کرنے کے لئے آمادہ نہ تھے۔ میجر پامر سفیر لکھنؤ نے اور اُن کے مشورہ کی بنا پر نواب وزیر نے بھی شہزادہ کو دہلی جانے کے خلاف مشورہ دیا۔ کیونکہ باہم یہ طے ہوا تھا کہ سندھیا کو اس کا موقع کہ وہ بادشاہ سلامت اور شاہزادہ موصوف ولیعہد سلطنت دونوں کو اپنے قابو میں لا سکے۔ بنا بریں اِس وقت یہ مسئلہ ملتوی کر دیا گیا اور شہزادہ موصوف لکھنؤ میں مقیم رہے۔

کچھ ہی دنوں کے بعد نواب وزیر اور شاہزادے میں باہم بے لطفی پیدا ہو گئی۔ بظاہر ایسا معلوم

ہوتا لگتا ہے کہ نواب نے یہ سوچنا شروع کیا کہ شہزادہ موصوف کے اخراجات اِن کے خزانہ پر غیر ضروری بار ہو کر رہ گئے ہیں اور بنا بریں ان کا سلوک ان کی طرف اچھا نہ رہا۔ شاہزادہ کو یہ حالت خود ہی ناپسند تھی کہ وہ کسی دوسرے کے محتاج رہیں اور مرہونِ منت و احسان بنیں اور انھیں یہ دیکھ کر بہت ہی دکھ ہوتا ہے کہ بجائے اِس کے کہ وہ دوسروں پر احسان اور نوازش کریں خود اُن پر دوسرے لوگ احسان کریں۔ لہٰذا نواب کے بدلے ہوئے رویہ کو شہزادہ نے بے حد محسوس کیا۔

۱۷۸۶ء میں جبکہ نواب فیض آباد گئے ہوئے تھے تو شہزادہ موصوف اچانک اور بلا اطلاع لکھنؤ سے روانہ ہو گئے اور بنارس چلے گئے اور مادھو داس کے باغیچہ میں فروکش ہو گئے۔ نواب کو اس سے بڑی شکایت پیدا ہوئی اور بڑی مشکلوں کے بعد انھیں اس پر آمادہ کیا جا سکا کہ وہ شہزادہ کا وظیفہ جاری رکھیں اور اسے بنارس میں ادا کر دیا کریں۔

اگست ۱۷۸۷ء میں شاہزادے کو اطلاع ملی کہ سندھیا دارالخلافہ دہلی سے روانہ ہو گئے ہیں اور یہ کہ جے پور اور جودھپور کے راجپوت راجگان کے ہاتھ سے ان کی فوجی قوت کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ اور یہ کہ اس موقع سے فائدہ اُٹھانے کی غرض سے غلام قادر روہیلہ دارالخلافہ پر فوجکشی کی دھمکی دے رہا ہے۔ اس موقع پر شاہزادہ نے طے کیا کہ وہ اپنے والد اور بادشاہ سلامت کی خدمت اور اُن سے متعلقہ فریضہ کی بجاآوری کے لئے ایک آخری کوشش کریں اور شاہی دربار کو ابن الوقتوں سے پاک صاف کر دیں۔

لہٰذا انھوں نے بادشاہِ سلطنت کے پاس ایک مکتوب ارسال کیا اور اپنی خدمات ان کی مرضی پر موقوف کر دیں۔ سن رسیدہ شاہنشاہ نے نہایت پُرجوش طریقہ سے اپنے فرزند شاہزادہ موصوف سے خواہش کی کہ وہ ان کی مدد کریں۔ بادشاہ سلامت نے نواب وزیر اور گورنر جنرل کو بھی تحریر کیا کہ اس اہم ضرورت کے وقت وہ لوگ ان کی مدد کریں۔ دربار میں آئے دن جو انقلاب ہوتے رہتے تھے بادشاہ سلامت اُن سے تنگ آ گئے تھے۔ دربار میں کوئی ایسا آدمی نہ تھا جس پر بادشاہ سلامت نے اعتبار اور اعتماد کیا ہو اور اُس نے انھیں دھوکہ نہ دیا ہو۔

اِس مرتبہ اُنھوں نے اپنے معتمد علیہ داروغہ محلات منظور علی پر اعتبار و اعتماد کیا اور اس نے ان کو دھوکہ دیا۔ اِس نے غلام قادر روہیلہ کو بلایا تھا کہ وہ قلعہ پر گولہ باری کر کے بادشاہ سلامت اور شاہی خاندان کو خوف زدہ کر دے۔ حالات سے مجبور ہو کر بادشاہ سلامت نے غلام قادر کو دربار میں بلوایا اور اسے خلعت عنایت کی اور اسے اُن عہدوں پر فائز کیا جن پر پہلے سندھیا فائز تھا۔ بادشاہ سلامت نے

شاہزادہ موصوف ۔ نواب وزیراور گورنر جنرل سے مدد کی جو پُرجوش درخواست کی ہے اُس میں اُنھوں نے لکھا ہے کہ کس طرح وہ مجبور ہو گئے کہ روہیلہ سردار غلام قادر کو خوش کریں اور کس طرح اس بدتمیز سردار نے اعلان کیا تھا کہ اگر اُس کی خواہشات منظور نہ کی گئیں اور اُس کے مطالبات مانے نہ گئے تو وہ کسی دوسرے شخص کو تخت پر بٹھا دیگا اور اُسے سلام کیا کریگا۔

نوجوان شاہزادے کو جب اس تذلیل اور توہین کا علم ہوا جو اِس کے خاندان کو برداشت کرنی پڑیں تو اِس کا خون کھولنے لگا۔ ایک بار پھر اُنھوں نے انگریزوں اور نواب وزیر سے استدعا کی کہ وہ بادشاہ سلامت کے معاملہ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیں اور فوجی طاقت سے شہزادہ کی مدد کریں۔

اس موقع پر لارڈ کارنوالس گورنر جنرل لکھنؤ میں تھے ۔ شہزادہ موصوف بعجلت تمام اُن سے ملاقات کرنے لکھنؤ آئے۔ ان کی درخواست کی بنا پر لارڈ موصوف نے شہزادہ اور نواب وزیر میں جو غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی اُسے دُور کرا دیا۔ رہ گیا فوجی امداد کا مسئلہ تو اس کے متعلق لارڈ کارنوالس نے شاہزادہ موصوف سے صاف صاف انکار کر دیا اور مستقل طور سے اس پر قائم رہے۔ کیونکہ اِس قسم کا کوئی اقدام بھی انگریزی حکومت کی اس مجوزہ حکمت عملی کے خلاف پڑتا تھا جو اُنھوں نے بہت غور و خوض کے بعد قائم کی تھی اور جس کا ماحصل یہ تھا کہ انگریزی حکومت ہندوستانی رؤسا کے معاملات میں مداخلت نہ کریگی۔

ہاں شہزادہ اگر چاہیں تو یہ خطرہ اپنے سر مول لے سکتے ہیں اِنھیں اِس کی پوری پوری آزادی ہوگی۔ اگر وہ اپنی اس خطرناک تجویز میں کامیاب ہوئے تو اس سے ان کے دوستوں کو مسرت حاصل ہوگی اور اطمینان نصیب ہوگا۔ اگر وہ ناکام رہے تو اُنھیں یقین دلایا گیا کہ انگریزی علاقے میں ان کو ہمیشہ ایک محفوظ اور ذی عزت جائے پناہ مل جائے گی۔ اِس موقع پر شہزادہ نے پانچ ماہ کا وظیفہ پیشگی لینا چاہا۔ یہ وظیفہ وہی تھا جو نواب وزیر نے اُن کے لئے مقرر کیا تھا۔ لارڈ موصوف نے وعدہ کیا کہ نواب وزیر پر ان کا جو اثر اور رسوخ ہے وہ اُس سے کام لے کر کوشش کریں گے کہ شاہزادہ کو مطلوبہ رقم مل جائے۔ مگر شاہزادہ کو صرف ایک لاکھ روپیہ مل سکا۔

اس درجہ معمولی ذرائع اور سامان کے ہمراہ شاہزادہ دہلی کے ارادے سے روانہ ہوئے اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ وہاں بلا کسی مزاحمت اور مخالفت کے پہنچ گئے۔ بادشاہ سلامت کو شہزادہ سے مل کر بے حد مسرت ہوئی اور اُنھوں نے شاہی اُمور کا اہتمام اور انصرام بالکلیہ شہزادہ موصوف کے حوالے کر دیا۔ یہ جدید انتظام بڑی اُمیدوں اور بڑے جوش اور اہتمام کے ساتھ شروع ہوا۔

شاہزادہ نے ایک جرأت آمیز اور پُرقوت حکمت عملی اختیار کرنی چاہی جس کا اہم ترین مقصد

دوستوں کو یکجا کرنا اور دشمنوں کو منتشر کرنا تھا۔ لوگوں کو توقع تھی کہ اب امن و امان اور خوشحالی کا دور شروع ہوگا۔ کیونکہ اُس وقت حکومت ملک کے قدرتی مالکوں کے ہاتھ میں تھی۔ مگر اس سے خودغرض لوگوں میں بے چینی پھیلی۔ لوگوں نے شاہزادہ کے خلاف بادشاہ سلامت کے کان بھرنے شروع کئے۔ بادشاہ سلامت سے یہ کہا گیا کہ شاہزادہ موصوف اپنے دعوائے خلوص اور وفاداری میں صادق نہیں اور یہ کہ وہ اس وقت محض اس اُمید میں وقت گزاری کر رہے ہیں کہ موقع ملتے ہی خزانہ پر قبضہ کرلیں اور فوج کے سالار بنجائیں۔ بالفاظ دیگر بادشاہ سلامت سے یہ کہا گیا کہ شہزادہ یہ سازش کر رہے ہیں کہ وہ بادشاہ سلامت کو معزول کرکے خود اپنی شاہنشاہی کا اعلان کردیں۔

متواتر اور پے در پے صعوبتوں اور تکلیفوں سے شاہ عالم کے اعصاب کمزور ہو گئے تھے انھوں نے ان بے بنیاد الزاموں کو کان لگا کر سُنا۔ وہ شہزادے سے رشک کرنے لگے اور وہ شاہزادے کی وفادارانہ خدمات کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ یہ شک وشبہ اُن کی شان کے خلاف تھا۔ اس موقع پر شاہزادہ نے بادشاہ سلامت سے استدعا کی کہ وہ شاہی افواج کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لیں اور دوآبہ گنگا جمنا میں شاہی اقتدار اور اختیار مکمل طورسے قائم کریں تو بادشاہ سلامت نے اس تجویز پر عمل کرنے سے انکار کردیا۔

جلد ہی شاہزادے کے سامنے اس امر کے اور ثبوت بھی آئے کہ منظور علی اور اُس کے ہمرائیوں کی سازشیں شاہزادہ کے خلاف کامیاب ہو رہی ہیں اور ان کی فرزندانہ خدمات اور اطاعت شعاری کو بدگیشی کا رنگ دینے میں یہ لوگ کامیاب ہو رہے ہیں۔ ان حالات سے شاہزادہ موصوف کا جوش ختم ہوگیا اور اُن کا دل ٹوٹ گیا۔ اُنھوں نے بادشاہ سلامت سے ایک جاگیر عنایت کئے جانے کی درخواست کی تاکہ بروقت ضرورت وہ وہاں پناہ گزیں ہوسکیں۔ صوبہ آگرہ اُنھیں بطور جاگیر دیدیا گیا اور اُنھوں نے اپنے خاندان کو ہمراہ لے کر دہلی سے کوچ کیا اور پھر کبھی وہاں واپس نہ آسکے۔

آگرہ میں اُنھوں نے اس کی ایک ناکام کوشش کی کہ وہ صوبۂ مذکورہ پر قبضہ کرلیں۔ مگر روپیہ اور آدمیوں کی کمی کی وجہ سے اُن کی تدبیر بارآور نہ ہوسکی اُنھوں نے لارڈ کارنواس کو ایک مکتوب لکھ کر اُن سے بار دگر فوجی امداد کی درخواست کی ان کے الفاظ یہ تھے:۔

"موجودہ حالت میں میرے برادر عزیز تمہاری طرف سے روپیہ اور آدمیوں کی مدد کی ویسی ہی ضرورت ہے جیسے اب سے پہلے میرے خیمہ کی حفاظت کے لئے ان اطراف میں ایک بٹیلین مقرر کردی گئی تھی۔ لہٰذا اس وقت آپ میری کچھ فوجوں اور روپیہ سے مدد کیجئے تاکہ یہ نوبیں میری ذاتی حفاظت کرسکیں۔ اگر آپ نے اس قدر امداد دی تو

خدا کی مہربانی سے تمام علاقہ ہم لوگوں کے قبضہ میں آجائے گا۔"

اُنھوں نے اپنے مکتوب میں مزید اس امر کی تشریح کی کہ:۔

"اب سے پہلے انگریزی حکومت ان کی اس لئے مدد نہ کرسکی تھی کہ سندھیا سے ان کے تعلقات تھے اور سندھیا اُس وقت دہلی کے معاملات میں عملی دلچسپی لے رہے تھے۔ اب اس وقت انگریزی حکومت کی راہ میں اس قسم کی کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہے۔ کیونکہ اسمٰعیل بیگ ایک سربرآوردہ مغل سردار کے ہاتھ سے شکست کھا کر سندھیا گوالیر واپس چلا گیا ہے۔ اس وقت میدان صاف ہے اور ذرا سی کوشش سے اس وقت بہت بڑی کامیابی حاصل کیجا سکتی ہے۔"

جو مدد اس اصرار کے ساتھ مانگی گئی تھی وہ مہیّا نہ کی گئی اور شہزادہ صرف اپنے ذرائع کو استعمال کرنے کے لئے چھوڑ دئے گئے۔ اب شہزادہ نے اسمٰعیل بیگ سے مدد مانگی۔ مگر اس نے کسی قسم کی مدد دینے سے انکار کر دیا اور دغاباز غلام قادر روہیلہ نے شاہزادہ کو گرفتار کرنے کی سازش کی۔

ہر طرف سے مایوس ہو کر اور اپنے آپ کو یکہ و تنہا پاکر شاہزادہ نے ہمیشہ کے لئے سیاست سے کنارہ کشی کر لینے کا تہیہ کر لیا۔ ان کے ارادے بہترین اور مقاصد نہایت اعلیٰ تھے مگر اُن کی قسمت میں کامیاب ہونا نہ تھا۔ انتہائی مایوسی کی حالت میں اُنھوں نے اپنے خیمے اکھاڑے اور اپنے خاندان اور چند وفادار ہمرائیوں کے ساتھ ایک دُکھا ہوا دل لے کر انگریزی سرحد کی طرف روانہ ہوئے یہاں انگریزی علاقہ میں ان کو ہمیشہ ایک محفوظ پناہ گاہ مل سکتی تھی۔

مارچ کے مہینہ میں وہ فرخ آباد پہونچے اور اُنھوں نے اپنی آمد سے نواب وزیر اور گورنر جنرل کو اطلاع دی۔ آصف الدولہ انھیں اپنی مملکت میں پناہ دینے کے لئے تیار نہ تھا اور اُس نے تو لارڈ کارنواس کو بھی لکھا کہ انھیں انگریزی مملکت میں بھی پناہ نہ دی جائے۔

اس نے گورنر جنرل کو اپنے مکتوب میں حسب ذیل عبارت لکھی:۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ اب میرے امکان میں نہیں ہے کہ میں ان کے اخراجات کے لئے روپیہ ادا کرسکوں دوسری بات یہ ہے کہ عالیجاہ شاہزادہ موصوف کے قیام لکھنؤ کے خلاف مجھے متعدد اعتراض ہیں۔ و نیز یہ کہ کمپنی کی مملکت میں بھی انکا قیام قرین مصلحت نہیں ہے۔ میری اور کمپنی کی سلطنت ایک ہی ہیں۔"

مگر لارڈ کارنواس ان سے وعدہ کر چکے تھے اور اُن کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ اپنے الفاظ واپس لیں۔ ان کی کفالت کے لئے وظیفہ کے سوال پر گفت و شنید شروع ہوئی۔ گورنر جنرل نے شاہزادہ کے قیام کے لئے راج محل کو تجویز کیا جسے شاہزادہ موصوف نے منظور کر لیا۔ اسی درمیان میں ایک رات شاہزادہ بلا کسی کو ساتھ لئے نواب وزیر کے محل تشریف لے گئے اور ان دونوں میں جو غلط فہمی حائل آ رہی تھی

اُسے دُور کرنے کی کوشش کی اس سے وزیر کے دل میں کچھ نرمی پیدا ہوئی۔

لارڈ کارنواس نے نواب وزیر کے ذہن نشین کرایا کہ شاہزادہ کا وظیفہ جاری کر دینا ہی مناسب ہے۔ نواب آصف الدولہ اس کے لئے آمادہ ہو گئے کہ وہ تین لاکھ روپیہ سالانہ ادا کرتے رہیں۔ شاہزادہ نے اعتراض کیا کہ یہ رقم ان کے مرتبہ اور ان کی حیثیت کے مطابق نہیں ہے اور یہ کہ سابقاً وہ چار لاکھ سالانہ میں کام چلا لیتے تھے کیونکہ اس وقت وہ تن تنہا تھے۔ اور اب کہ نواب وزیر گورنر جنرل کی مہمان نوازی پر بھروسہ کر کے وہ اپنے بال بچوں کو بھی ہمراہ لے آئے ہیں تو اب تو تین لاکھ سالانہ میں کسی طرح بھی ان کی گزربسر نہیں ہو سکتی یہ رقم ان کی ضروریات کے لئے بالکل ہی ناکافی ہوگی۔

اِس پر اُن سے اصرار کیا گیا کہ وہ اپنے انتظامات میں کمی کریں اور اپنے اخراجات گھٹائیں۔ اور اُن سے درخواست کی گئی کہ وہ فوراً راج محل یا سہسرام چلے جائیں۔ کیونکہ اِن مقامات میں اخراجات کم ہوتے ہیں اور مقابلتاً بڑے شہروں میں صرف زیادہ ہوتا ہے۔ شہزادہ کو یہ سمجھایا گیا کہ کمپنی خود ہی بہت سی مالی دشواریوں میں گرفتار ہے جن کا اسے انتظام کرنا ہے اور یہ کہ ان کے لئے اس سے زیادہ کا انتظام کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔

شہزادہ موصوف جس حالت میں تھے اُنھوں نے اسکی بے بسی کو پورے طور سے محسوس کیا۔ اُنھوں نے صرف یہ التماس کی کہ ان کے اپنے حالات کی درستگی کے لئے کچھ وقت دیا جائے اور درخواست کی کہ کچھ رقم ان کو پیشگی دیدی جائے تاکہ وہ اپنے خدمتگاروں کی تنخواہیں ادا کر سکیں اور انھیں رخصت کر سکیں کیونکہ اب وہ انھیں اپنی ملازمت میں نہیں رکھ سکتے تھے۔

تقریباً اُسی زمانہ میں روزمرہ کے سفر کی زحمتوں اور تکلیفوں اور موسمِ گرما کی حدت اور گرد کی وجہ سے ان کی حرم اور بچوں کی صحت خراب رہنے لگی۔ کم عمر اور آرام و آسایش میں پلے ہوئے شہزادوں اور شہزادیوں کے لئے اس تکلیف وہ سفر کا بار بہت زیادہ تھا۔ ان لوگوں نے اب سے پہلے قلعۂ معلّیٰ دہلی کی حدُود کے باہر قدم بھی نہ رکھا تھا۔ یکے بعد دیگرے یہ لوگ بیمار پڑ گئے اور شاہزادہ مجبور ہو گئے کہ بنارس میں کچھ عرصہ تک قیام کریں۔ اس اندیشہ سے کہ ان کے اس فعل سے ان کے میزبانوں کے دل میں کوئی شبہ نہ پیدا ہو اُنھوں نے انتہائی عجلت کے ساتھ ان کو یقین دلایا کہ اُنھوں نے اپنا ارادہ تبدیل نہیں کیا ہے۔ اُنھوں نے لارڈ کارنواس کے سامنے اپنی حالت کی اس طرح وضاحت کی :۔

"آپ نے ہم لوگوں کی روانگی راج محل یا سہسرام کے موضوع پر بھی لکھا ہے۔ برادرِ عزیز باوجود بیگم کی علالت اور اپنی بیماری کے اور باوجود زنانخانہ میں دو سو مریضوں کے ہم نے یہ طے کر لیا تھا کہ ہم فوراً سہسرام جائیں

ہوجاؤں گا۔ میں نے بہت کافی سفر کیا ہے۔ اور میں سفر کی دوسری زحمتوں اور پریشانیوں کے علاوہ موسم کی صعوبت کو بھی برداشت کرسکتا ہوں۔ مگر نوعمر شہزادوں اور حرم سرا کی بیگمات کی حالت مختلف ہے۔ انھوں نے تو کبھی قلعۂ دہلی کے باہر قدم بھی نہیں رکھا ہے۔ خدا کرے موسم ان کو راس آئے اور جلد ہی وہ صحت یاب ہوجائیں۔ اِن ہی وجوہ سے میں آگے روانہ ہونے سے مجبور ہوں۔ جیسے ہی بارش ختم ہوگی میں فوراً روانہ ہوجاؤں گا۔"

بنارس میں شہزادہ موصوف کی زندگی نہایت پریشانی اور بے لطفی سے کٹی۔ ناکامی اور نامرادی نے اُن کا دل توڑ دیا تھا۔ اپنے عزیزا و اقربا کے مستقبل کے متعلق ہمیشہ پریشان اور متفکر رہنے کی وجہ سے ان کی صحت تباہ ہوچکی تھی۔ قسمت نے جوان کی ساری زندگی میں اُن پر نامہربان رہی اب موت کی صورت میں اُن پر مہربانی کی۔ ۳۱ رمئی ۱۸۸۸ء جب وہ چنار سے لوٹ رہے تھے کہ اچانک اُن کے سینہ میں سخت درد شروع ہوا۔ دوسرے روز صبح کے وقت اُنھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ ایک نامراد اور شکستہ دل آدمی اس دُنیا سے چل بسا۔

اُن کی وفات کے حالات اُن کے حرم نے تحریر کئے ہیں جن کا نام قتلغ سلطان بیگم تھا۔ اپنے مکتوب بنام لارڈ کا رنیواس میں جو ۱۲ رجون ۱۸۸۸ء کو موصول ہوا وہ تحریر کرتی ہیں :-

"شاہزادہ عالی جاہ ۲۴ رشعبان مطابق ۳۱ رمئی کو صبح کے ۴ بجے چنار تشریف لے گئے اور کچھ دیر وہاں ٹھہر کر شام کو بنارس واپس آرہے تھے۔ یہ اِسی شام غروب آفتاب سے ایک گھنٹہ پہلے کی بات ہے۔

تمام شب وہ بہت درد و کرب کی حالت میں رہے اور اپنے سارے جسم میں شدید درد محسوس کرتے رہے۔ جب صبح ہوئی تو اُنھوں نے فرمایا کہ اِن کے سینہ میں شدید درد ہو رہا ہے۔ نماز فجر کے وقت اُنھوں نے دو مکتوب خود اپنے ہاتھ سے تحریر کئے۔ اُن میں سے ایک مسٹر ڈنکن کے نام تھا۔ اور دوسرا نواب علی ابراہیم خاں کے نام تھا۔ ان دونوں مکاتیب پر اپنی مُہر ثبت کرنے کے بعد اُنھوں نے اِنھیں میرے حوالہ کیا اور مجھ سے کہا کہ وہ اپنے برادر عزیز گورنر جنرل کے پاس ونیز نواب وزیر کے نام بھی میرے متعلق مکاتیب تحریر کریں گے۔

میں نے اُن سے عرض کیا کہ وہ کیوں اس درجہ مایوس کُن باتیں کر رہے ہیں اور اُنھوں نے یہ خطوط کیوں لکھے ہیں؟ اُنھوں نے فرمایا کہ ان کے سینہ میں بے حد شدید درد ہے اور یہ کہ یہ مکاتیب آیندہ میرے لئے مفید ثابت ہوں گے۔ اِس کے بعد وہ اپنے کمرے میں سے باہر نکلے مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد واپس آئے اور بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے اور اُن کے تمام جسم سے پسینہ جاری ہوگیا۔

اُنھوں نے حکیم کو بلوایا۔ حکیم نے انکی نبض دیکھی۔ از اں بعد اُنھوں نے ٹھنڈا پانی مانگا۔ یک بہ یک اُنکی نگاہیں پتھرا گئیں اور وہ دوبارہ بے ہوش ہو گئے۔ لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ یہ صرع (مرگی) کا دورہ تھا جب مسٹر ڈنکن اور

علی ابراہیم کو اس کی اطلاع ہوئی تو اُنھوں نے اُن کے معالجہ کے لئے حکیم عبداللہ اور بعض مغربی ڈاکٹروں کو بُلایا۔
اِن لوگوں نے ایک نصد کھولی اور دوائیں دیں۔ چونکہ زندگی انجام کو پہنچ چکی تھی لہٰذا ان لوگوں کے علاج
سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

اِس بدنصیبی نے مجھے رنج و غم کے ایک پہاڑ تلے دبا کر چور چور کر دیا اور اس کی وجہ سے میں انتہائی حواس باختہ
اور بے انتہا پریشاں حال ہو رہی ہوں۔ میں آپ کے پاس یہ باتیں اس لئے لکھ رہی ہوں کہ متوفی شاہزادہ
کمپنی کے مقبوضات کو اپنا گھر اور اپنی جائے پناہ سمجھتے تھے۔ اور وہ یہاں اس غرض سے آئے تھے اور اپنے ساتھ
اپنے اہل و عیال کو بھی لائے تھے کہ وہ یہاں آپ کی پناہ میں زندگی بسر کریں۔

مجھے اُمید ہے کہ مجھے یہاں قیام کرنے کی اجازت دی جائے گی اور متوفی موصوف کے مزار کے قریب
آپ کی پناہ میں زندگی بسر کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ مجھے اُمید ہے کہ شاہزادہ مرحوم سے آپ کے جو دوستانہ تعلقات
تھے اور جو لحاظ اور خیال اُن کا آپ کے دل میں تھا اس کی بنا پر آپ میری بھی اسی طرح حفاظت فرمائیں گے جیسی
آپ شاہزادہ موصوف کی اُن کی زندگی میں فرماتے تھے۔"

مذکورۂ بالا پیغام میں جن مکاتیب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ بے انتہا درد انگیز ہیں۔ اِن میں
ایک طرف تو ایک لبِ گور انسان کی اُس فطری پریشانی اور قدرتی کشاکش کا مظاہرہ ہے جو وہ اپنے
پسماندوں کے مستقبل کی بابت محسوس کرتا ہے۔ اور دوسری طرف ان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ شاہزادہ
متوفی کی اُن لوگوں کے متعلق کیا رائے تھی جو دہلی کے شاہی محلات کے انتظامات اور دیگر اُمور کے
ذمّہ دار اور نگراں و مہتمم تھے۔

نواب علی ابراہیم خاں کے مکتوب میں یہ عبارت درج ہے :۔

"برادرم عزیز از جان علی ابراہیم خان

اِس وقت میری حالت بے حد نازک ہے۔ میں اِس وقت بے انتہا درد و تکلیف میں گرفتار ہوں۔ اگر
میں زندہ رہا تو خیر سب ٹھیک ہے لیکن اگر خدانا کردہ میں مرگیا۔ تو ایسی صورت میں اگر بادشاہ سلامت میری
حرم اور میرے خاندان کی بیگمات کو بلانے کے لئے آدمی روانہ کریں تو تم کسی حالت میں بھی انھیں دہلی نہ جانے دینا۔
اُمید ہے کہ تم ان کی اسی طرح حفاظت اور امداد کروگے اور انھیں اپنی ماں اور اپنی بہنوں کے بجائے سمجھوگے۔ اور
وہ اس وقت جہاں ہیں اِنھیں وہیں رہنے دو۔ ورنہ میں قیامت کے روز تمہارا دامن پکڑوں گا اور تمہارے
خلاف خدا سے انصاف چاہوں گا۔"

اصل فارسی مکتوب موصولہ ۱۹ جولائی ۱۸۰۸ء (P.R.D.N: 407)

مسٹر ڈنکن کے نام جو مکتوب ہے اُس کا بھی یہی ماحصل ہے مگر اُس میں اور زیادہ واضح الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ۔ اُس کی عبارت یہ ہے :-

"برادرم عزیز از جان مسٹر ڈنکان

اس وقت سینہ میں شدید درد ہونے کی وجہ سے میری حالت بے حد نازک ہے ۔ اگر میں زندہ سلامت بچ گیا تو بڑی اچھی بات ہے لیکن اگر میں مرگیا تو خدا کی مرضی یوں ہی سہی ۔

میں ان تمام باتوں کا واسطہ دلا کر تم سے درخواست کرتا ہوں جنھیں تم مقدس سمجھتے ہو کہ تم ہمیشہ میرے اہل و عیال کی مدد اور حفاظت کرنا ۔ اور جو وظیفہ تم اس وقت مجھے دے رہے ہو وہ ہمیشہ ہمیش میرے اہل و عیال کو دیا کرنا ۔

اور اگر بادشاہ سلامت میری حرم کو دہلی طلب کریں تو ایسی صورت میں میں ان تمام چیزوں کا واسطہ دلا کر جو تمہارے مذہب میں مقدس ہیں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ تم میری حرم اور میرے بچوں کو ہرگز ہرگز اُن کے پاس روانہ نہ کرنا ۔ میں اپنی جان تمہارے علاقہ میں دے رہا ہوں ۔ تم سے توقع ہے کہ تم کنواری مریم کی محبت کے طفیل میں میری حرم اور خاندان کی عزت اور احترام کو ملحوظ رکھو گے ۔ مقدس کنواری کے لئے میری حرم کو کسی حالت میں بھی شاہ جہاں آباد دہلی مت روانہ کرنا ۔ میں یہ مکتوب ایسی حالت میں لکھ رہا ہوں جبکہ میری جان نکل رہی ہے تاکہ میں تمہارے ذہن و دماغ پر اسے مرتسم کرسکوں تاکہ میری آخری درخواست تمہیں یاد رہے اور تم اسے بھول نہ جاؤ" ــــــ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

مترجم

عزیز الرحمٰن

خلیفہ الحکم کی علم دوستی!

(مرسلہ مولوی فضل الرشید صاحب وکیل پیلی بھیت)

امیر المومنین الحکم کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اُن کو علم سے عشق تھا۔ اپنی رعایا کو اُنھوں نے اس طرح آزادی دے رکھی تھی کہ جو نقصان دہ نہ تھی۔ اصول و احکام قرآنی کے وہ سختی کے ساتھ پابند تھے اور ملکی قانون کا احترام کرتے تھے۔ چند مقامات پر اُن کو فوج کشی کرنی پڑی۔ اُن میں اُنھوں نے پوری سرگرمی اور قوت دکھلائی۔ اُن مہمات نے یہ ثابت کر دیا کہ اگر بدامنی زیادہ پھیلی ہوئی ہوتی تو وہ نہایت کامیاب سپہ سالار ثابت ہوتے اُن کا علم ادب کی طرف میلان مزاق کی برابر تھا۔ دُنیا کا کوئی بادشاہ جس کا نام اِس وقت تک تاریخ محفوظ رکھتی چلی آرہی ہے اُنکی برابر عالم نہیں تھا نہ کسی کو اُن کی برابر مختلف شعبہائے علمی میں کمال حاصل تھا۔ دُنیا کے تمام ممالک میں جہاں تک تہذیب کا قدم پہنچ چکا تھا۔ ایشیا کے تمام بڑے بڑے دارالسلطنتوں اور تجارت گاہوں میں۔ بغداد۔ قاہرہ۔ دمشق۔ سکندریہ و قسطنطنیہ میں ان کے معتبرین معین رہتے تھے کہ ان کے کتب خانوں کے لئے کتابیں تلاش کرکے بھیجیں۔ خواہ کتنی ہی بڑی قیمت کوئی طلب کرتا۔ یا کتنی ہی دقتیں اور تکالیف کسی کتاب کے حاصل کرنے میں اُٹھانا پڑتیں۔ سب بکشادہ پیشانی برداشت کیجاتی تھیں۔ مگر قرطبہ کے محل شاہی کے لئے کتاب خرید لی جاتی تھی۔ کوئی کتاب جتنی کمیاب ہوتی اُتنی ہی زیادہ اُس کے حاصل کرنے کی کوشش کیجاتی تھی۔

اگر کوئی مالک اپنی کتاب فروخت کرنے میں تامل یا انکار کرتا تو اُس کی خوشامد درآمد کرکے اُس کی نقل دینے پر اُس کو آمادہ کر لیا جاتا اور محض اِس لئے کہ اس نے نقل دینا منظور کر لیا۔ اُس کو بیش قرار انعام دیا جاتا۔ ایشیا کے بادشاہوں کے پاس بڑے بڑے کتب خانے تھے لیکن وہ سب الحکم کے کتب خانہ کے مقابلے میں ہیچ تھے۔ ایشیائی بادشاہ کا کوئی کتب خانہ ایسا نہ تھا کہ جہاں اس روشن دماغ اور ذی ہوش بادشاہ الحکم کے کاتب اور نقل نویس نہ پائے

جانتے ہوں یا ان کے متعینہ ایسے علماء نہ ملتے ہوں کہ جن کا قلم کبھی تھکتا ہو یا جو محنت سے کسی وقت بھی جی چُراتے ہوں۔ یہ اعلان عام تھا کہ جو مصنف کوئی نئی کتاب لکھے یا تصنیف کرے الحکم کے حضور میں پیش کرے گا اور بیش قرار انعام پائے گا۔"

اس اعلان کا یہ نتیجہ تھا کہ قبل اِس کے کہ کتاب شائع ہو یا جس ملک میں لکھی گئی ہو اُس ملک والوں کو خبر ہو اصل کتاب قرطبہ پہنچ جاتی تھی۔ نہایت نامور اور بلند خیال مصنف اپنی کتاب دُور دراز ممالک سے الحکم کے حضور میں بھیج دیتے تھے۔ المغرب۔ مصر۔ بیزنطین۔ شام اور ایران سے کتابوں کے آنے کا سلسلہ لگا رہتا تھا۔ کوئی ایسی کتاب ہوتی تھی تو کم از کم ایک ہزار دینار انعام پاتی تھی۔

جب تلاش کتب کی یہ کیفیت اور قدر دانی کی یہ حالت ہو تو یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ علم کی ہر شاخ اور ہر شعبہ کا شوق بڑھ گیا۔ علمائے قدیم کے لکھائے دل و دماغ جو ایک زمانہ سے کسی کے گھر کے کونے میں خاک آلود پڑے تھے موتی بن کر نکل آئے۔ فلاسفۂ یونان کی کتابیں عربی میں ترجمہ ہوگئیں۔ ارسطو کا فلسفہ اور اُقلیدس کی تصانیف رعایا کے فائدہ کی غرض سے بازار میں آگئیں جس سوسائٹی میں کہ دماغی تفوق بڑے بڑے عہدہائے سرکاری کیلئے سفارش بن گیا تھا وہاں مطالعہ وانہماکِ علوم نہ صرف ہر دلعزیز ہی ہوگیا تھا بلکہ وہ نہایت لابدی پیشہ بن گیا تھا۔ جو شخص کہ سرکاری ملازمت کا خواہش مند ہوتا یا سیاسی شہرت حاصل کرنا چاہتا اس کے لئے کتابوں کا جمع کرنا اور اُن کو بغور پڑھنا لازمی ہو گیا تھا۔ یہی اُس کی ترقیات کا زینہ تھا۔ ہر خوشحال گھر میں کتابوں کا ایک ذخیرہ جمع رہتا تھا۔ نہ صرف نمود و دولت اور شہرت علم کی غرض سے بلکہ اِس لئے کہ اس گھر کے آدمیوں کو مطالعہ کا شوق تھا اور سب نے ان کتابوں کو پڑھا تھا۔

اُن لوگوں کے فائدے کے لئے جن کے پاس اتنے کافی ذرائع نہ تھے کہ وہ کتابیں خرید سکیں نیز اس غرض سے کہ عوام الناس کو ہر طرح کی آسانیاں بہم پہنچائی جائیں کہ وہ علم میں ترقی اور سائنس کی اشاعت کریں مُلکِ محروسہ کے تمام بڑے بڑے شہروں میں کتب خانۂ عام کھلے ہوئے تھے۔ چونکہ کتابوں کی طلب دنیا بھر کے بازاروں میں روز افزوں تھی اس لئے قیمت بڑھتی چلی جارہی تھی اور اُن کی تلاش اور نقل کرنے کے شوق سے لوگوں کو خواہ مخواہ علم کی طرف توجہ ہو گئی تھی۔ یہ مشہور ہو چکا تھا کہ اگر کوئی تحفہ امیر المومنین کے حضور میں پیش کرنے کے

قابل ہے اگر کوئی چیز امیر المومنین کی شرف قبولیت حاصل کر سکتی ہے تو وہ کسی ناقابل حصول کتاب کی نقل ہے یا کسی مشہور و معروف عالم کی سب سے پہلی تصنیف۔

اس میں کسی طرح کا شک و شبہ نہیں ہے کہ خلیفہ الحکم کا کتب خانہ سب سے پہلا علم کا ذخیرہ تھا جو یورپ میں قائم ہوا۔ یہ اندازہ کرنے کے لئے کہ کتابوں کی وہاں کیا قدر تھی۔ کتب خانے کے انتظام اور کتب خانہ کی عمارت پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ جس عمارت میں یہ کتابیں جمع تھیں وہ شان و شوکت میں کسی طرح قصر شاہی سے کم نہ تھی۔ اُس کا فرش نہایت قیمتی سنگِ مرمر کا تھا۔ دیواریں اور چھتیں بہترین سنگِ رخام کی۔ اُس میں سنگِ سبز اور سرخ کی پچی کاری تھی۔ الماریاں نہایت قیمتی صاف شفاف لکڑیوں کی تھیں۔ اُن میں سے بعض کی لکڑیاں اس لئے انتخاب کی گئی تھیں کہ وہ مشکل الحصول تھیں۔ اُن میں سے بعض کو اس لئے کہ اُن میں سے نہایت خوش آیند خوشبو نکلتی تھی۔ ہر ایک الماری پر سونے کے پتروں سے لکھا ہوا تھا کہ اِس الماری میں کس مضمون کی کتابیں ہیں۔

جگہ جگہ دیواروں پر مختلف لوگوں کے اقوال سُنہرے حروف میں لکھے ہوتے تھے۔ تاکہ اُن کو دیکھ دیکھ کر لوگوں میں علم کا شوق اور بڑے بڑے علماء اور شعراء کے قدم بقدم چلنے کا خیال پیدا ہو۔ رفتہ رفتہ کتابوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ کتب خانہ میں باوجود اس کی وسعت کے اُنکے رکھنے کی جگہ نہ رہی۔ دار الکتابت میں ایک فوج کی فوج کاتبوں اور جلد بندوں کی مقرر تھی۔ بہترین کتابوں پر سونا چڑھایا جاتا تھا۔ اور ان کو نقش و نگار سے مزین کیا جاتا تھا۔ اس صنعت میں وہ لوگ ایسی کاریگری دکھلاتے تھے کہ اب تک ان کی نقل نہیں ہو سکی اور نہ ہو سکے گی۔

الحکم کے کتب خانہ میں کتابوں کی تعداد چار لاکھ سے لیکر چھ لاکھ تک بتلائی جاتی ہے فہرست کتب چوالیس (۴۴) جلدوں میں تھی۔ بہت زیادہ ایسی کتابیں تھیں کہ جن پر اُنھوں نے خود اپنے ہاتھ سے حاشیے لکھے تھے اور شرح کی تھی۔ کتاب کے سفحہ اوّلیں پر نہ صرف کتاب ہی کا نام ہوتا تھا بلکہ مصنف کا نام۔ اُن کا نسب نامہ۔ سال پیدائش۔ وفات۔ یہ سب کچھ تحقیق و تدقیق کے ساتھ علماء شامی لکھتے تھے۔

امیر المومنین کو عجیب قوتِ حافظہ حاصل تھی۔ یہی حالت اُن کی قوتِ استنباط و استخراج کی تھی۔ اُن کی نظر نہایت نقاد واقع ہوئی تھی۔ وہ نظم و نثر لکھنے پر پورے قادر تھے۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز جو بات اُن میں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اتنی بڑی سلطنت کے مہام کے بار

کے باوجود مطالعہ کے لئے وقت نکال لیتے تھے۔ اور پھر مطالعہ بھی ایسا کہ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو تمام عمر میں بھی یہ بات حاصل نہ کر سکتا۔ وہ خود بہت بڑے مورخ تھے سب سے زور عایت نقاد تھے اور مسلم شارح۔ انھوں نے اندلس کی تاریخ لکھی تھی۔ عام شہرت یہ ہے کہ وہ نہایت آزادانہ روش سے لکھی گئی تھی چونکہ خود بادشاہ کی تصنیف تھی اِس لئے یہ امید ہی نہیں ہو سکتی کہ اُن پر کسی کا دباؤ تھا یا کسی کی رُو رعایت اُن کا مقصود تھا۔ اُن کے علم و فضل کی یہ کیفیت تھی کہ علم الانساب اور اُس کے بعض غوامض میں قرطبہ جیسے عالم خیز شہر اور قرطبہ جیسے متبحر دربار میں بھی وہ اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ علم تاریخ میں وہ اتنے کامل تھے اور اُن کی قوتِ فیصلہ کا یہ عالم تھا کہ تمام علما، و فضلا، دُنیائے اسلام اُن کی راؤں کو بلا چون و چرا تسلیم کر لیتے تھے۔

جیسا کہ قیاس ہو سکتا ہے اُن کی انتہائے قدردانی سے علم کی طرف عام طور پر رجحان ہو گیا تھا۔ اور ہر شخص کو اُس طرف تشویش و تحریص ہو گئی تھی۔ افریقہ۔ ایشیا اور یورپ کے تمام علوم و کمالات قرطبہ میں سمٹ آئے تھے۔ خلیفہ الحکم کی فیاضی۔ قدردانی اور اُن کے دربار کی شان و شوکت کی خبریں خاص کر یہ خبر کہ لیاقتِ علمی ہی اُن کے حضور میں سب سے بڑی سفارش ہے۔ تاجروں کے ذریعہ اقطاع عالم میں پھیل گئی۔ ہر طالبِ علم کی یہ تمنا تھی کہ کسی طرح اِس سوسائٹی میں جا کر تحصیل علم کرے کہ جہاں اس کو بے انتہا فوائد حاصل ہونے کی امیدیں تھیں۔ قرطبہ کی گلیوں میں دُنیا بھر کی اقوام کے طالب علم گروہ در گروہ چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ سر رشتۂ تعلیم کے الگ قاعدے و قانون بنائے گئے تھے اور اُن پر اُسی سختی کے ساتھ عمل کرایا جاتا تھا جیسا فوجی نظام پر محکمۂ تعلیم کے استحکام اور اُس کے رُعب کو قائم رکھنے کے لئے الحکم نے اپنے بھائی منذر کو اِس محکمہ کا افسرِ اعلیٰ اور نگراں مقرر کیا تھا۔

امیر المومنین نے اپنی فیاضی سے قرطبہ میں ستائیس مدارس ایسے قائم کر رکھے تھے کہ جہاں غرباء کے بچے بھی ویسی ہی تعلیم حاصل کر سکتے تھے جیسے کہ ممالک محروسہ کے بہترین کالجوں میں ملتی تھی۔

تاریخ اندلس

ـــــ ٭ ـــــ

اُردو کی ترقّی کے موانع

اور

اُنکو دور کرنے کا طریقہ

(شمس العلماء مولانا محمد امین صاحب عبّاسی چریاکوٹی)

اس مسئلہ پر غور و فکر کے لئے چند ابتدائی ابحاث کو تحریر میں لانے کی حاجت ہے جن کی تحقیق کے بعد اصل مسئلہ حل ہو جاتا ہے :-

(۱) اقوامِ عالم کی ترقی اور پستی کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے واضح ہوتا ہے کہ دُنیا کی ہر زبان اُس قوم کی ترقی کے ساتھ آگے بڑھتی ہے جس میں وہ زبان رائج ہے۔ جس قوم کی جو زبان ہے جب تک وہ قوم زندہ ہے زبان بھی زندہ ہے۔ کسی قوم کا انحطاط جب شروع ہوتا ہے تو زبان بھی مائل بہ زوال ہوتی ہے۔ اِسی اصول کے ماتحت جس طرح نظامِ قومی میں انقلابات اور تغیرات ہوتے ہیں۔ اسی طرح زبان بھی اپنے اصل مبدا سے آگے بڑھتی ہے اور اس میں بھی انقلابات لازم ہیں۔ اس کو یوں سمجھنا چاہیے کہ ہر قوم کی حیات اُس کے لٹریچر کی زندگی سے وابستہ ہے۔ نظامِ قومی میں جب انقلاب و تغیر پیدا ہوگا تو اُس قوم کا لٹریچر بھی اسی سانچہ میں خود بخود ڈھل جائیگا۔ اِس کی واضح دلیل زبان عربی کے لٹریچر کا انقلاب ہے جو اسلام کے بعد پیدا ہوا۔

قومِ عرب صدیوں سے جس معاشرت۔ تمدن اور دین کی خوگر تھی اور اُسی تمدن و معاشرت سے جو خیالات سارے قوم میں پیدا ہو گئے تھے وہ اُس قوم کا مجموعۂ مزاجِ عقلی بن گیا تھا۔ یہی اُن کی شاعری کی بنیاد تھی۔ انھیں افکار و خیالات کے سانچہ میں الفاظ اُن کی ادا کے لیے بن گئے تھے۔ یہی شاعری جس سے اُن کی تمدنی و معاشرتی زندگی جھلکتی تھی اُن کا مائیہ ناز و مباہات تھی۔ اسلام نے جو نیا لٹریچر پیش کیا جس سے ان کے مذہبی اور تمدنی نظام میں ایسا انقلاب پیدا کیا

اُن کا تمام لٹریچر جس پر وہ صدیوں سے فخر و مباہات کرتے تھے فرسودہ اور مضحکہ انگیز ہو کر رہ گیا وہ خیالات جن کے ادا کے لئے الفاظ و جملے ڈھلے ہوئے تھے باطل و بے بنیاد ثابت ہوئے۔ قرآن نے جن خیالات کی جن الفاظ میں ترجمانی کی قومِ عرب نہ تو ان افکار و خیالات کی عادی تھی اور نہ اس کے لئے اُن کے پاس ایسے موثر الفاظ و جملے تھے اور نہ اس نئے قرآنی نہج بیان سے آشنا تھے۔ اُن کا لے دے کر جو کچھ مایۂ ناز تھا وہ اشعار و قصائد تھے جن کے بل بوتے پر غیر عرب کو عجم یعنی گونگا کہتے تھے لیکن قرآن نے نثر میں وہ معجز تاثیر پیدا کی جس نے ان کی شاعری کے قلعہ کو پادر ہوا ثابت کیا۔ اسی کے ساتھ شعراء کے کیریکٹر کی جن الفاظ میں تصویر کھینچ کر سامنے رکھدی اُس نے شاعری کی حقیقت کو بے نقاب کر دیا۔ اِس سے زیادہ صحیح اور مکمل اُن کے اخلاق کی تصویر ہو بھی نہیں سکتی۔

الشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۝ ترجمہ: "شعراء کے پیچھے گمراہ چلتے ہیں۔ شعراء کو دیکھو کہ وہ ہر وادی میں ٹاپک ٹویا مارتے پھرتے ہیں جو کہتے ہیں کرتے نہیں۔"

حجاز میں عکاظ ایک بڑا بازار تھا، جہاں ایّامِ حج میں اقطارِ عالم کے تجار اور جاتری جمع ہوتے تھے۔ اُسی بازار میں شعراءِ عرب کا جلسۂ مشاعرہ ہوتا۔ اُس کا ایک پریسیڈنٹ ہوتا، پریسیڈنٹ اپنی رائے سے جو بہترین قصیدہ لکھتا اُس کو اوّل نمبر دیتا اور وہ قصیدہ خانۂ کعبہ پر لٹکا دیا جاتا تھا تاکہ آیندہ سال کے مشاعرہ میں جو اس سے بہتر قصیدہ لکھتا وہ اوّل درجہ میں رکھا جاتا اور تمام عرب میں وہ بہترین شاعر مان لیا جاتا تھا۔ ظہورِ اسلام تک ایسے سات قصیدے لکھے جا چکے تھے۔ قرآنِ پاک نے تمام شعراءِ عرب کو پہلا چیلنج قرآن کی دس آیتوں کے لکھنے کا دیا۔ ایک سال گزر گیا لیکن شاعر نے باوجود اپنے کبر و نخوت شاعری کے ہمت نہ کی۔ پھر دوسرا چیلنج ہوا کہ چھوٹی سے چھوٹی سورۃ جو کم سے کم تین آیتوں کی ہے لکھ دو۔ لیکن کوئی شاعر اس کے مقابلہ میں نہیں آیا۔ قرآن کی خوبیٔ بیان اور الفاظ کی دل کشی کا یہ عالم ہے کہ اجل شعراءِ عرب اِس کی آیتوں کو سُنکر رقص کرتے تھے۔ اس نہج کلام کو اپنے دسترس سے باہر پاکر باوجود قادر الکلامی کے قوم نے متفقہ طور پر تسلیم کر لیا کہ یہ انسان کا کلام نہیں ہو سکتا۔

اسلام نے زبانِ عربی میں بڑا انقلاب پیدا کیا اور اب یہ زبان اس دائرہ سے نکل کر آگے بڑھی اور اُس کا نیا دَور شروع ہوا اور پھر بتدریج مختلف عہود میں زبانِ عربی میں ترقی ہوتی رہی، قواعد منضبط ہوئے اس کی بلاغت و فصاحت کی تحقیق پر مجلدات لکھے گئے۔ غیر ملکوں کے میل جول

سے کلام میں انواع و اقسام کے صنائع و بدائع کا اضافہ ہوتا رہا۔ زبان کی ترقی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ محض صنائع لفظی و معنوی یعنی علم بدیع پر ابو العباس عبد اللہ بن المعتز خلیفہ عباسی نے ۲۷۴ھ میں اس فن پر پہلی کتاب "البدیع" لکھی۔ اس نے بدیع کے ۱۷ اقسام جمع کئے تھے۔ اُسی زمانہ میں قدامہ بن جعفر الکاتب نے "نقد الشعر" لکھی اور اس کے اقسام کو تیس ۳۰ تک پہونچایا۔ علامہ ابو ہلال عسکری نے ۳۹۵ھ میں "کتاب الصناعتین" لکھی جس میں اس نے بدیع کے ۳۷ اقسام تک دریافت کئے۔ اس کے بعد شرف الدین السفاشی نے اس کے ۷۰ اقسام دریافت کئے۔ پھر شیخ زکی الدین بن عبد السلام بن عبد الواحد المعروف بابن ابی الاصبع نے ۶۴۸ھ میں "تحریر التحبیر" لکھی اس نے اپنی تحقیقات سے اِس کے ۹۰ اقسام لکھے اور ان سب کو آیاتِ قرآنی پر منطبق کیا۔ اس شخص نے محض اس فن کی چالیس ۴۰ کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔ علامہ صفی الدین حلی نے کافیۃ البدیعہ ۷۴۰ھ میں لکھی۔ پھر ابو جعفر احمد الرعینی متوفی ۷۷۹ھ نے "بدیعہ العمیان" لکھا۔ پھر شیخ شمس الدین ابو عبد اللہ محمد بن جابر الاندلسی متوفی ۷۸۰ھ نے اِس فن پر "قصیدہ بدیعہ" لکھا۔ پھر شیخ عز الدین الموصلی اور وجیہ الدین الیمنی المتوفی ۸۰۰ھ نے "بدیعہ" لکھا۔ شیخ تقی الدین بن حجۃ الحموی متوفی ۸۳۷ھ نے اس فن میں "التقدیم" لکھی جس میں اس کے اقسام کو ایک سو چھیاسٹھ ۱۶۶ تک پہنچایا۔ اس تدریجی ترقی سے ظاہر ہے کہ ۲۷۴ھ سے ۸۰۰ھ تک صرف ایک ادبی شعبۂ ادب میں کتنی تحقیقات کی گئی اور صرف ایک صنف بلاغت کو کہاں سے کہاں تک پہونچا گیا جو زمانۂ جاہلیت کی صدیوں میں بھی یہ چیز حاصل نہ ہوئی۔ باوجود اس کے کہ زبانِ عربی کی شاعری درجۂ کمال کو پہونچ چکی تھی۔ اس کا سب سے بڑا سبب قوم کی توجہ صرف شاعری کی طرف منعطف تھی اور یہی ایک ذریعہ قوم کے افراد کے نام و نمود و شہرت کا قرار پایا تھا۔ اس نکتہ کو اسلام نے سمجھ لیا تھا اور اس کی بھڑکتی ہوئی آگ کو قرآنی تین ۳ جملوں نے ٹھنڈا کر دیا اور شاعری دورِ خلفا میں ذریعۂ عزّت باقی نہیں رہی اور لوگوں کی توجہ اس سے زیادہ ضروری چیزوں کی طرف مائل ہوئی۔ لوگ تحقیقاتِ علمی کی طرف متوجہ ہوئے۔ علاوہ دیگر فنون کے زبان کی علمی تحقیقات کی طرف علماء کی رغبت ہوئی اور ادب عربی کی ہر ایک شاخ نحو۔ صرف۔ بلاغت۔ فصاحت۔ لغت میں ہزاروں کتابیں تصنیف ہوئیں۔ اور زبانِ عربی کی علمی حیثیت مکمل ہوئی۔ چنانچہ ایک ادنیٰ مثال سے واضح ہوگا کہ محض نحو کے ایک مسئلہ کی تحقیق میں ائمہ نحو نے برسوں سر مارا اور دیہاتوں میں اس تحقیق کے لئے سرگرداں رہے۔ مسئلۂ زیر تحقیق یہ تھا کہ آیا تثنیہ پر بھی ندبہ آتا ہے یا نہیں سیبویہ نے کئی سال دیہاتوں میں گشت کیا

اور قریہ قریہ میں جاکر بدوؤں کے گھروں میں قیام کیا چنانچہ ایک بدو کی عورت کے دو پیالے جو بہت خوبصورت تھے ٹوٹ گئے اور اُس نے بیساختہ اظہارِ افسوس میں یہ لفظ کہدیا واجمجمتینا (ہائے دو پیالے) یہ سُنتے ہی سیبویہ شاداں و فرحاں گھر واپس آیا اور اِس مسئلہ کو لکھدیا۔ کہ تثنیہ پر بھی ندبہ داخل ہوتا ہے۔ اسی پر دیگر مسائل کو قیاس کر لیجئے۔

اب آپ اُردو کی حالت پر غور کیجئے اور اِس کا دوسری زبانوں سے مقابلہ کیجئے کہ جب سے اُردو زبان کی بنیاد قائم ہوئی۔ آج تک اِس زبان کی کوئی مکمل لغت تک تیار نہ ہوسکی۔ ادب اُردو کی دیگر شاخوں صرف۔ نحو۔ فصاحت۔ بلاغت کو چھوڑئیے۔ فصاحت و بلاغت میں جو دو چار کتابیں لکھی گئیں۔ اور اب سے پچاس برس پیشتر جو کتابیں اِس فن کے متعلق پڑھائی جاتی تھیں ـــ اردو کی ادبیات کو الگ کرکے جو کچھ سرمایہ تھا وہ محض شعراء کے کلام تھے۔ جنھوں نے اپنے نام و نمود یا حصول زر کے لئے اس کا سہارا لیا تھا۔ نہ زبانِ اُردو کی تحقیق اور نہ اس کو علمی زبان بنایا جیسا کہ زمانۂ جاہلیت میں شعراءِ عرب کا حال تھا۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اس ذریعہ سے زبان اُردو کی تدریجی ترقی پر نظر ڈالنا آسان ہوگیا اور شعراء نے زبانِ اُردو پر بڑا احسان کیا۔ اگرچہ یہ احسان ضمنی ہے ورنہ شعراء کا مقصود یہ احسان نہ تھا بلکہ حصولِ زر و نام و نمود تھا۔ اِن شعراء کے کلام کے تتبع سے اہلِ زبان بہت کچھ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ لیکن ایک عرب یا ایک فارسی یا خود ہند کے دوسرے صوبہ والوں کو اُس زبان کے سیکھنے اور اُس میں مہارت پیدا کرنے کے لئے اہلِ زبان نے کیا آسان ذرائع پیدا کئے ہیں۔ یہ شاعری غیر اہلِ زبان کے لئے تو کچھ مفید نہیں اور نہ اِس سے غیر ممالک کے باشندے باوجود اُردو کی طرف میلان کے اُردو زبان سیکھ سکتے اور نہ اِس ذریعہ سے اِس کا دوسرے ملکوں میں رواج ہوسکتا۔

میرا اپنا ذاتی تجربہ بنگال میں ایک ۱۲ سالہ قیام سے ہوا کہ بنگال کے مسلمان عربی زبان کے بعد اِسی زبان اُردو کو مقدس زبان سمجھتے ہیں۔ اُن میں کوئی مولوی اُس وقت تک مولوی نہیں سمجھا جاتا جب تک کہ اُردو زبان نہ جانے اور اُس میں بات چیت نہ کرسکے۔ اسی وجہ سے ہر سال ہزاروں بنگالی یو۔ پی میں تحصیل عربی کے لئے محض اس وجہ سے آتے ہیں کہ زبان اُردو بھی سیکھ لیں ورنہ بنگال میں اِن کی کوئی عزت نہ ہو اور نہ وہ مولوی سمجھے جائیں۔ یوپی میں وہ صرف اس وجہ سے آتے ہیں کہ اپنے ملک میں رہ کر ان کو اُردو زبان سیکھنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ سنہ ۱۹۳۰ء تک تمام مدارس عربیہ بنگال میں ذریعہ تعلیم زبان اُردو تھی لیکن اِنھیں دقتوں کی وجہ سے اُردو کا انحطاط

شروع ہو گیا۔ شعرا اور اہل زبان ہند دلی و دکنی کے زمانہ سے بجائے شعر و شاعری کے اس زبان کی ترویج کی فکر کرتے اور اس کو آسان تر بنانے کی کوشش کرتے اور اس پر کتابیں لکھتے تو آج تمام ہند میں زبان اردو رائج ہوتی اور عرب۔ فارس وغیرہ ملکوں میں اردو کے واقف کار سیکڑوں کی تعداد میں نظر آتے اور اسکی ہمہ گیری کم نہیں ہو سکتی تھی۔

یورپ میں زبان اردو سیکھنے کے آسان طریقوں پر جس قدر کتابیں تصنیف ہوئیں اور ہوتی جاتی ہیں، اردو میں اُس پایہ کی ایک کتاب بھی موجود نہیں۔ لغت اردو پر مختلف مصنفین نے ضخیم جلدیں لکھی ہیں، بخلاف اس کے خود اردو زبان میں کوئی اردو کی مکمل لغت موجود نہیں۔ یورپ میں اِس وقت زبان اردو کے جاننے والے جو کبھی ہندوستان نہیں آئے ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں، علاوہ اُنکے جنہوں نے ہند میں رہ کر اردو زبان میں مہارت پیدا کی ہے۔

عربی زبان میں اردو کے قواعد و لغت کی کوئی کتاب موجود نہیں، ایک عرب اگر زبان اردو سیکھنی چاہے تو اُس کے پاس کوئی ذریعہ موجود نہیں۔ ایک ایرانی زبان اردو سیکھنی چاہے تو وہ بجز اس کے کہ ہندوستان میں آکر قیام کرے اور اردو سیکھے دوسرا کوئی ذریعہ نہیں، اس لئے کہ کوئی کتاب قواعد اردو اور لغت اردو کی زبان فارسی میں جب سے اردو زبان کی بنیاد پڑی ہے نہیں ہوئی۔ محض اردو شاعری کے ذریعہ سے اردو زبان کی ترویج نہیں ہو سکتی۔ میرا اِس سے مقصود شاعری کی احماذِ ہمت نہیں ہے بلکہ اِسی کے ساتھ اُن ذرائع پر غور و فکر کی ضرورت ہے جن سے اردو کی ہند کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی ترویج ہو سکے۔ مصر۔ حجاز۔ شام۔ افریقہ وغیرہ ممالک کے لوگ اردو سیکھنے کی تمنا رکھتے ہیں تاکہ اُن کے تعلقات ہند سے استوار ہوں، لیکن ہم اِس کے لئے تیار نہیں۔

(۲) جس طرح اقوام کے نظامِ تمدنی و معاشرتی و مذہبی میں تبدیلی واقع ہوتی ہے اِسی طرح زبان بھی مختلف اسباب کے زیر اثر بدلتی ہے۔ مذہبی نظام ہو یا تمدنی، جب کسی قوم کا مزاج عقلی بن گیا جب تک اس قومی مزاج میں تغیر نہ ہو وہ معتقدات بدل نہیں سکتے۔ کسی فاتح کے بس سے اُس کا بدلنا باہر ہے بلکہ اس کو زمانہ بدلتا ہے، اِنحطاط درجۂ انحطاط سے قوم کو درجۂ ترقی تک پہونچنے میں بجبت سے درمیانی مراحل طے کرنے ہوتے ہیں۔ کوئی قوم درجۂ انحطاط سے درجۂ ترقی تک دفعتاً نہیں پہونچ سکتی بلکہ وہ ایک منزل سے دوسری منزل اور دوسری منزل سے تیسری منزل میں بتدریج داخل ہوتی ہے۔ کسی ترقی یافتہ قوم نے اپنے آبائی مذہب یا زبان کو ترک کر کے دوسری زبان یا مذہب کو

یکایک اختیار نہیں کیا بلکہ آہستہ آہستہ اُس میں تغیر واقع ہوا اور وہ نظامِ تمدنی یا مذہبی بتدریج اُس قوم کے مزاجِ عقلی کے سانچے میں ڈھلتا ہے۔

جب کوئی مذہب اسی طرح ایک قوم سے دوسری قوم کی طرف منتقل ہوتا ہے تو اپنی بیشتر خصوصیات کو کھو دیتا ہے۔ بسا اوقات صرف اُس کا نام باقی رہ جاتا ہے۔ اِس کی بین مثال بدھ مذہب ہے جس کی ابتدا ہند سے ہوئی۔ یہ مذہب جب چینیوں میں منتقل ہوا تو اُس کی تمام خصوصیات جاتی رہیں اور چینیوں کے مزاجِ عقلی کے سانچہ میں ڈھل گیا۔ چینیوں کے مذہب بدھ کے مطالعہ کرنے والوں کو بادی النظر میں معلوم ہوگا کہ یہ نیا مستقل مذہب ہے جو ہند کے بدھ مذہب سے بالکل جداگانہ ہے۔ یہی حال نیپال کے بدھ مذہب کا ہے جو چینیوں کے بدھ مذہب سے بالکل علیحدہ ہے اور نیپالیوں کا بدھ مذہب سر دیپ کے بدھ مذہب سے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔

اسلام کو لیجئے کہ باوجود اپنی سادگی توحید و بساطت رسالت کے جس کو اسلام نے پیش کیا مختلف ممالک میں اس کی حالت میں بہت کچھ تبدیلی واقع ہوئی۔ ہند کے بیشتر دیہات ایسے ہیں جہاں کے باشندوں میں اسلام محض نام ہی نام رہ گیا ہے۔ باوجود اس کے کہ اسلام کی بنیاد وحدانیتِ خدا پر قائم ہے۔ ہند میں دس کرور مسلمان آباد ہیں ان میں اکثر و بیشتر ایسے ہیں جو اسلام لانے سے بیشتر جس طرح ایک ہزار دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ حضور سرورِ کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اولیاء کا ان ایک ہزار دیوتاؤں میں ..... اضافہ کر دیا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے آپ کو مسلمان ہی سمجھتے ہیں۔

دُور کیوں جائیے۔ الجزائر کے مسلمانوں کو دیکھئے کہ جن کی زبان بھی عربی ہو گئی ہے۔ الجزائر میں مسلمانوں کے دو فرقے آباد ہیں۔ ایک بربر۔ دوسرے عرب۔ دونوں مسلمان ہیں۔ لیکن ان دونوں کے اسلام میں فرق ہے۔ بربر تعدادِ ازدواج کے قائل نہیں۔ باوجود اس کے کہ قرآنِ پاک میں اِسکی تصریح ہے۔ بربر کے اسلام میں بت پرستی کے آثار بیشتر پائے جاتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ اُن میں اسلام تیرہ سو (۱۳۰۰) برس سے ہے۔ لیکن قرطاجنہ کی حکومت کے زمانہ میں جو بت پرستی اُن کا مذہب تھی اُس کے آثار اُن میں ابتک باقی رہ گئے۔

دُنیا میں اسلام کے پھیلنے کا سب سے بڑا سبب اس کی حریت و مساوات تھی لیکن ہند کے مسلمانوں میں یہ مساوات قائم نہ رہ سکی۔ اِس لئے کہ ہند کے تمدن میں کبھی مساوات نہ تھی اور نہ ہند کا تمدن مساوات کو برداشت کر سکتا۔ ہند میں آریہ قوم کے آنے کے بعد جو نظامِ تمدن و معاشرت

ہند اس منو تنتر میں قائم ہوا اور تمام ہند میں ہزاروں برس سے یہی نظام چل رہا تھا اور ہند کے تمام افراد کی زندگی اور باخو دہا کے متعلقات اسی نہج پر قائم ہو گئے کہ اس میں مساوات و حریت اُس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک کہ تمام ہند کا نظامِ معاشرت و تمدن اور ذہنیتِ افراد بدل نہ جائے۔ یہی سبب تھا کہ بدھ مذہب جو مساوات و حریت ایک حد تک تھا ہند میں کامیاب نہ رہا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اُس کی حکومت ہند سے رخصت ہو گئی۔ اگر ہند میں حریت و مساوات قائم ہو تو سارے ہند کے تمدنی و معاشرتی نظام کی مشینری معطل ہو جائے۔

اسلام نے باوجود اس کے کہ اسنے حریت و مساوات کی تعلیم سے دُنیا کو اپنا حلقہ بگوش کیا لیکن غلامی کی رسم کو مٹا نہ سکا۔ اِس وجہ سے کہ اگر عرب میں رسم غلامی کو یکایک بند کر دیا جاتا تو ایسے غیر آباد و بنجر ملک میں جہاں محض تجارت پر زندگی بسر ہوتی ہے۔ تمام ملک میں ہلچل پیدا ہو جاتی ہے اسی کے ساتھ غلامی کے ایسے قواعد و اصول بنا دئے جس سے غلامی، غلامی نہ رہی۔ بلکہ ہر لونڈی و غلام زر خرید خاندان کا ایک ممبر بن گیا کہ ہر غلام اس صورت میں آزاد ہونا پسند نہیں کرتا اس لئے کہ اُس کے تمام اخراجات۔ شادی اور اولاد کے مصارف کا کفیل مالک ہوتا ہے۔ اپنی زندگی بسر کرنے میں غلام کو کسی چیز کی حاجت نہیں۔ گھر بھر مع غلام اور لونڈی کے ایک ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ سب یکساں کپڑا پہنتے ہیں۔ البتہ غلام کے متعلق محدود خدمات ہوتی ہیں جن کو وہ انجام دیتا ہے۔ دوسرے مسلمان زر خرید غلام نہیں ہو سکتا۔ کوئی غیر مسلم غلام نہیں ہو سکتا جب تک دینی جنگ میں قید کرکے نہ لایا جائے یا ور فدیہ نہ لے۔ غیر دینی جنگ میں بھی کوئی غیر مسلم غلام نہیں ہو سکتا۔ باخو دہا کی جنگ میں جب ایک مسلم بادشاہ دوسرے مسلم بادشاہ سے جنگ کرے اور اُن میں فاتح مفتوح کے لوگوں کو قید کر لے تو وہ غلام نہیں ہو سکتے۔

جس طرح تمدن و معاشرت و مذہب میں تبدیلی ہوتی ہے اِسی طرح زبان میں بھی انتقالات ہوتے ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ تمام اقوام کی ایک ہی زبان ہو، بچوں کی سی بات ہے۔ گال نے رومن پر فتح پانے کے دو صدی بعد زبان لاطینی اختیار کی۔ لیکن اپنی ضرورتوں کے لحاظ سے بہت جلد اس میں تبدیلی پیدا کی اور اپنے مزاج عقلی کے رنگ میں اُس کو رنگ دیا جس سے فرانسیسی زبان پیدا ہوئی۔

یہی حال الفاظ کا ہے جب ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہوتے ہیں تو اپنی وہ تمام خصوصیات کو جو پہلے تھیں دوسری زبان میں کھو دیتے ہیں اور اُس سانچہ میں ڈھل جاتے ہیں جو اُس

دوسری زبان کی خصوصیات ہیں جن پر اس زبان کے بولنے والوں کے عقائد کا اثر ہے۔ لہٰذا قوموں کے اختلاف سے معانی الفاظ میں بھی اختلاف واقع ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ایک لفظ کا ترجمہ دوسری زبان میں ان خصوصیات کو لئے ہوئے جو اس زبان میں اس لفظ کے ہیں ناممکن ہوتا ہے۔ صرف ایک اثر اُس معنی کا باقی رہ جاتا ہے۔ ایک کلمہ جس کے معنی ایک زمانہ میں کچھ رہتے ہیں، پھر صدیوں کے بعد یا اُس زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہونے کے بعد بدل جاتے ہیں اور وہ قدیم معنی جو زمانہ قدیم کے لوگوں کے اذہان میں جاگزیں رہے ہیں۔ دوسری قوم کے افکار۔ اخلاق اور عادات کے تغیر سے بالکل بدلجاتے ہیں، یہاں تک کہ ان دونوں معانی میں کوئی نسبت باقی نہیں رہتی۔ جب ہم اقوامِ قدیمہ کے تمدن کا اپنے موجودہ تمدن سے مقابلہ کرتے ہیں، تو دونوں تمدن اور معاشرت میں کوئی لگاؤ نہیں پاتے۔ اس صورت میں جب ہم ان کی زبان کا اپنی زبان میں ترجمہ کرتے ہیں تو اُن الفاظ کو پہلے معانی سے بالکل خالی پاتے ہیں۔ یعنی اُن الفاظ کی جو صورت ہمارے ذہن میں جس حیثیت سے منقش ہوتی ہے وہ بالکل اُس صورت کے مخالف ہوتی ہے جو اقوامِ قدیمہ کے اذہان میں تھی۔ اس کی بیّن اور واضح مثال فارسی میں لفظ "یزداں" ہے جو اب مسلمانوں کے اذہان میں معنی "خدائے واحد" کے ہیں۔ لیکن مجوسیوں میں اس کے معنی اس سے بالکل مختلف ہیں جو مسلمانوں کے اذہان میں تھے۔ مجوسی اپنے قدیم عقائد سے دو خدا تسلیم کرتے تھے۔ ایک خالقِ خیر جس کو یزداں کہتے تھے اور دوسرا خالقِ شر جس کو آہرمن کہتے تھے مسلمان چونکہ توحید کے قائل ہیں اس لئے یہ لفظ جب مسلمانوں میں آیا تو وہ قدیم معنی خالقِ خیر کے باقی نہیں رہے۔

اسی طرح عربی میں لفظ "صلوٰۃ" ہے جو اب بمعنی نماز مستعمل ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں نماز کا کوئی مفہوم ہی نہ تھا۔ یہود عرب میں لفظ صلوٰۃ مستعمل تھا، عربی میں اس کا مادہ ص۔ل۔ا (صلا) ہے۔ لغت عبرانی میں اس کا مادہ ص۔ل۔ہ۔ لیکن ہائے ہوز کو عبرانی میں الف پڑھتے ہیں یہ צלה صلہ صورت مکتوبی اور تلفظ صَلا ہے۔ کلدانی زبان میں صورت مکتوبی [illegible] صلا ہے اور تلفظ بھی صلا ہے۔ الغرض صورت مکتوبی کچھ ہو لیکن تلفظ ایک ہی ہے۔ عبرانی میں [illegible] کے معنی جلانے اور کباب کرنے کے ہیں۔ [illegible] کا [illegible] صلوت آیا ہے۔ چونکہ زبان عبرانی میں تائے مثناہ فوقانی [illegible] مثلثہ میں، مثلاً لفظ کاشس و کاث سے تبدیل [illegible] ہے۔ اس لئے صلوث بھی پڑھتے ہیں۔ صلوت کے معنی کباب کرنا۔ عربی میں [illegible] کے معنی جلانے کے ہیں۔ یہ کثیر الاستعمال ہے اور گوشت بھوننے کے معنی میں بھی مستعمل ہے اور اکثر بھاڑ کے معنی میں [illegible]

آگ میں لکڑی سیدھی کرنے کے معنی بھی ہوتے ہیں۔ کلدی میں اس لفظ کے دو معنی ہیں دعا و دوسرے معنی نماز کے ہیں۔ زبان سُریانی میں بھی یہ لفظ مثل کلدی کے مستعمل ہے۔ ان زبانوں کی جستجو سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اصل معنی جلنے، جلانے کے ہیں۔ نماز یا دعا کے معنی اصلی نہیں ہیں چونکہ زمانہ قدیم میں نماز و دعا کے وقت آگ جلاتے تھے اِس لئے صلوٰۃ کا اطلاق نماز پر اب بھی بخزمانہ قدیم کے دستور کے مطابق اکثر دعاؤں کے وقت بخور جلاتے ہیں۔ پھر جب دین آتش پرستی شائع ہوا اُس وقت آگ جلانا اصل نماز ہوا۔

حضرت موسیٰ کے زمانہ میں نماز نہ تھی۔ بلکہ اُس کی جگہ پر قربانی فرض تھی اور دعا بھی پڑھتے تھے۔ لہٰذا صلوٰۃ کا لفظ اسلام کے بعد جس معنی میں بولا جاتا ہے اصل معنی کا صرف ایک نشان باقی رہ گیا ہے۔ اسی لفظ کا کسی زبان میں ترجمہ کیا جائے تو صحیح نہیں ہو سکتا۔ اور نہ کوئی زبان اس صورت کو ظاہر کر سکتی ہے کہ جس صورت پر لفظ صلوٰۃ کا اطلاق ہے۔ انگریزی میں Prayer ہے لیکن پریر کے معنی دعا کے ہیں۔ جیسا کہ صلوٰۃ کے معنی زبان عبرانی میں دعا کے ہیں جو گرجاؤں میں ہوتی ہے۔

اقوام مختلفہ کے لئے ناممکن ہے کہ مدت دراز تک ایک ہی زبان پر جس کو اختیار کیا ہے قائم رہیں۔ ایک مدت کے بعد زبان میں تغیر اور تبدیلی ایک امر فطری ہے جو ہو کر رہے گا۔ اِس کے مختلف اسباب ہیں۔ کبھی تو فاتح اپنی زبان کو ملک مفتوح میں رواج دیتا ہے اور لوگ حکومت میں شرکت کے لئے اُس زبان اور اُس کی وضع کو اختیار کرتے ہیں۔ کچھ تو مجبوراً اور کچھ فخر و مباہات کے لئے جیسا کہ سلطنتِ مغلیہ کے زمانہ میں دفتر زبان فارسی میں تھا۔ جس سے مجبوراً لوگ فارسی زبان سیکھتے تھے اور کچھ فخر و حکومت کی لذت سے۔ اِس طرح فارسی زبان کا اتنا رواج ہو گیا تھا کہ ہندی کے بڑے بڑے شعرا جیسے کیشوداس۔ تلسی داس۔ سورداس۔ بہاری لال وغیرہ کے کلام فارسی الفاظ سے پُر ہیں۔

کبھی تجارتی ضرورتوں سے زبان میں تغیر ہوتا ہے۔ جیسے چاٹگامی زبان میں عربی الفاظ بھرے ہوئے ہیں اور یہ زبان فارسی اور عربی اور بنگلہ الفاظ سے مل کر جُداگانہ زبان بن گئی۔ چونکہ عرب بذریعہ تجارت یہاں آتے تھے اور خود یہاں کے لوگ جو بالعموم جہازوں پر کام کرتے رہے اور یہاں جہاز سازی کے کارخانے تھے۔ عربی ممالک میں جاتے تھے اِس لئے یہاں کی زبان بنگلہ سے بالکل جداگانہ بن گئی جو اب تک لکھی نہیں جاتی صرف بولی جاتی ہے۔

تیسرے دو مختلف اقوام کے باہم میل جول سے ایک نئی زبان بن جاتی ہے۔ جیسے اردو یا

پشتو - یہی وہ اسباب ہیں جن سے ایک قوم اپنی اصلی زبان کو چھوڑ کر دوسری زبان اختیار کرتی ہے - اِس نئی لغت (زبان) میں بھی کچھ زمانہ کے بعد تغیر اور تبدیلی ہوتی ہے - جیسے ہند کے مختلف اقوام کی مختلف زبانیں ہیں - علماء نے تحقیقات سے معلوم کیا ہے کہ اس وقت ہندوستان کے مختلف صوبوں میں ونؤلئو چالیس زبانیں بولی جاتی ہیں اور اُن زبانوں میں باخود ہا اس سے زیادہ فرق ہے جو لاطینی اور فرانسیسی زبانوں میں باخود ہا ہے -

اُردو زبان قریب تر عہد کی ہے جس کی عمر تین سو برس سے زیادہ نہیں ہے - اِس سے بیشتر ہند میں جیساکہ مشہور فاضل ڈنڈی نے اپنی کتاب "کاویہ درس" میں لکھا ہے - فصل ۱ - ۳۲ - ۳۸ - کچھ زبانیں بولی جاتی تھیں جو اب فنا ہو گئیں :-

"محققین نے کہا ہے کہ زبانیں چار ہیں - سنسکرت - پراکرت - اپ بھرنش اور ممزوج (۳۲) سنسکرت زبانِ الٰہی ہے جس کی علماء نے تشریح کی ہے - پراکرت کے مختلف مدارج ہیں (۱) ماخوذ (۲) مماثل (۳) دیسی (۳۳) -

مہاراشٹر دیس میں جو زبان مروج ہے وہ بہترین پراکرت سمجھی جاتی ہے جس میں نظم "سیتو بندہ" لکھی گئی ہے - (۳۴)

شورسینی - گاودی اور لاٹی یہ بھی اسی قسم کی عام طور پر بولی جانیوالی پراکرت ہے - (۳۵)

اہیر وغیرہ اقوام کی زبان اب بھرنش کہی جاتی ہے جو نظم اور منون کی کتابوں میں مستعمل ہے اور سنسکرت کے علاوہ ہر زبان کو اپ بھرنش یعنی مبتذل کہتے ہیں - (۳۶)

زبان سنسکرت میں "سرگ بندہ" وغیرہ نظمیں لکھی گئی ہیں - پراکرت میں "سکندھک" وغیرہ نظمیں لکھی گئی ہیں "اوسار" وغیرہ نظمیں اپ بھرنش میں ہیں - "ڈراما" وغیرہ میں ممزوج زبان مستعمل ہے - (۳۷)

قصص و حکایات جس طرح اور زبانوں میں پائے جاتے ہیں سنسکرت میں بھی لکھے گئے ہیں "برہت کتھا" کے متعلق کہا جاتا ہے کہ "اجتنہ" کی زبان میں لکھے گئے جن میں مافوق العادات واقعات ہیں - (۳۸)"

قدیم زمانہ میں پراکرت زبان نے بڑی ترقی کی تھی لیکن زمانہ کے امتداد اور صوبوں کے اختلاف سے اس میں بہت تبدیلیاں ہوئیں - ابتدا میں یہ زبان سنسکرت کی بگڑی ہوئی شکل تھی - جس کو سنسکرت نہ جاننے والے استعمال کرتے تھے - مہاتما بدھ نے اُس وقت کی زبان مروّج میں وعظ و نصائح کئے تھے جس کو پُرانی پراکرت کہنی چاہئے - بہت سے علماء اُس کو پالی زبان بھی کہتے ہیں - لنکا - برما - سیام وغیرہ ملکوں میں اُن کی مذہبی کتابیں اِسی زبان میں ہیں -

اشوک کے پند ونصائح اُس وقت کی مروجہ پراکرت بھاشا میں لکھے گئے۔ اشوک کے زمانہ تک پراکرت بھاشا کا سنسکرت سے قریب تر تعلق تھا۔ اِس کے بعد جب پراکرت بھاشاؤں کو فروغ ہوا تو زمانہ اور جگہوں کے اختلاف سے اُن میں تغیرات ہوئے اور اُن میں سے ہر ایک کے جُدا گانہ نام پڑ گئے جو یہ ہیں :-

(۱) ماگدھی (۲) شورسینی (۳) مہاراشٹری (۴) پیشاچی (۵) آونتک (۶) اپ بھرنش

(۱) ماگدھی زبان مگدھ اور اُس کے قرب وجوار کے مُلکوں میں بولی جاتی تھی۔ قدیم ماگدھی اشوک کے کتبوں میں ملتی ہے۔ اِس زبان کی کوئی کتاب اب تک پائی نہیں گئی۔ عام طور پر سنسکرت کے ناٹکوں میں چھوٹے درجہ کے نوکر چھوکرے۔ سپاہی۔ پردیسی۔ بچے وغیرہ کی گفتگو اسی زبان میں تھی جو شکنتلا۔ پربودھ چندرودے۔ مِرچ سنگھار وغیرہ سنسکرت کی ناٹک کتابوں میں سنسکرت کے ساتھ ملی ہوئی پائی جاتی ہے۔ کچھ زمانہ کے بعد اس ماگدھی میں تبدیلیاں ہوئیں جس میں شورسینی کی آمیزش سے اردھ ماگدھی بن گئی۔

(۲) شورسینی۔ متھرا کے قرب وجوار کی زبان تھی۔ سنسکرت ناٹکوں میں عورتوں اور مسخروں کی زبان یہی تھی جو رتناولی۔ ابھگیان شکنتلا وغیرہ سنسکرت ناٹک کی کتابوں میں پائی جاتی ہے۔ اس زبان میں کوئی مستقل ناٹک دستیاب نہیں۔

(۳) مہاراشٹری۔ یہ پراکرت مہاراشٹر کی بولی تھی۔ یہ زبان پراکرت کی نظموں میں مستعمل تھی۔ کچھ زمانہ کے بعد اس میں بھی تغیر ہوا جو بگڑ کر جین مہاراشٹری کے نام سے موسوم ہوئی۔ اِس زبان کی کوئی کتاب دستیاب نہیں۔

(۴) پیشاچی۔ یہ پراکرت کشمیر اور ہند کے مغربی شمالی ملکوں میں بولی جاتی تھی۔ اِس زبان میں گوناڈیہ کی مشہور کتاب "ورہت کتھا" لکھی گئی۔ جو اب ناپید ہے۔

(۵) آونتک۔ یہ پراکرت اونتی یعنی مالوا کی تھی۔ اس کو چولیکا۔ پیشاچی یا بھوت بھاشا بھی کہتے تھے۔ راج شیکھر سنسکرت کی قدیم کتاب میں مذکور ہے کہ بھوت بھاشا (چولیکا۔ پیشاچی) اونتین۔ پیتوا۔ چنبل اور دشپور یعنی مندسور میں یہ زبان مروج تھی۔ دوسری صدی عیسوی سے پہلے پنجاب میں ایک قوم مالو نامی نے راجپوتانا ہوتے ہوئے اونتی دیس کو فتح کیا جس سے اس مُلک کا نام مالوا ہوا۔ ممکن ہے کہ پیشاچی زبان بولتے تھے۔ اِس مُلک پر قبضہ کرنے کے بعد اپنی زبان کا اِس میں رواج دیا ہوا اور زمانے کے امتداد سے اس میں تغیرات ہوئے جن سے اِس کا نام چولیکا پیشاچی ہوا۔ اِس زبان کی کوئی کتاب نہیں ملتی۔

(۶) **اَپ بھرنش**۔ اِس کا رواج لاٹ یعنی گجرات۔ مارواڑ۔ جنوبی پنجاب۔ راجپوتانا۔ مالوا۔ مندسور وغیرہ میں تھا۔ یہ پراکرت کسی مخصوص ملک کی زبان نہ تھی بلکہ اوپر ذکر کی ہوئی ماگدھی وغیرہ مختلف پراکرت کی بگڑی ہوئی صورتوں سے مل کر ایک زبان بن گئی جس کا نام اَپ بھرنش ہوا۔ اِس کو ہند کے دُور دُور ملکوں کے علما استعمال کرتے تھے۔ راجپوتانا۔ مالوا۔ کاٹھیاوار اور کچھ وغیرہ کے بھاٹوں کے ڈنگل بھاشا کے گیت اِسی زبان میں ہیں مگر آخری دَور کی بگڑی ہوئی صورت میں۔ پُرانی ہندی بھی بیشتر اسی سے نکلی ہے۔ اگرچہ اُس زمانہ میں ہندی بھاشا کا وجود نہ تھا۔ آگے چل کر ہم اس کی تحقیق کریں گے۔

اُردو زبان کی بُنیاد عربی۔ فارسی اور ہندی کے امتزاج سے قائم ہوئی۔ یعنی بدیسی فاتحین کی زبان فارسی تھی جو عربی سے ہمیشہ ممزوج رہی اور مفتوحین کی زبان ہندی عام طور پر مروج تھی۔ انھیں کے باخود ہامیل سے یہ زبان پیدا ہوئی۔ تھوڑے زمانہ کے بعد.... فاتح اور مفتوح دونوں ہی اپنی زبانوں کو بھول گئے اور یہ نئی زبان عام طور پر مروج ہو گئی۔ چونکہ یہ زبان فاتح اور مفتوح اقوام کے میل سے پیدا ہوئی۔ اِس لئے دونوں کے خیالات وافکار کے موافق تھی اس لئے جلد مروج ہو گئی۔ جب تک کسی قوم میں کسی اثر کے قبول کی استعداد پیدا نہ ہو اُس وقت تک کوئی نئی چیز یا نیا خیال پھیل نہیں سکتا۔ کسی اثر کے قبول کی استعداد جو ایک قوم دوسری قوم پر ڈالنا چاہتی ہے اُس وقت تک یہ استعداد پیدا نہیں ہوتی جب تک دونوں قوموں کے خیالات میں مماثلت یا اجنبیت نہ رہے۔ طاقت یا حکومت سے کسی زبان کا رواج نہیں ہوسکتا اور نہ کسی زبان مروج کو کوئی حکومت مٹا سکتی ہے بلکہ زمانہ اور حالاتِ ملکی اور نظامِ حکومت زبان کی ترویج یا کساد کا سبب ہوسکتے ہیں۔

فارسی بولنے والی قوم کے جو بحیثیت فاتح ہند میں آباد ہوئی خیالات وافکار ومزاج عقلی ہندی بولنے والی مفتوح اقوام کے خیالات اور مزاج عقلی کے بالکل مخالف تھے آپس کے میل وارتباط سے دونوں کے افکار وخیالات میں کسر وانکسار واقع ہوا جس سے نہ تو فاتح کے وہ خیالات باقی رہے اور نہ مفتوح کے وہ اوہام ومعتقدات جو ان میں صدیوں سے وراثتہً چلے آرہے تھے اس کسر وانکسار سے دونوں قوموں میں جو مشترک مزاج عقلی پیدا ہوا اس کے لئے نہ تو فاتح کی فارسی کام آسکتی تھی اور نہ مفتوح کی ہندی وسنسکرت۔ لہٰذا فطرتِ قومی کا یہ اقتضا تھا کہ ایسی مشترک مزاج عقلی اور افکار کے لئے مشترک زبان ہو جو اس نئی قوم کے نئے خیالات وافکار کی ترجمانی کرسکے۔ یہ تغیر کسی طاقت یا کسی قوم کی کوشش سے نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اس کو زمانہ اور نظامِ قومی پیدا کرتا ہے۔

اِس کی سب سے واضح مثال ایران ہے۔ مسلمانوں نے جب اِس ملک کو فتح کیا اور فاتح و مفتوح کے میل سے ایک نئی قوم پیدا ہوئی اور اس نئی قوم کے مشترک خیالات و افکار کے لئے اِسی کے موافق ایسی زبان بنی جو قدیم فارسی یعنی پہلوی جس میں اِن کی مذہبی کتاب ژند و اُوستا تھی جو اب مفقود ہو گئی اور عربی کے درمیان مشترک تھی اور وہ عربی حروف میں لکھی جانے لگی اور وہ پہلوی کا قدیم رسم خط جو بائیں جانب سے لکھا جاتا تھا فنا ہو گیا۔ اسی کے ساتھ مجوس قوم جو ایران کی اصلی باشندہ تھی ختم ہو گئی اور اُن کا تمدن اور مذہب بھی اسی کے ساتھ مٹ گیا۔ یہی نئی فارسی جو عربی رسم خط میں لکھی جانے لگی تمام ایران میں پھیل گئی۔ اس لئے کہ حکومت اور قوم دونوں اس کی موید تھیں۔

زبان کی ترقی اور بقا کا تعلق بیشتر موجودہ حکومت اور تجارتی اغراض سے ہوتا ہے جب حکومت کسی زبان کے مٹانے کے درپے ہو تو اگرچہ وہ جلد مٹا نہیں سکتی۔ جس طرح صدیوں میں زبان اپنے عروج کو پہونچتی ہے اس کے مٹنے میں بھی صدیاں درکار ہیں وہ بھی جب قوم متفقہ طور پر اس زبان کو چھوڑنا چاہے۔ اس لئے کہ کسی زبان کا کسی قوم میں پیدا ہونا اُس قوم کے خیالات و افکار کے مخصوص صورت میں ڈھل جانے کا نتیجہ ہے جو صدیوں کی عادت اور نظام تمدنی و معاشرتی کی تبدیلی سے پیدا ہوتی جس کیلئے امتدادِ زمانہ کی ضرورت ہے یہ چند دنوں کی ایک جماعت کی کوشش سے بدل نہیں سکتی۔ اس تغیر کیلئے مزاجِ عقلی و نظامِ تمدنی و معاشرتی و مذہبی کا تغیر سب سے پہلے ضروری ہے۔ جو ایک سال دو سال کا کام نہیں۔

اسپین میں چھ سو برس مسلمانوں نے حکومت کی عربوں کا تمدن۔ مذہب اور زبان تمام ملک میں پھیلا اور چھ سو برس تک قائم رہا۔ مسلمانوں کے اِس ملک کو چھوڑنے کے بعد بھی صدیوں اُس تمدن اور معاشرت کا اثر باقی رہا۔ اگرچہ وہاں ایک مسلمان بھی باقی نہ رہا۔ باوجود اس کے تمام اسپینی قوم متحدہ طور پر عربی آثار کو متعصبانہ طریقہ سے مٹا رہی تھی۔ اُس اسلامی تمدن اور معاشرت کے مٹنے کے بعد پھر وہ قدیم اسپینی تمدن واپس نہیں آیا بلکہ ایک تیسرا تمدن قائم ہوا جو دونوں سے مختلف ہے۔

بنگال میں چند مقامات جیسے ڈھاکہ۔ مرشد آباد۔ مدناپور وغیرہ ایسے ہیں جہاں لوگوں کی مادری زبان اردو ہے۔ باوجود اس کے کہ صدیاں گزر گئیں بنگالی ہندوؤں نے زبان بنگلہ کو تمام ملک میں شدت سے رواج دیا۔ تمام دفاتر بنگلہ زبان میں منتقل ہو گئے۔ تمام تجارتی کاروبار بنگلہ زبان میں ہونے لگے۔ لیکن اِن مقامات میں اُن کی زبان اردو پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ باوجود اس کے کہ اِن مقامات کو ہر طرف سے زبان بنگلہ نے محصور کر لیا ہے بجائے اس کے اُردو کی اِن مقامات میں روز افزوں ترقی ہے۔

آئے دن مشاعرے کے جلسے ہوتے ہیں۔ ڈھاکہ کے لوگ اُردو کی نظمیں لکھتے ہیں۔ سیکڑوں آدمیوں کا مجمع ہوتا ہے۔ کبھی کبھی دو دو چار یوپی اور پنجاب کے شعرا بھی شریک ہو جاتے ہیں۔ اُن کے اشعار میں اُردو کی وہی شان قائم رہتی ہے جو لکھنؤ میں ہے۔ بنگالیوں کے جد وجہد کا اتنا اثر ہے کہ اِن مقامات کے باشندے بنگلہ زباں بھی اُسی روانی سے بولتے ہیں جیسی اُردو۔ فرق صرف یہ ہے کہ آپس میں ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے، یا اپنے گھر میں اُردو ہی میں باتیں کرتا ہے۔ ہندوؤں سے البتہ وہ لوگ بنگلہ زبان میں باتیں کرتے ہیں۔ اِن مقامات میں ہندو بھی بلا تکلف اُردو بولتے ہیں۔ مگر غیر بنگالی سے۔

صوبہ پنجاب کو لیجئے کہ پنجابی بالعموم اپنے گھروں میں پنجابی زبان میں باتیں کرتے ہیں۔ لیکن اُنکی تمام تعلیم اُردو زبان میں ہے۔ خط وکتابت اُردو ہی میں کرتے ہیں۔ زبان پنجابی اُردو میں ہی لکھتے ہیں۔ پنجابی کا رسم خط اصلاً گورمکھی ہے۔ لیکن کتنے پنجابی مسلمان ہیں جو گورمکھی خط پڑھ سکتے ہیں۔ زبان اُردو نے پنجاب میں جسقدر ترقی کی خود لکھنؤ اور دہلی اِس سے بہت پیچھے رہ گئے۔

علماءِ اسلام نے مسئلہ لسانیات پر کافی غور کیا تھا، اِس نکتہ پر پہونچے کہ ہر زبان کا رسم خط اُس زبان کی رُوح رواں ہے جب تک کسی زبان کا رسم خط باقی ہے وہ زبان باقی ہے۔ فارسی قدیم زبان پہلوی بائیں جانب سے لکھی جاتی تھی تمام ایرین زبانوں کی طرح۔ لیکن جب مسلمانوں نے اِس مُلک کو فتح کیا تو پہلے اس زبان کے رسم خط کو بدل کر عربی رسم خط قائم کیا جس سے پہلوی زبان مٹتے مٹتے فنا ہوگئی اور اُس کی جگہ عربی ممزوج فارسی مروّج ہوئی۔ اِنھیں عربی حروف کی وجہ سے عربی الفاظ دخیل ہوگئے اور زبانِ فارسی کی کایا پلٹ ہوگئی۔ قدیم پہلوی رسم خط اس طرح فنا ہوا کہ اب ایران میں بھی اُس رسم خط کا پڑھنے والا یا اُس قدیم پہلوی زبان کا سمجھنے والا کوئی باقی نہیں رہا۔ اگر کچھ ہوں گے تو اُن کا شمار انگلیوں پر ہو سکتا ہے یہ وہ نکتہ تھا کہ جس سے زبانِ عربی ایران سے فنا نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح جب مسلمانوں نے مصر فتح کیا تو وہاں کی زبان کو بدلا۔ عربی مُلکِ مصر کی زبان ہوگئی۔ اِس وقت مصر میں عربی کی جس قدر ترقی ہے خود حجاز میں جو زبان عربی کا گہوارہ تھا یہ ترقی نہیں ہے۔ بعینہٖ یہی حالت اُردو کی پنجاب میں ہے۔ اُردو کی جتنی اشاعت پنجاب میں ہے وہ لکھنؤ میں جو اُردو کا مرز بوم ہے نہیں ہے۔

علامہ عبدالفتاح عبادہ فاضل مصری نے اپنی کتاب "انتشار الخط العربی فی الشرق والغرب" میں لکھا ہے کہ دُنیا کے ۱/۲ حصّہ کی زبانیں حروفِ عربی میں لکھی جاتی ہیں۔ اُن میں سے چند مُلکوں کا ذکر

کرتا ہوں جنکی زبانیں حروف عربی میں لکھی جاتی ہیں جس سے زبانِ عربی ان زبانوں میں فارسی کی طرح
دخیل ہے :-

نوبیا۔ جنوبی ابی سینیا۔ نائجیریا۔ سومالی۔ کیپ کالونی۔ زنجبار۔ مدغاسکر۔ ترکستان۔ قازمں۔
باطوم۔ کریمیا۔ دیگر صوبجات کوہ قاف۔ ایران۔ کردستان۔ تاتار۔ قزان۔ داغستان۔ کاشغر
افغانستان۔ بلوچستان۔ جزائر بحر الکاہل۔ (جاوا۔ ساٹرا۔ بورنیو وغیرہ) ایشیائے کوچک۔ ہندوستان
(پنجاب۔ صوبہ متحدہ۔ صوبہ سرحد۔ صوبہ سندھ۔ کشمیر۔ مدراس (ملایالم) حیدرآباد۔ برار۔ ریاست
گوالیار۔ ریاست بھوپال وغیرہ ریاستیں) بحر متوسط کے سواحل جبل الطارق سے مصر تک (ٹیونس۔
الجیریا۔ مراکو وغیرہ) قسطنطنیہ۔ ایڈریانوپل۔ جبل اسود۔ سالونیکا وغیرہ۔ امریکا کے بعض جزائر وغیرہ۔

یہ وہ مقامات ہیں جہاں کی زبان حروف عربی میں لکھی جاتی ہے۔ اس ذریعہ سے عربی اِن
ملکوں میں زندہ ہے۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں عربی بولی نہیں جاتی۔ جن ممالک کی زبان عربی ہے
اِن کے علاوہ ہیں جہاں عربی رسم خط ہے اور بول چال بھی عربی ہے۔ ایسے ممالک کا بہت بڑا رقبہ ہے۔

خود صوبہ بنگال میں پچاس۔ ساٹھ سال پیشتر زبان بنگلہ عربی حروف میں لکھی جاتی تھی۔ چنانچہ
میں نے خود سیکڑوں کتابیں زبان بنگلہ کی عربی حروف میں چھپی ہوئی دیکھیں۔ داستان امیر حمزہ پوری
آٹھ دس جلدوں میں زبانِ بنگلہ میں عربی حروف میں چھپی ہوئی دیکھی ہے۔ پھر اس کے بعد سیاسی
انقلاب پیدا ہوا اور یہ بات سمجھ میں آگئی کہ اگر یہی لیل و نہار رہا تو یہ صوبہ بھی پنجاب کی طرح اردو کا مرکز
ہوکر رہ جائے گا۔ بنگالیوں نے زبان کی طرف اپنی توجہ منعطف کی تو پہلے زبان کو حتی الوسع عربی و
فارسی الفاظ سے پاک کیا اور اُس کی جگہ پر سنسکرت کے الفاظ بھرنے لگے اور تمام ملک ایسی کتابوں کی
تصانیف میں منہمک ہوگیا جس میں سنسکرت الفاظ کی بہتات تھی۔ سیکڑوں بجپ ناول بنگلہ زبان میں
لکھے جانے اور شائع ہونے لگے جن میں سنسکرت الفاظ بجائے عربی و فارسی کے بھرے تھے۔ اور
بذریعہ اِس اقتدار کے جو اُن کو ملک میں حاصل ہو چکا تھا نصاب مدارس ابتدائیہ میں داخل کئے گئے
جس میں اپنے مذہب اور کلچر کو پوری طرح واضح کیا تھا۔

چنانچہ اس پچاس برس کی سعی مسلسل میں زبان بنگلہ سر سے پیر تک بالکل بدل گئی۔ مسلمانوں کی غفلت
کا یہ عالم تھا کہ ٹکسٹ بک کمیٹی میں وہ کتابیں منظور کر الی جاتی تھیں جن میں کھلے الفاظ میں مذہبِ اسلام
پر حملے ہوتے تھے۔ باوجود اِس کے کہ اِس کے ممبر مسلمان بھی تھے لیکن اُن میں سے کون اس زحمت
کو گوارا کرتا کہ پہلے اِس کو ایک نظر دیکھتا اور رجماً بالغیب اِس کو منظور کر لیتے۔ کچھ دنوں کے بعد

ملک میں شورش پیدا ہوتی اور قتل و خونریزی کی نوبت آتی۔ چونکہ اصولاً ہر زبان کا لٹریچر اُس قوم پر حکومت کرتا ہے۔ تمام اِسی رنگ میں رنگ گئے اور ہند و بنگالیوں کا مسلمانوں پر سکہ بیٹھ گیا۔ اور مسلمانوں کے دلوں میں اِن کے تفوق کا احساس جاگزیں ہوگیا۔ کسی قوم کی ترقی کا یہی راز ہے کہ جب ایک قوم کے تفوق کا احساس دوسری قوم کے دل میں بیٹھ جاتا ہے تو وہ قوم دوسری قوم کے تمام اخلاق و اطوار و زبان کی پیروی کرتی ہے اور اُسی قوم کے سانچہ میں اپنے کو ڈھالنا چاہتی ہے۔

چنانچہ اسپین کے مسلمانوں نے قوم گال کی وضع اختیار کرنی شروع کی اور اپنے گھروں کو گال کے طریقہ سے آراستہ کرنے لگے تو وہاں کے حکما اور عقلا نے یہ حالت دیکھ کر پیشین گوئی کی اب یہ سلطنت چند روزہ مہمان ہے چنانچہ اُس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد اسپین پر عیسائیوں کا قبضہ ہوگیا۔

ہر زبان کی ترقی کے چند ذرائع ہیں جن میں اہم حکومت کی تائید ہے اگر حکومت اس کی ترقی کی موئد نہیں ہے تو اہلِ زبان کی اس کی اشاعت کی متحدہ کوشش ؟ جس زبان میں ضروریات زمانہ کے لحاظ سے تصانیف و تالیف بکثرت ہوں گی۔ نیز زبانوں سے تراجم کی بہتات ہوگی۔ جن سے ملک میں کارآمد فنون کی اشاعت ہو وہ زبان بہت سُرعت سے ملک میں رواج پائے گی۔

ملک حجاز جو عربی زبان کا گہوارہ تھا کبھی اشاعتِ زبان کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ حجاز نے قرآنِ پاک کی اشاعت پر جو تمام دُنیائے اسلام میں پھیلا ہوا ہے اور زبانِ قریش میں نازل ہوا، اکتفا کیا۔ یہ ایک حد تک صحیح ہے۔ جب تک دُنیا میں قرآنِ پاک باقی ہے زبانِ عربی فنا نہیں ہوسکتی۔ اِسی زبان کے تحفظ کے خیال سے قرآنِ پاک کا ترجمہ بغیر متن ناجائز اور معصیت قرار دیا گیا ہے۔

ترکوں نے اپنے عہد حکومت میں زبان عربی کی اشاعت کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ البتہ زبان ترکی نے بہت ترقی کی کہ وہ ایک مستقل علمی زبان ہوگئی لیکن مصر و شام میں عربوں نے زبان عربی کو موجودہ زمانہ کے لحاظ سے تمام علومِ یورپ کو عربی زبان میں ترجمہ کرکے بہت ترقی دی۔ موجودہ حالت میں مصر و شام کسی علم و فن کو سیکھنے کے لئے یورپ کا محتاج نہیں رہا۔ شاعری میں بھی مصریوں نے بہت کچھ تبدیلی کی اِس وقت مصر میں قومی ترقی اور ملکی ضرورتوں پر برابر نظمیں لکھی جارہی ہیں۔ اور وہ اب قدیم گل و بلبل و صحرانوردی کی مضمون آفرینی ختم ہوگئی اور قوم کو عمل و سعی کی رغبت دلانے اور قوم میں حریت کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے موثر نظمیں لکھی جارہی ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں اخبار نکل رہے ہیں۔ اِس میں شبہ نہیں کہ جس طرح اعضا میں تناسب اور خوبیٔ ساخت اور

حسن تقویم نظر کی جالب اور دل میں کشش پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح الفاظ کی شستگی اور وزن دل میں تاثیر اور جذبات میں ہیجان پیدا کرتا ہے۔ جس طرح زمانہ کے تغیر سے سیاسیات بدلتے ہیں۔ اسی طرح قوم کے رجحانات اور جذبات بھی بدلتے رہتے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں جو سیاسی کشمکش ہندوستان میں جاری ہے اِس اثر سے اب اُردو شاعری کا وہ رنگ باقی نہیں رہا جو ناسخ۔ آتش۔ ذوق۔ داغ اور ریاض کا تھا۔ مثلاً آج اُن اشعار کی کیا وقعت ہوگی جو آتش لکھتا ہے۔ ع

"میں وہ کشتہ ہوں جس کی بُو سے کتوں کا بدن بگڑا"

ناسخ کہتا ہے۔ ع

"کترتا ہے ہمارے دل کو تیرے ناک کا چوھا"

داغ کا شعر ہے ؎

حوروں کا انتظار کرے کون حشر تک — مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں

ریاض کہتے ہیں ؎

ہم بند کئے آنکھ تصور میں پڑے ہیں — اتنے میں کوئی چھم سے جو آجائے تو کیا ہو

اِن اشعار سے تحریک سعی عمل کے جذبات میں کیا ہیجان پیدا ہو سکتا ہے بلکہ بجائے اِس کے اکثر قلوب میں نفرت کی لہر دوڑ جائے گی۔ آج اقبال۔ اکبر۔ غالب اور حالی کے اشعار کی مُلک کو حاجت ہے۔ جیسے غالب نے غلامی کی جو تصویر کھینچی ہے اس سے زیادہ مکمل تصویر کیا ہو سکتی ہے غالب کہتا ہے ؎

مثال یہ میری کوشش کی ہے کہ مُرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

یا علامہ شمس العلماء مولانا شبلی مرحوم نے جو نظم سنہ ۱۲ء کی جنگ سے پیشتر لکھی تھی ؎

حرم کے سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مُرغانِ حرم کے آشیاں کب تک

زبان کی ترقی اسی صورت میں ہوتی ہے جب عام طور پر شعرا اپنے اشعار کو زمانہ کے رجحانات اور جذبات کے سانچہ میں ڈھالیں اور قوم میں اس زمانہ کے مفاد پر عمل وسعی کی تحریک پیدا کریں اور زبان کو بذریعہ شاعری قوم میں قابل قبول بنائیں۔

اس جگہ اُردو کی تدریجی ترقی کا ذکر ضروری ہے کہ کس طرح ہندی زبان ترقی کرکے اُردو کی

سارنگ سوکوی بھئے بھوپتی بھوانی سنگھ پارتھ سمان مہابھارت سوکرن گو
مارے دیکھی مغل تراب خاں تاہی تے کاہو اس نہ جانا کا ہونہ نے اچساری گو
باجی گرکیسی وعدابازی کری یہ تھی ہاتھا ہاتھ تے شہادت اتری گو

سمت ۱۵۰۰ و ۱۵؁ء میں عام طور پر ہندی بھاشا کا رواج شروع ہوگیا۔ اس تحقیق کیجائے معلوم ہوگا کہ ہندی لفظ کا پتہ سنسکرت کی قدیم تاریخوں میں ۔۔۔ ۔۔۔ وجود نہیں بلکہ ہندی بھاشا کا رواج شروع کہا جاتا ہے۔ ہندی زبان کا وجود ہند میں مسلمانوں کے آنے کے بعد سے شروع ہوا۔ اس وقت کی پراکرت جو رہی ہو، فارسی کی آمیزش سے ہندی کا وجود ہوا۔ اس کو ہندی شعرا ٹھیٹھ بولی یا ریختی کہتے تھے جو ہند کی مہذب جماعت کی بولی تھی جس کو ہندی بھاشا نثر کے موجد للولال جی نے "ریختی" کی بولی لکھا ہے۔ مشہور شاعر بھکاری داس جی نے اپنی کتاب "کاویہ نرنے" میں اسکے متعلق لکھا ہے۔

بھاشا برج بھاشا روچر کہے سومتی سب کوے
ملے سنسکرت پارسیو پے اتی پرگٹ جو ہوے

یعنی "برج بھاشا خوش آیند ہے۔ اس پر سب متفق ہیں۔ فارسی اور سنسکرت سے مل کر جو بنی ہے لیکن اس کو عام ہونی چاہیے"۔ اسی کے ثبوت میں بھکاری داس جی نے لکھا ہے کہ:

تلسی گنگا دو بھئے سوکوین کے سردار
اُن کی کاویتن میں ملی بھاشا ودھ پرکار

یعنی "تلسی داس اور گنگا داس بہترین شعرا کے سردار ہیں۔ اُن کی نظم کی زبان مخلوط ہے"۔

چونکہ فارسی زبان اور سنسکرت میں بہت مماثلت ہے فارسی کے بیشتر الفاظ سنسکرت میں مستعمل ہیں یا دونوں ایک ماخذ سے بنی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس لئے ہندی بھاشا کے مستند فصلا کی رائے ہے کہ ہندی بھاشا میں فارسی کا میل زبان ہندی کو خوش آیند اور شستہ بناتا ہے۔ اس لئے ہندی اشعار میں فارسی کی آمیزش بہتر ہے۔ ذیل کے چند فارسی الفاظ سے معلوم ہوگا کہ یہ الفاظ فارسی و سنسکرت میں مشترک ہیں۔ ایسے سیکڑوں الفاظ ہیں۔

فارسی	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
سنسکرت	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

اِس کے علاوہ فارسی مصادر میں علامت مصادر دَن۔ تَن نکال دیئے جائیں تو مادے بیشتر سنسکرت کے مصادر بیشتر باقی رہ جاتے ہیں۔ چیدن سے چی = چننا۔ دادن۔ دا = دینا۔ تپیدن۔ تپ = گرم ہونا۔ سنسکرت تاپ + زادن۔ زا = جننا۔ سنسکرت جا۔ ایسے سیکڑوں الفاظ ہیں۔

چونکہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ ہندوستان میں مختلف صوبوں کی مختلف زبانیں ہیں جو اپنی قدیم پراکرت سے بگڑ کر حاصل ہوئی ہیں۔ لیکن برج کے آس پاس کی زبان کو برج بھاشا کہتے ہیں اور اسی کا نام ہندی ہے۔ اور یہ ہندی مختلف زبانوں کی آمیزش سے بنی ہے۔ اِس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ ہندوستان میں عام طور پر سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ لہٰذا اِس پر غور کرنے کی حاجت ہے کہ اِس سے اُردو کیوں کر حاصل ہوئی۔

ہندوستان کی بیشتر زبانیں اِسی سے بنی ہیں، اِس کو اس طرح پر دیکھئے کہ اگر راجپوتانہ کی طرف بڑھئے تو بھرت پور کی بھاشا جے پور کی بھاشا اور برج بھاشا کے بیچ کی بھاشا معلوم ہوتی ہے۔ اِس کے آگے جے پور کی زبان۔ پھر جودھ پور۔ مارواڑی اِس سے اگر ملائیے تو گجراتی بہت ملتی جلتی ہے۔ اس طرف آگرہ کی زبان کچھ برج بھاشا کی طرف جھکتی ہوئی کھڑی بولی کہی جاتی ہے۔ دہلی میں اس کا اتنا تغیر ہوتا ہے کہ اس کا نام "اردوئے معلّٰی" ہو جاتا ہے۔ یہ کھڑی بولی بنارس تک تھوڑے تغیر کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ پھر بھوج پور شاہ آباد سے اس کا تغیر شروع ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ بھوج پوری بھاشا پرہتیا سے بدل کر میتھلی کی صورت میں آ جاتی ہے۔ میتھلی سے بنگلہ اور اڑیا کا تھوڑا تغیر ظاہر طور پر معلوم ہوتا ہے۔ بندیل کھنڈی اور بیسواری وغیرہ زبانوں میں جو افعال اور مصادر مستعمل ہوتے ہیں۔ ان کی برج بھاشا سے بہت کچھ مماثلت ہے۔ چنانچہ بنگلہ زبان ہندی بھاشا سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے۔ مثلاً

بنگلہ نظم :۔

آے رے چاند بر کونا
تو رے کھیتے دیبو پھولیر مدھو پرتے دیبو سونا
آتر دیبو شیشی بھرے گلاب دیبو کاربا کرے
آر آپنی سیجے باٹا بھرے دیبو پانیر دونا

ترجمہ۔ آؤ اے چاند کے ٹکڑے ——— تیرے کھانے کو پھول کا شہد دوں گی۔ اور بیٹھنے کو سونا۔ عطر دوں گی شیشی بھر کر گلاب دوں گی قرابہ کر کے اور آپ کے بستر پر بٹا بھر کر پان کا دونا دوں گی۔

چاند۔ کنا۔ کھیتے۔ عطر۔ شیشی۔ بھرے (بھر کر) گلاب۔ کاربا قرابہ۔ سیج۔ پان۔ مدھو (شہد)

دونا۔ یہ تمام الفاظ برج بھاشا میں مستعمل ہیں جن میں فارسی اور عربی ممزج ہے ۔ اسی مضمون کو ہندی شاعر کہہ رہا ہے :۔

بار بار جشومتی سوت بودھتی آوچند تو ہے لال بلاوے
مدھو میوا پکواں مٹھائی آپو کھائے پونی تو ہے کھواوے
ہاتھ ہی پر تو ہیں لینے کھیلے نیک نہیں دھرتی بٹھاوے

ان کے الفاظ سے بنگلہ اور برج بھاشا کا فرق ظاہر ہوگا کہ ان میں کتنا فرق ہے ۔ اسی برج بھاشا کو کچھ اور فارسی الفاظ کی ملاوٹ اور الفاظ کو شُستہ بنا دیجئے تو کھڑی بولی یا عام مروّج اُردو بنجاتی ہے جیسا کہ ہندی نثر کے جنم داتا للولال جی کوی لکھتے ہیں۔ مثلاً بنگلہ میں دیبو = دونگا۔ ہندی دیبے۔ دیوں ۔ دیت = ہٹیں ۔ دیونگا۔ دیت باٹریں۔ دہیل جالا۔

اسی قسم کے تصرفات افعال میں مختلف صوبوں میں مختلف ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً یہی لفظ "جناح" گجراتی زبان ہے جو اُردو میں جناح بن گیا۔ ورنہ یہ لفظ جینرا گجراتی ہے۔ جو برج بھاشا میں "جھینا" ہے جس کے معنی دُبلے یا باریک کے ہیں۔ یہی سنسکرت میں "کشیرنا" ہے۔ اب 'جھینا' اور 'جینرا' میں تلفظ کا فرق ہے ورنہ لفظ ایک ہی ہے۔

یہاں پر 'اُردو' کے متعلق اتنا ذکر کرنا ضروری ہے کہ 'اردو' کو مسلمانوں کی زبان اور 'ہندی' کو ہندوؤں کی زبان مان لینا ملک کی زبان مروج میں تعصب مذہبی پیدا کر کے رکاوٹ ڈالنا ہے جس سے ہند کے باہمی..... کاروبار میں سخت ابتری کا اندیشہ ہے۔ وہ زبان جو عام طور پر ہند میں مروج ہے جس کو 'اردو' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر لفظ اردو کے نام سے مسلمانوں کی زبان سمجھی جائے تو اس عقل و دانش پر نالۂ و فغاں کرنا چاہیئے کہ 'ہندی' جس کو ہندوؤں کی زبان کہا جاتا ہے، عربی نام ہے اور لفظ اردو ترکی ہے، نہ عربی ہے اور نہ فارسی جس کے معنی ترکی زبان میں فوج کے ہیں (دیکھو لسانِ عثمانی لغت ترکی) بجائے اس کے 'ہندی' خالص لفظ عربی ہے۔

کسی قدیم "سنسکرت کوشس" (لغت) یا قدیم تاریخ سنسکرت میں لفظ "ہند" موجود نہیں۔ اور نہ اِس زبان کا کوئی ذکر ہے۔ جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ ہندی بھاشا کا وجود کتابی صورت میں ۱۲۵۰ سمت سے پیشتر ملتا نہیں اور یہ زمانہ سلطان غوری کا ہے اور اُسی زمانہ سے اس زبان کا وجود ہوا جو مسلمانوں کا عہد تھا۔ ڈونڈی کوی نے ہند کی تمام پراکرتوں کا ذکر کیا ہے۔ اُن میں ہندی بھاشا کا کوئی ذکر نہیں۔ متاخرین نے البتہ ہندی زبان کے وجود کے بعد تحقیقات سے اِتنا شبہ بیان کیا ہے کہ۔۔۔

زبانیں ... ی شت ... رسی آب بھرنش پراکرت سے نکلی ہو جس کا اب وجود نہیں۔ قدیم فاضل ڈنڈی کوی
... شر آدرا سے کہ ست /

आभीरादिगिरः काव्येष्वपभ्रंश इति स्मृताः ।
शास्त्रे तु संस्कृतादन्यदपभ्रंशतयोदितम् ॥

ں یادو گرہ کاوئے شوپ بھرنش ای تی سمرتاہ
شاسترے تو سنسکرتا دنیہ دپ بھرنش تیودیتم

ترجمہ :۔ اہیروں ... کی زبان نظم اپ بھرنش کہی جاتی ہے۔ لیکن علوم ... جو زبان علاوہ سنسکرت
کے استعمال کی جائے ... اپ بھرنش یعنی مبتذل ہے۔

جب یہ ثابت ہے کہ ہندی بھاشا کا وجود مسلمانوں کے عہد سے پیشتر نہ تھا اور اس کا نام بھی عربی ہے تو اس اصول کے مطابق اس کو بھی مسلمانوں کی زبان سمجھنا چاہیئے۔ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ زبان ملک کی ہوتی ہے ... نہ مذہب کی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کی کوئی مخصوص زبان نہیں ہے۔ اسلام مذہب ہے اس کے ماننے والے مسلمان ہیں جو دنیا کے ہر حصہ میں تقریباً آباد ہیں۔ جس ملک میں جو مسلمان آباد ہے اُس ملک کی زبان کو جس طرح غیر مسلم بولتے ہیں مسلمان بھی بولتے ہیں۔ کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ بنگال میں بنگلہ ہندوؤں کی زبان ہے۔ ہر گز نہیں جس طرح بنگال کے ہندو کہتے ہیں کہ ہماری زبان بنگلہ ہے۔ اسی طرح مسلمان بھی کہتے ہیں کہ ہماری زبان بنگلہ ہے۔

خود زبانِ عربی جس میں قرآنِ پاک نازل ہوا ہے مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ عربی بولنے والے ملک کا بہت بڑا رقبہ ہے۔ جس میں ہندو۔ پارسی۔ عیسائی۔ یہودی وغیرہ اقوام آباد ہیں سب ہی عربی بولتے ہیں۔ مسلمانوں کی اگر کوئی زبان مخصوص ہوتی تو جب سے مسلمانوں کا وجود ہوا اس زبان کا وجود ہوتا حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

چین میں بڑا حصہ آباد مسلمانوں سے۔ کوئی کہہ سکتا ہے چینی زبان مسلمانوں کی ہے۔ یا بدھ مذہب کی ہے۔ عربی زبان مسلمانوں کی اس وجہ سے ہے کہ قرآنِ پاک عربی زبان میں ہے اور اس کی زبان بحیثیت معجزہ کے ہے۔ للذا زبان کا قائم رکھنا قرآن کی حیثیت کا بقا ہے بخلاف دیگر کتب سماویہ کے جیسے توریت، انجیل اور زبور وغیرہ کہ ان میں زبان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ترجمہ سے بھی کام چل سکتا ہے۔ یہ مسلم ہے کہ عرب کی زبان عربی ہے لیکن مسلمانوں سے پہلے بھی عربی زبان موجود تھی۔ للذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ

کاغذوں کے بعد حضرت اکبر کی یاد تازہ ہوئی۔ مثال مرحوم کے اسی سلسلہ کے دوسرے حسب حال اشعار ہماری ربان پر آئے۔ ملاحظہ ہوں ——— ——— (سیّد الطاف علی بریلوی)

دستِ بستہ پاشا ... دل فسردہ لب پہ مُہر — کچھ نہ کچھ کرتا ہے ہر اک اے خدا میں کیا کروں
یہ دلِ بیتاب مجھ کو کر رہا ہے کیوں تباہ — ہو گئی اک بات، تھا حکمِ قضا میں کیا کروں
نزع میں پیکِ اجل سے کہہ رہا تھا اک حسیں — تو قضا لایا ہے عمر بہ اب ادا میں کیا کروں
شکوۂ بیداد کرتا ہوں تو کہتا ہے فلک
خود بخود مجھ سے ٹپکتی ہے جفا، میں کیا کروں

دست و پا بستہ ہوں میں، ظاہر کوئی کنبہ کیا کروں — دوسروں کے بس میں ہوں فکرِ تمدّن کیا کروں
آگ برسانے لگی جب اس گلستاں کی ہوا — خواہشِ نشو و نمائے نخل و گلبن کیا کروں
مہربانی سے مجھے گودام کی کنجی تو دی!! — لیکن اب گیہوں نہیں باقی فقط گھُن کیا کروں
دیر میں کل گا رہی تھی اک زنِ زہرہ جبیں — جب، پیا، پانی ملے، مجھ کو تو اب چُن کیا کروں
عقل روتی ہے کہ یہ گتھی سلجھتی ہی نہیں
ہر گرہ لوہا بنی ہے مشکل ناخن کیا کروں

دل کو خود چھیڑے جو وہ ترچھی نظر تو کیا کروں — چین سے رہنے نہ دے دردِ جگر تو کیا کروں
جانتا ہوں میں کہ خواہش موت کی اچھی نہیں — زندگی بے لطف ہو جائے مگر تو کیا کروں
سینے سے پُرسوز آہیں اٹھتی ہیں لیکن نہیں — لب پر آ کر یہ جو نکلیں بے اثر تو کیا کروں
ہے خطا میری جو نکلے منہ سے لفظِ آرزو — آنکھ سے نکلے محبت کی نظر تو کیا کروں
دیر کیسا دل ہی میں کر لیتے ہیں یہ بت گزر
جلوہ گاہ اُن کا خدا ہی کا ہو گھر تو کیا کروں

"مجاہدینِ ہند"

مولوی جعفر تھانیسری و مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی

(بشکریہ جناب ابوالحسن علی صاحب ندوی مؤلف سیرت سید احمد شہیدؒ)

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے اور اُس کے بعد ہندوستان میں عظیم الشان تحریکِ جہاد اور اصلاح و تنظیم کا مرکز عظیم آباد پٹنہ اور اُس کا محلہ صادق پور تھا۔ سید احمد صاحب شہیدؒ نے سرحدی میدانِ جنگ سے دو بزرگوں مولانا سید محمد علی صاحب رام پوری اور مولانا ولایت علی صاحب عظیم آبادی کو تبلیغ و اصلاح کے لئے ہندوستان روانہ کیا تھا۔ مولانا ولایت علی صاحب ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۰ء میں حیدر آباد میں تھے کہ بالاکوٹ کے حادثہ کی اطلاع ہوئی۔ سید صاحب کے خلفاءِ عظام میں اب صرف آپ کا اور مولانا محمد علی صاحب کا دم باقی تھا۔ مولانا محمد علی صاحب مدراس میں تھے اور سارا بار آپ پر تھا۔ آپ نے پٹنہ آکر کام اپنے ہاتھ میں لیا اور اپنی مسیحا نفسی، روحانیت، تنظیمی قابلیت اور جد و جہد سے پژمردہ جسموں اور مُردہ دلوں میں رُوح پھونک دی۔ لوگوں سے از سرِ نو بیعت لی۔ بیت المال قائم کیا، مرکزی مساجد میں خطیب اور واعظ مقرر کئے۔ بنگال اور دوسرے صوبجات و اضلاع میں اپنے مبلغ بھیجے۔ قصبات و دیہات کی اصلاح و ہدایت کے لئے لوگ مقرر کئے۔ مجمعوں اور میلوں میں وعظ شروع کیا۔ گانوں گانوں۔ دیہات دیہات دورہ کیا۔

اکثر آپ کو اپنے مرکز و مقام میں پہونچنے میں مہینوں اور برسوں لگ جاتے۔ درس، تزکیہ، اصلاح و تربیت کے مشاغل سفر و حضر میں جاری رہتے۔ آپ کا مکان اور پورا محلہ ایک معمور درس گاہ، ایک آباد خانقاہ اور ایک عظیم تربیت گاہ تھی۔ اس تمام مدت میں اس مرکز کا تعلق سرحد کے مرکز سے قائم رہا اور وقتاً فوقتاً آپ کے اعزہ و تلامذہ وہاں کے کاموں میں شریک ہوتے رہے۔ دو مرتبہ آپ خود

تشریف لے گئے۔ اور ۱۲۶۹ھ میں وہیں انتقال فرمایا۔

آپ کے بعد اور آپ کی زندگی میں، آپ کی غیر موجودگی میں آپ کے جانشین واعزہ ــــ مولانا فرحت حسین صاحب۔ مولانا احمد اللہ صاحب اور مولانا یحییٰ علی صاحب نے پورے انہماک اور قابلیت سے یہ خدمات انجام دین اور ایک منظم سلطنت کی طرح اس نظام کو چلایا۔ یہ نظام اپنی وسعت و استحکام مبلغین کی سیرت، اخلاق اور جوش و ایثار میں ایک بے نظیر نظام تھا۔ اس کی مثال مسلمانوں کے واعظ ہند سے لے کر اس وقت تک ہم کو ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس کا کچھ اندازہ مندرجۂ ذیل اقتباسات سے ہوگا۔

اس جماعت و تحریک کا سب سے بڑا دشمن ڈاکٹر سر ولیم ہنٹر اپنی کتاب "مسلمانانِ ہند" میں لکھتا ہے :۔

"یہ لوگ مشنریوں کی طرح انتھک کام کرتے تھے۔ اور بے لوث و بے نفس لوگ تھے۔ جن کا طریق زندگی ہر شبہ سے بالاتر تھا اور روپیہ اور آدمی پہونچانے کی انتہائی قابلیت رکھتے تھے۔ ان کا کام محض تزکیۂ نفس اور اصلاح مذہب تھا۔

"میرے لئے ناممکن ہے کہ میں عزت و عظمت کے بغیر اُن کا ذکر کروں۔ ان میں سے اکثر نہایت مقدس و مستعد نوجوانوں کی طرح زندگی شروع کرتے تھے۔ اور ان میں سے بہت سے اخیر تک مذہب کے لئے اپنی جانفشانی اور جوش قائم رکھتے تھے"

"جہاں تک مجھے تجربہ ہے، یقینی ہے کہ وہابی مبلغین سب سے بڑے روحانی اور کم سے کم خود غرض نوع کے لوگ ہیں"

مولانا یحییٰ علی صاحب عظیم آبادی کے متعلق لکھتا ہے :۔

"امیر جماعت یحییٰ علی کے مختلف فرائض تھے۔ وہ ہندوستان میں فرقہ کے روحانی رہنما کی حیثیت سے تمام جماعتی مبلغیں سے خط و کتابت رکھتے تھے اور انھوں نے ایک اصطلاحی زبان میں چند مبہم عبارتیں ترتیب دی تھیں جن کو وہ خود استعمال کرتے تھے اور جن کے ذریعہ وہ اطمینان سے بڑی بڑی رقمیں سلطنت کے مرکز سے سرحد پار باغیوں کے کیمپ (ستھانہ) بھیجتے تھے۔ وہ مسجدوں میں وعظ و تقریر کرتے اور مذہبی دیوانوں کی فوج کو بند و قیں جانچ کر بھیجتے۔ طلبا کو روحانی اور دینی درس و تعلیم دیتے اور انھوں نے اپنے ذاتی مطالعہ عربی کے علماء و مصنفین سے اعلیٰ واقفیت پیدا کر لی تھی۔

لیکن اس سازش کا سب سے زیادہ نازک کام پٹنہ یا بالفاظ خود "چھوٹی خانقاہ" سے سرحد پار باغیوں کے مرکز "بڑی خانقاہ" کو رنگروٹ بھیجنا تھا۔ بنگالی متبعین کو راستہ میں صدہا سبلے سکے اور پریشان کن

سوالات کا جواب دینا پڑتا تھا۔ اس کو پنجاب اور شمال مغربی ہندوستان کے وسیع صوبوں میں سے ہو کر تقریباً دو ہزار میل کا سفر طے کرنا ہوتا تھا۔ جہاں ہر گانوں میں اس کی جسمانی شکل اور زبان اس کو اجنبی ثابت کرتی تھی۔ اس خطرناک کام میں یحییٰ علی کی ذہانت اور انتظامی قابلیت کام کر رہی تھی۔ انھوں نے تمام راستہ پر اپنے وہابی پیرو متعین کر دئے تھے جو جماعت کے معتبر اشخاص کے ماتحت تھے۔ یحییٰ علی کی مردم شناسی اور حسن انتخاب قابل داد ہے کہ ان کے انتخاب کئے ہوئے آدمیوں میں سے ایک شخص کو بھی پکڑے جانے کا خوف و خطرہ، شناخت ہو جانا، انعام کا لالچ اپنے رہنماؤں اور پیشواؤں کے خلاف آمادہ نہ کر سکا۔"

اس تنظیم کی وسعت اور جماعت کی سیرت کے متعلق بنگال کے کمشنر پولس کی یہ شہادت پڑھنی چاہئے :۔

"اس جماعت کے ایک ایک مبلغ کے پیرو اسی اسی ہزار ہیں جن میں آپس میں مکمل مساوات ہے۔ جن میں ہر ایک دوسرے کے کام کو اپنا ذاتی کام سمجھتا ہے اور مصیبت کے وقت کسی بھائی کی مدد میں اس کو کسی بات سے عذر نہیں ہوتا۔"(۱)

"مشرقی بنگال میں ہر ضلع بغاوت کے رنگ میں رنگ گیا تھا اور پٹنہ سے سمندر تک گنگا کے تمام راستہ میں مسلمان کپتان باغیوں کے مرکز کے لئے ہفتہ وار امداد دیتے تھے۔"

اس تحریک و تبلیغ سے عام مسلمانوں میں جہاد کا جو جذبہ اور ولولہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس کی مثال کم ہی کم ہندوستان میں اس سے پہلے اور اس کے بعد نہیں ملتی، ڈاکٹر ہنٹر لکھتا ہے :۔

صوبۂ متحدہ کے ایک انگریز کارخانہ دار نیل کا بیان ہے کہ اس کے دین دار مسلمان ملازم اپنی تنخواہ یا مزدوری کا ایک جز مستحقانہ کیمپ کے لئے علٰحدہ کر کے رکھ لیتے تھے، جو لوگ زیادہ جری تھے وہ تھوڑے بہت زمانہ کے لئے ستھانہ جا کر خدمت کرتے تھے۔ جس طرح ہندو ملازم اپنے بزرگوں (پرکھوں) کے شرادھ کے لئے چھٹی مانگتے تھے۔ اسی طرح مسلمان ملازم یہ کہہ کر چند ماہ کی رخصت لیتے تھے کہ انھیں فریضۂ جہاد ادا کرنے کے لئے مجاہدین کے ساتھ شریک ہونا ہے۔"

کوئی وہابی باپ اپنے کسی غیر معمولی دین دار بیٹے کے متعلق نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کس وقت (جہاد کے لئے) اس کے گھر سے غائب ہو جائے۔"

مسٹر جیمس اوکینلی لکھتا ہے :۔

"کمزور و بزدل بنگالی مسلمان، خونخواری اور جوش جہاد میں افغانوں سے کم نہ تھے۔"

جماعت کے نظام کا حال مندرجۂ ذیل اقتباسات سے معلوم ہوگا [illegible] ایک

---

(۱) "مسلمانان ہند" ڈاکٹر ہنٹر [illegible]

رکن کے متعلق لکھتا ہے :-

"اس کا تحصیل عشر و زکوٰۃ کا طریقہ بہت سادہ اور مکمل تھا۔ اس نے مالگزاری کی حیثیت سے متعدد گاؤں مجموعوں میں تقسیم کر دئے تھے۔ ہر مجموعہ پر ایک خاص محصل مقرر تھا۔ یہ افسر اپنی جگہ پر ہر دیہات کے لئے ایک تحصیلدار مقرر کرتا تھا۔ آئی ہوئی رقموں کو وہ جانچتا اور ضلع کے مرکز کو بھیج دیتا، قانوناً ہر دیہات میں ایک محصل مقرر تھا لیکن جن دیہاتوں میں آبادی زیادہ ہوتی تھی وہاں اس کام کے لئے ایک عملہ رکھنا پڑتا تھا۔ جن میں کچھ دین کے سردار ہوتے تھے جو نماز پڑھاتے تھے اور چندہ وصول کرتے تھے کچھ عام منتظم دنیا کے سردار ہوتے تھے جو جماعت کے دُنیاوی امور کا انتظام کرتے تھے اور ایک افسر جو خطرناک خطوط اور بغاوت کے پیغامات بھیجا جاتا تھا۔"

حکومت برطانیہ کی مخالفت سید صاحب کی تحریک ایک مستقل جہاد و اصلاح کی تحریک تھی۔ ناگزیر حالات کی بنا پر اس کا رُخ ابتدا میں سکھوں کی طرف تھا۔ لیکن اس کے مکمل پروگرام کا علم جماعت کے مخصوص لوگوں کو تھا جن کی اسلامی غیرت و فراست ایک صوبہ میں غیر اسلامی اقتدار گوارا نہ کر سکی۔ وہ اس کو پورے ملک میں کس طرح گوارا کر سکتی تھی۔ لیکن ہر صاحب بصیرت کہے گا کہ واقعات و اقدامات کی یہی طبعی اور مناسب ترتیب تھی جو ظہور میں آئی۔

کپتان کننگھم "تاریخ سکھ" میں لکھتا ہے :-

"سید احمد صاحب کے عمل سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کافروں سے اُن کی مراد صرف سکھ تھے، لیکن ان کے صحیح مقاصد پورے طور پر بس سمجھے گئے۔ وہ انگریزوں پر حملہ کرنے میں ضرور محتاط تھے لیکن ایک وسیع اور آباد ملک پر ایک دور دراز کی قوم کا اقتدار ان کی مخالفت کے لئے کافی سبب تھا۔"

انگریزوں نے جب پنجاب فتح کیا تو مجاہدین کا رُخ اُن کی طرف پھر گیا۔ مولانا ولایت علی صاحب اور اُن کی جماعت نے حالات کے تغیر اور خطرہ کا احساس کیا اور شروع سے اپنے دائرۂ عمل کو وسیع رکھا۔

ہنٹر لکھتا ہے :-

"مجاہدین کی ضرب سکھوں کے دیہاتوں پر سے پڑتی تھی۔ لیکن وہ انگریز کافروں پر ضرب لگانے کے ہر موقع کا بڑی خوشی سے خیر مقدم کرتے تھے۔ انھوں نے کابل کی جنگ میں ہمارے دشمنوں کی مدد کے لئے ایک بڑی قیمت بھیجی۔ اور اُن میں سے ہر ایک ہمارے مقابلہ میں موت تک جمے رہے۔ صرف غزنی کے سقوط میں انکے تین سو آدمیوں نے انگریزی سنگینوں سے شہادت کی خوشی حاصل کی"

"پنجاب کے الحاق کے بعد جو حصہ پہلے سکھوں پر اُترتا تھا۔ اب اُن کے جانشینوں (انگریزوں) پر اُترنے لگا۔"

ہندوستانی مجاہدین کے متعلق ہنٹر لکھتا ہے کہ:-

"ان کی تعلیم تھی کہ غیر اسلامی اقتدار کے ماتحت مسلمانوں کو زندگی گزارنے کی شرعاً اجازت نہیں۔ جہاں غیر مسلم کی حکومت ہو۔ وہاں صرف دو صورتیں ہیں یا اگر قدرت ہو تو جہاد ورنہ ہجرت، اس کے سوا کوئی صورت نہیں۔"

ڈاکٹر ہنٹر کا بیان ہے (جس سے اس کی ساری کتاب رنگی ہوئی ہے) کہ جماعت کے مبلغین اور پٹنہ کے پیشوا حکومت ہند کے خلاف علانیہ تبلیغ جہاد کرتے تھے۔

حکومت ہند کے انتظامات

ڈاکٹر ہنٹر لکھتا ہے۔

"۱۸۴۹ء میں سر ہنری لارنس نے یہ کارروائی تجویز کی کہ مولانا ولایت علی و عنایت علی جو پنجاب میں "غازی دین" اور "مجاہد اسلام" کے لقب سے مشہور ہیں۔ ان کو اپنے مکانوں میں نظر بند رکھا جائے پٹنہ کے مجسٹریٹ نے ان سے ضمانت لی اور اس کے بعد بہت سے دولت مند ارکان سے بھی "نیک چلنی" کے مچلکے لئے۔ لیکن ۱۸۵۰ء میں ان کو جنوبی بنگال کے ضلع راج شاہی میں بغاوت کی تبلیغ کرتے ہوئے پایا جاتا ہے۔ جہاں ان سے حفظ امن کے لئے ضمانتیں لی گئیں۔ دوبارہ تبلیغ کرنے کی وجہ سے ان کا دو مرتبہ ضلع سے اخراج ہوا۔

۱۸۵۱ء میں سید صاحب کے یہی خلفاء جو اپنے شہر میں نظر بند تھے۔ سرحد پر بغاوت پھیلانے کی تبلیغ کرتے ہوئے پٹنہ میں پائے گئے۔ ۱۸۵۲ء میں ان کو اپنی تجویز میں بہت کچھ کامیابی ہوئی۔ آدمی اور روپیہ ستھانہ کیمپ کثرت سے بھیجے گئے۔ اور پنجاب کے حکام نے ہماری فوجوں سے ان کی ایک باغیانہ خط و کتابت پکڑ لی۔ ان کے پیشواؤں نے ہماری چوتھی فوج سے ساز باز کرنے کی بڑی مشاقی سے کوشش کی جو راولپنڈی میں باغیوں کے کیمپ سے بہت قریب ٹھہری ہوئی تھی اور اس رجمنٹ کا جز تھی جو ہمارے صوبہ پر حملہ کرنے کی وجہ سے ان کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے بھیجی گئی تھی۔

خطوط سے ثابت ہوتا تھا کہ بنگال سے باغیوں کے کیمپ کو آدمی اور اسلحہ بھیجنے کے لئے ایک باقاعدہ ادارہ قائم ہے۔ اسی زمانہ ۱۹ اگست ۱۸۵۲ء میں پٹنہ کے مجسٹریٹ نے رپورٹ کی کہ باغی جماعت اور باغیانہ خیالات ترقی پر ہیں۔ انگریزی صوبہ کے اس دار السلطنت (پٹنہ) کے خاص باشندے علانیہ بغاوت کی تبلیغ کرتے ہیں پولیس بھی ان سے ملی ہوئی ہے اور اُن کے ایک سردار (مولوی احمد اللہ صاحب) نے اپنے مکان میں سات سَو آدمیوں کے ایک جلسہ میں اعلان کیا کہ اگر مجسٹریٹ کی طرف سے مزید خانہ تلاشی ہوئی تو وہ ہتھیاروں کو مقابلہ کریں گے۔ حکومت برطانیہ اب زیادہ دنوں تک اپنے علاقہ میں ایک باغیانہ ادارہ کی طرف سے چشم پوشی نہیں کر سکتی تھی۔ ۱۸۵۳ء کی فصل خزاں میں لارڈ ڈلہوزی نے دو اہم کارروائیاں تجویز کیں۔ انہوں نے اندرونی ادارہ کی پوری نگرانی اور ان سرحدی قبائل کے خلاف جو بھیجنے کی اجازت دی [illegible]

نفرت کو ہندوستانی مجنونوں نے ہوا دیکر مشتعل کر دیا تھا۔ اِسی سال اُنھوں نے ہمارے حلیف امب کی ریئس پر حملہ کیا اور ہم کو ایک برطانوی فوج اُس کی امداد کے لئے بھیجنی پڑی ۱۸۵۳ء میں ہمارے متعدد دیسی سپاہی باغیوں سے خط و کتابت کرنے کے جرم میں ماخوذ ہوئے۔

حکومت کا جارحانہ اقدام اور ۱۸۵۰ء و ۱۸۶۰ء کی سرحدی جنگیں

۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۷ء کے درمیان سرحدی خلفشار کی وجہ سے ہم کو اپنی علیحدہ علیحدہ سولہ ۱۶ مہمیں بھیجنی پڑیں جس میں ۳۳ ہزار باقاعدہ سپاہی تھے اور ۱۸۵۸ء اور ۱۸۶۳ء کے درمیان علیحدہ علیحدہ مہموں کی تعداد بیس ۲۰ کو پہونچ گئی جن میں بے قاعدہ مددگاروں اور پولس کے علاوہ ساٹھ ہزار باقاعدہ سپاہی تھے۔ اس دوران میں ستھانہ کیمپ مسجد میں وہابی تعصب اور مذہبی اشتعال کے باوجود عاقلانہ طریقہ پر ہماری فوجوں سے براہ راست اُلجھنے سے مجتنب رہا۔ وہ ہوشیاری کے ساتھ ہمارے خلاف قبائل کی امداد کرتا رہا اور اُن کو اشتعال دلاتا رہا۔ لیکن ان لوگوں کو اپنے حساب پر ہم سے جنگ کرنے کی جرأت نہ ہوئی ۱۸۵۸ء میں اُنھوں نے علانیہ ہم سے جنگ چھیڑی اور اپنی دیدہ دلیری سے ہم سے جزیہ کا مطالبہ کیا۔ مطالبہ نامنظور ہونے کے بعد وہ دلیرانہ ہمارے علاقہ پر اُتر آئے۔ اور اُنھوں نے لفٹنٹ ہارن کے کیمپ پر ایک شبخون مارا۔

۱۸ اکتوبر ۱۸۶۳ء کو ایک برطانوی فوج سات ہزار سپاہیوں کی سر نیول چیمبرلین کی قیادت میں سرحد کو روانہ ہوئی۔ علاقہ میں پہونچ کر جنرل کو معلوم ہوا کہ قبائل حریف سے مل گئے ہیں۔ حکومت پنجاب کے نام پریشانی میں تار پر تار آ رہے تھے کہ امداد اور مزید امداد فوراً بھیجی جائے۔ فیروز پور، سیالکوٹ اور لاہور کے دستے فوراً روانہ کئے گئے۔ دو ہفتہ کے اندر اندر پنجاب کی چھاؤنیاں اس طرح فوجوں سے خالی ہوگئیں کہ میاں میر کا افسر کمانڈنگ بڑی مشکل سے لفٹنٹ گورنر کے لئے چوبیس ۲۴ آدمیوں کا محافظ دستہ بہم پہونچا سکا۔ ۴ نومبر کو حکومت پنجاب کو ہراول کا ایک دستہ والسرائے کے کیمپ سے مستعار لینا پڑا۔ اور ایک دوسری پلٹن پولس سوار اور پیادہ مواصلات (رسل و رسائل) کی حفاظت کے لئے بھیجے گئے۔ ۱۴ نومبر کو حالات اور زیادہ نازک ہوگئے اور کمانڈر انچیف آف برٹش فورسز لاہور آئے اور خود انتظام اپنے ہاتھ میں لیا۔ حکومت پنجاب نے پندرہ سو کا ایڈیشنل بریگیڈ بھیجے جانے کی درخواست کی۔ جنرل چیمبرلین کے تار نے اور ڈرا دیا۔

۱۸ نومبر کو دشمن نے حملہ کیا۔ انگریزی فوج کو پسپا ہونا پڑا۔ ایک سو دو آدمی ہلاک ہوئے اور دوسری مرتبہ پھر دشمن نے حملہ کیا جس میں جنرل چیمبرلین خطرناک طور پر زخمی ہوئے اور افسروں کے علاوہ ایک سو انتالیس آدمی ہلاک ہوئے اور ۲۰ نومبر کو (۵۲۲) بیمار اور زخمی بھیجے گئے۔ کل (۸۴۷) انگریزی سپاہی زخمی اور ہلاک ہوئے۔ آخرکار حکومت پنجاب اپنی فوجوں کو واپس بلا لینے پر راضی ہوگئی۔"

لیکن یہاں بھی وہی تدبیر کارگر ہوئی جو مسلمانوں کے مقابلہ میں کم خطا جاتی ہے۔ انگریز حکام اور مدبروں نے قبائل کو توڑلیا اور مجاہدین تنہا رہ گئے۔ ڈاکٹر ہنٹر نے اس موقع پر یہ فخریہ الفاظ لکھے ہیں:۔

"جو کام ہمارے ہتھیار نہ کرسکے وہ ہماری ڈپلومیسی نے کرلیا"

لیکن بہر حال یہ تجربہ بہت تلخ ثابت ہوا اور بقول ڈاکٹر ہنٹر:۔

"یہ مقابلہ ہم کو بہت گراں پڑا"

۱۸۶۸ء میں پھر چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی۔ ۸ ستمبر کو حکومت ہند نے اس کے مقابلہ کے لئے فوجی قوت بھیجی۔ ۳۰ اکتوبر کو کمانڈر انچیف کے زیر ہدایت اور جنرل وائلڈ سی۔ بی کے زیر قیادت فوجیں روانہ ہوئیں۔ جولائی میں پنجاب گورنمنٹ نے ارجنٹ تار بھیجا کہ طوفان کھڑا ہوگیا اور خطرہ سر پر ہے۔ فوری امداد کی سخت ضرورت ہے۔ سرحد پر فوجیں دوچند کردی گئیں۔ لیکن متوقع خطرہ پیش نہ آیا۔ مگر انگریزی فوجیں مخالف کے قلب تک نہ پہونچ سکیں اور پنجاب گورنمنٹ کو افسوس رہا کہ یہ مہم ختم ہوگئی اور ہندوستان کے مذہبی مجنون نہ تو نکالے جاسکے اور نہ ہم انھیں مطیع کرکے اُن کے گھروں کو ہندوستان واپس کرسکے۔ (۱)

مقدمۂ سازش ۱۸۶۴ء

حکومت کو اپنی متعدد شکستوں، زیر باری اور بدنامی سے سخت جھنجلاہٹ تھی۔ اس نے اپنا یہ غصہ ہندوستان کے اُن رؤساء و شرفاء پر اُتارا جن کا کچھ بھی تعلق سرحد کے مرکز یا اس تحریک سے ثابت ہوا اور اُن سے انتقام کے جوش میں قانون بالائے طاق رکھدیا۔ ۱۸۶۴ء میں اس نے آٹھ آدمیوں مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری رئیس تھانیسر۔ مولانا یحییٰ علی صاحب عظیم آبادی۔ مولانا عبد الرحیم صاحب عظیم آبادی۔ محمد شفیع سوداگر و رئیس لاہور ان کے بعض کارندوں قاضی میاں جان اور بعد میں مولانا احمد اللہ صاحب رئیس پٹنہ عظیم آباد پر سازش کا مقدمہ چلایا اور ان کو پھانسی کی سزا دی پھر ایک عجیب وغریب نکتہ سے پھانسی کی سزا منسوخ کرکے حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا دی کتاب "تواریخ عجیب" یا "کالا پانی" (آپ بیتی مولانا جعفر تھانیسری) کے چند اقتباسات درج کئے جاتے ہیں۔ جن سے حکومت کا غصہ اور اُن حضرات کی استقامت معلوم ہوگی۔

پارسن صاحب ہم تینوں آدمیوں کو ساتھ لے کر خوشی خوشی سوار ای شکرم دہلی کو روانہ ہوا شکرم میں سوار کرنے سے پہلے مجھکو بیڑی ہتھکڑی۔ طوق پہنا کر اور طوق میں بطور باگ ایک زنجیر ڈال کر اور اس کا سرا ایک مسلح سپاہی پولس کے ہاتھوں میں دے کر اس کو میرے پیچھے بٹھایا اور پارسن صاحب اور ایک دوسرا انسپکٹر پولس داہنے بائیں بھرے ہوئے طمنچوں کی جوڑیاں لے کر میرے بدن سے بدن ملا کر بیٹھ گئے۔ اس کے سوا پارسن تھا بار بار مجھکو راہ میں کہتا ہو آتا تھا کہ اگر تم ذرا بھی حرکت کروگے تو میں اسی طمنچہ سے تم کو ماردوں گا۔ علی گڑھ تک

چل کر دہلی تک کھانا پینا تو درکنار کسی سخت ضروری حاجت کے واسطے بھی ہم نہ اُتارے گئے۔ جب نماز
کا وقت آتا تھا تو میں بلا طلب و اجازت تیمم کرکے بیٹھے بیٹھے اشاروں سے نماز پڑھ لیتا تھا اور گاڑی
بدستور چلی جاتی تھی اور وہ چپ چاپ میری نماز کا تماشا دیکھا کرتے تھے۔ آخر بصد مصیبت اس حال سے
لوہے میں جکڑے ہوئے ہم دہلی میں داخل ہوئے۔ جہاں سے جاکر زیر بنگلہ ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولس
دہلی کے ہم کو ایک تہہ خانے میں زندہ درگور بند کر دیا۔ دوسرے دن دہلی سے کرنال اور پھر کرنال سے انبالہ
ہم کو لے گئے۔ جب ہم انبالہ میں پہونچے بہت رات جا چکی تھی۔ اسی طرح بے آب و دانہ ہم تینوں آدمیوں کو علیحدہ
علیحدہ پھانسی گھروں میں بند کر دیا۔ جہاں ہم شروع اپریل تک برابر بند رہے۔ دوسرے دن فجر کے وقت پارسن صاحب
سپرنٹنڈنٹ اور میجر ونکفیل صاحب ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولس اور کپتان طامی صاحب ڈپٹی کمشنر انبالہ مثل
یاجوج ماجوج کے میری کوٹھی میں آئے اور مجھ سے کہا کہ تم اس مقدمہ کا سب حال بتلا دو تمہارے واسطے
بہت بہتر ہوگا۔ میں نے کہا میں کچھ نہیں جانتا۔ اُس وقت پارسن صاحب نے مجھ کو پہلے بہت دھمکایا اور پھر مارنا
شروع کیا۔ جب میری مار حد کو پہونچی اور میں گر پڑا تو طامی صاحب اور ونکفیل صاحب کوٹھری کے باہر کھڑے
ہوگئے اور جب اس قدر مار پر بھی میں نے کچھ نہ بتلایا تو وہ سب کے سب اُس دن مایوس ہوکر چلے گئے۔ میں نے
جب یہ کیفیت ظلم و تعدی کی دیکھی تو مجھکو یقین ہوگیا کہ اب مجھکو یہ لوگ زندہ نہ چھوڑیں گے۔ میرے ذمہ کچھ رمضان
کے روزے باقی تھے۔ دوسرے دن سے میں نے اُن کی قضا رکھنی شروع کر دی۔

دوسرے دن جب میں روزہ سے تھا علی الصباح پارسن صاحب پھر آیا اور وہی کارروائی شروع کری
مگر تمہاری زد و کوب کے بعد مجھ کو اپنی بگھی میں بٹھلا کر طامی صاحب ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر لے گیا۔ جہاں پر وہ دونوں
صاحب یعنی طامی صاحب اور میجر ونکفیل صاحب بھی موجود تھے۔ اُس دن اُنھوں نے میری بڑی چاپلوسی کی اور
کہا کہ ہم تحریری عہد کرتے ہیں کہ اگر تم دوسرے شرکا اور معاونین جہاد کو بتلا دو تو تم کو سرکاری گواہ کرکے رہا
کر دینے کے سوا بڑا عہدہ بھی دلویں گے اور بصورت نہ بتلانے کے تم کو پھانسی ہوگی۔ میں نے اس چاپلوسی
پر بھی انکار کیا تو پھر پارسن صاحب ان دونوں سے انگریزی میں کچھ باتیں کرکے مجھ کو ایک الگ کمرے میں
لے گیا۔ جہاں لے جاکر پھر مارنا شروع کیا۔

میں کہاں تک لکھوں، آٹھ بجے فجر سے آٹھ بجے رات تک مجھ پر اس قدر مار پیٹ ہوئی کہ شاید کسی پر
ہوئی ہو۔ لیکن بفضل الٰہی میں سب سہار گیا۔ مگر اپنے رب سے ہر دم یہ دعا کرتا جاتا تھا کہ اے رب یہی وقت
امتحان کا ہے تو مجھ کو اس وقت ثابت قدم رکھیو۔ جب وہ پورے مایوس ہو گئے تو لاچار بعد آٹھ بجے رات کے
الحمد کو جیل خانہ کو واپس بھیج دیا۔ میں تمام دن روزہ سے تھا، بنگلہ سے باہر نکل کر درخت کے پتوں سے روزہ

افطار کر لیا اور جیل میں پہونچ کر جو میرے حصّہ کا کھانا رکھا تھا اُس کو کھا کر شکرِ الٰہی کر کے سو رہا۔ جس دن میں تنائی صاحب کے بنگلہ پر اِس مار پیٹ کی لذّت بنگلہ کے اندر اُٹھا رہا تھا۔ اُس وقت منشی حیدر علی صاحب تھانیسری تحصیلدار نرائن گڑھ صرف اِس قصور پر کہ اُس نے میری گرفتاری سے چند برس پہلے اپنے کسی دُنیاوی معاملے میں مجھ کو ایک خط لکھا تھا اور بعض عملۂ کچہری نے جو اِس کے دشمن تھے اس خط کے معنی غلط بیان کر دئے تھے۔ جس پر وہ غریب معزز عہدہ دار معطل ہو کر باہر برآمدہ میں غمگین بیٹھا تھا۔ میں اِس کا غمگین چہرہ دیکھ کر اپنی تکلیف بھول گیا اور یہ خیال دل میں آیا کہ مجھ منحوس نالائق کو فقط ایک خط لکھنے پر یہ بے چارہ بے گناہ بھی پکڑا گیا۔ اگر اِس کے بدلے بھی مجھ کو ہی سزا ہو جائے اور یہ رہا ہو جائے تو بہت بہتر ہے۔ میں اپنی اس حالتِ زار میں اُس کے واسطے بہت دعا کرتا رہا۔ فضلِ الٰہی سے وہ ناکردہ گناہ آخر بری ہو کر پھر اپنے عہدہ پر بحال ہو گیا اور اب تک اوّل درجہ کا عہدہ دار ۔ پنجاب میں ہے۔ اُس تاریخ کے بعد پھر مجھ کو کبھی گواہ شاہد ہونے کی ترغیب نہیں دی گئی۔"

"دسمبر سے اپریل تک یہ سب دار و گیر ہو کر ماہ اپریل مجسٹریٹی ضلع انبالہ میں یہ مقدمہ پیش ہوا اور ہم سب لوگوں کو پھانسی گھروں سے نکال کر کچہری میں لے گئے۔ اُس وقت معلوم ہوا کہ میرا حقیقی بھائی محمد سعید میرے اوپر اور محمد رفیع حقیقی بھائی محمد شفیع کا اس کے اوپر پھانسی کی دھمکی سے گواہ ہو گئے اور اسی کارروائی سے پچاس ساٹھ آدمی جن میں اکثر مولوی مُلّاں تھے ہمارے اوپر گواہ بنائے گئے لیکن اکثر گواہ گواہی دیتے وقت بھی ہماری طرف دیکھ کر زار زار روتے جاتے تھے مگر بے بس۔ اگر گواہی نہ دیویں تو قطع نظر مار پیٹ کے پھانسی کا سامنا تھا اور یہ سب گواہ تاادائے شہادت مثلِ کسی سنگین قتل قیدیوں کے زیر حراست پولس رکھے گئے تھے اور پولس ہی سے ان کو عمدہ خوراک اور لباس ملتا تھا۔ چنانچہ لاکھوں روپیہ سرکار کا ان بیجا کارروائیوں پر صرف ہو گیا اور مار پیٹ کی تو یہ حالت تھی کہ عباس نام ایک لڑکا جو مدّت تک میرے گھر میں رہ کر پرورش پایا تھا جب مجسٹریٹی میں گواہی دیتے وقت مجھ کو دیکھ کر مارے محبت کے جھوٹا اور آموختہ بیان میرے اوپر کرنے سے ہچکچایا تو اُسی روز رات کو اُس کو ایسی سخت سزا دی گئی کہ وہ بچہ اُسی صدمہ سے قبل انفصالِ مقدمہ سشن کے مر گیا۔ مگر رفع بدنامی کے واسطے پارسن صاحب نے اُس کا مرنا کسی مرض سے مشہور کر دیا۔

جس دن ہم اوّل روز مجسٹریٹی میں حاضر کئے گئے تو میرا بھائی بھی بزمرۂ گواہان زیر حراست پولس تھا اُس نے مجھ کو بذریعہ ایک سپاہی پولس کے یہ خبر بھیج دی کہ مجھ کو پولس نے مار پیٹ کر تمہارے اوپر گواہ بنا لیا ہے، سو اب جس وقت برسرِ اجلاس میرے اظہار تحریر ہوں گے تو میں اپنے اس بیان سے جو مار پیٹ کر لکھایا ہے پھر جاؤں گا۔ اُس کے جواب میں میں نے اُس کو کہلا بھیجا کہ میری قید اور رہائی کچھ تمہارے بیان پر موقوف نہیں ہے خدا کے

ہاتھ میں ہے۔ اگر تمہارا اظہار بحلف ہوا ہے تو اُس سے پھر جانے پر بجرم دروغ حلفی تم کو سزائے سخت ہو جائیگی۔ میں تو پہلے سے پھنسا ہوا ہوں۔ تمہارے پھنس جانے سے والدہ ضعیفہ صدمہ کھا کر ہلاک ہو جائے گی۔ اسواسطے بہتر ہے کہ جو تم نے پہلے لکھایا ہے وہی اب بھی بیان کرو۔

لیکن بایں ہمہ جب اُس کا اظہار میرے سامنے ہونے لگا تو وہ پہلے اظہار سے منکر ہوگیا۔ صاحب لوگ برسر اجلاس اُس کا انکار سنکر اوّل تو بڑے خفتے ہوئے مگر بوجہ اُس کی صغر سنی کے اُس کو کچھ سزا نہ دے سکے، اِس کا نام گواہوں سے کاٹ کر اُس کو نکال دیا۔ کثرت گواہوں کے سبب سے ایک ہفتہ تک فقط یہی مقدمہ کچہری مجسٹریٹی میں پیش ہوتا رہا۔ صاحب لوگوں کا تعصب ہم لوگوں سے یہاں تک تھا کہ جب بروقت درپیشی مقدمہ کے ہم نے یہ درخواست کی کہ ہماری نماز کا وقت آگیا ہے ہم کو نماز پڑھنے کی اجازت بخشی جائے، تو یہ اجازت بھی ہم کو نہ دی گئی مگر وہ ہمارا کیا کر سکتے تھے۔ ہم نے بین دوران مقدمہ میں تیمم کرکے بیٹھے ہوئے اشاروں سے نماز پڑھ لی۔ ایک ہفتہ کی کارروائی کے بعد ہمارا مقدمہ سشن سپرد ہوا۔ اُس وقت تک ہم پھانسی گھروں میں علٰحدہ علٰحدہ قید تھے۔ بعد سپردگی سشن کے ہم سب کو ایک جگہ حوالات میں بند کردیا۔ اب بعد ایک مدت کی تنہائی اور چلہ کشی کے ہم [illegible] دوست ایک جگہ جمع ہوئے تو بڑی خوشی ہم لوگوں کو ہوئی۔ میں تو سعدیؒ کا یہ شعر اکثر پڑھا کرتا تھا ؎

پائے در زنجیر پیش دوستاں — بہ کہ با بیگانگاں در بوستاں

مگر ایک مدت دراز چار ماہ تک کے تخلیہ اور تنہائی سے بھی ہم لوگوں کو بہت روحانی فائدہ ہوا تھا انوار الٰہی آئینہ صافیہ قلب میں خوب محسوس ہوتے تھے۔ نماز۔ روزے میں کمال لذت حاصل ہوتی تھی کہ شاید وہ کیفیت برسوں کی چلہ کشی اور گوشہ نشینی میں بھی حاصل نہ ہوتی۔ اُس وقت مولوی یحییٰ علی صاحب کی صحبت ایک مغتنمات سے تھی۔"

"اِس صبر اور استقلال کے انعام کو خیال کرکے اوّل سے آخر تک میری زبان پر تو شکر ہی شکر جاری رہا۔ مولوی یحییٰ علی صاحب کی کیفیت اس سے بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر تھی۔ وہ اکثر اس رُباعی کے مضمون کو ادا کیا کرتے تھے ؎

فلست اُبالی اقتل مسلما — علے ای شق کان اللہ مصرعی

وذالک فی ذات الالہ وان یشاء — یبارک علی اوصال شلو ممزع

ترجمہ: میں نہیں پروا کرتا ہوں جس حال میں مارا جاؤں میں مسلمان کسی کروٹ پر ہو پھر گر جانا میرا طرف خدا کی۔ اور یہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اگر چاہے برکت دیوے اوپر ملانے ٹکڑوں پراگندہ کے۔

یہ وہ رُباعی ہے جب حضرت خبیبؓ ایک صحابی کو کفار مکہ پھانسی دینے لگے تو اُنھوں نے نہایت جوانمردی سے یہ رُباعی پڑھ کر راہِ خدا میں جان دی اور شہید ہوئے اور اُن کی موت کی خبر اور اُن کا سلام خود جبریل علیہ السلام نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں پہنچایا تھا۔ مولوی یحییٰ علی صاحب بڑے دردِ اور عشق سے یہ شعر بھی اکثر سیّد صاحب کے فراق میں پڑھا کرتے تھے ؎

اتنا پیغام درد کا کہنا — جب صبا کوئے یار سے گزرے
کون سی رات آپ آئیں گے — دن بہت انتظار میں گزرے

بعد انتہائے دراز کے ۲ مئی ۱۸۶۴ء کو پھر ایک آخری اجلاس سشن ہوا اور جج صاحب موصوف اپنی تجویز اور فتوئے سزا پر اپنے گھر پر بیٹھ کر حسب ایما گورنر صاحب کے لکھ لائے تھے۔ اُس دن اجلاس میں بیٹھنے کے ساتھ ہی پہلے چاروں اسیسروں سے سشن جج صاحب نے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ لوگوں نے اس مقدمہ کو اول سے آخر تک سُنا۔ اب جو رائے ہو لکھ کر پیش کرو۔ ہم نے دیکھا کہ یہ چاروں اسیسر اُس وقت بھی ہماری شکلوں کو دیکھ دیکھ آنسو بھر لاتے تھے اور دل سے ہماری رہائی کے خواہاں تھے مگر جب صاحب جج و کمشنر کی رائے کو ہماری سزا پر مائل پایا تو مارے ڈر کے اُنھوں نے بھی لکھ دیا کہ "ہمارے نزدیک بھی جرم مندرجہ قرارداد ان پر ثابت ہے۔" پھر تو صاحب جج و کمشنر نے بعد حصول اس حیلۂ قانونی کے اپنی تجویز جو پہلے سے میز پر لکھی ہوئی رکھی تھی پڑھنی شروع کی جس میں آئیں بائیں شائیں کر کے پلوٹن صاحب کی تمام دلیل کا جواب تھا اور پھر سب سے پہلے میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ "تم بہت عقلمند اور ذی علم اور قانون داں اور اپنے شہر کے نمبردار اور رئیس ہو۔ تم نے اپنی ساری عقلمندی اور قانون دانی کو سرکار کی مخالفت میں خرچ کیا۔ تمہارے ذریعہ سے آدمی اور روپیہ سرکار کے دشمنوں کو جاتا تھا۔ تم نے سوائے انکار بحث کے کچھ حیلتاً بھی خیر خواہی سرکار کا دم نہیں بھرا اور باوجود فہمائش کے اُس کے ثابت کرانے میں کچھ کوشش نہ کی۔ اس واسطے تم کو پھانسی دیا جاوے گی اور تمہاری کل جائداد ضبط سرکار ہوگی اور تمہاری لاش بھی تمہارے وارثوں کو نہ دی جائے گی بلکہ نہایت ذلت کے ساتھ گورستان جیل میں گاڑ دی جاوے گی۔" اور اخیر میں بلکہ یہ بھی فرمایا کہ "میں تم کو پھانسی پر لٹکتا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہوں گا۔"

یہ سارا بیان صاحب موصوف کا میں نے نہایت سکوت سے سُنا مگر اُس آخری فقرہ کے جواب میں میں نے کہا کہ "جان لینا اور دینا خدا کا کام ہے آپ کے اختیار میں نہیں ہے وہ رب العزت قادر ہے کہ میرے مرنے سے پہلے تم کو ہلاک کر دے۔" لیکن اس جواب باصواب پر وہ بہت خفا ہوا — مگر

پھانسی کا حکم دینے سے زیادہ اور کیا کر سکتا تھا۔ جس قدر سزائیں اُس کے اختیار میں تھیں سب دے چکا تھا۔ لیکن اُس وقت میرے مُنہ سے یہ الہامی فقرہ ایسا نکلا تھا کہ میں تو اِس وقت تک زندہ موجود ہوں مگر وہ اِس حکم دینے کے تھوڑے عرصے کے بعد ناگہانی موت سے راہیٔ مُلکِ عدم ہوا۔

مجھ کو اپنی اُس وقت کی کیفیت خوب یاد ہے کہ میں اُس حکم پھانسی کا سُنکر ایسا خوش ہوا کہ شاید ہفت اقلیم کی سلطنت ملنے سے بھی اِس قدر مسرور نہ ہوتا۔ اِس حکم کے سُننے سے میری وہ کیفیت ہوئی کہ گویا جنتِ فردوس اور حوریں آنکھوں کے سامنے پھرنے لگ گئی تھیں۔ میرے بعد مولوی یحییٰ علی صاحب اور اُن کے بعد محمد شفیع اور اُن کے بعد نمبروار سب آدمیوں کو حکم سزا کا سُنا دیا گیا۔ جن میں تین اور مولوی یحییٰ علی صاحب اور حاجی محمد شفیع تین آدمیوں کے واسطے پھانسی وغیرہ حسبِ مذکورۂ بالا اور باقی آٹھ مجرموں کو دائم الحبس بعبور دریائے شور مع ضبطی کُل جائداد کے سزا ہوئی۔ میں نے مولوی یحییٰ علی صاحب کو بھی نہایت بشاش پایا۔ لیکن محمد شفیع کے چہرہ کا رنگ بدل گیا تھا۔ تاہم انھوں نے بھی اپنی طبیعت کو بہت تھاما۔ اُس دن پولس والے اور تماشہ بین مرد عورت بکثرت حاضر تھے۔ تمام احاطۂ کچہری ضلع انبالہ کی خلقت سے بھرا ہوا تھا۔ حکم سُنا کر اُس کا چپ ہونا تھا کہ صدہا مسلح اہلِ پولس زیر حکم کپتان پارسن صاحب میرے نزدیک آگئے اور کپتان آکر کہنے لگا کہ تم کو پھانسی کا حکم ملا ہے تم کو رونا چاہیے تم کس واسطے اتنا بشاش ہے۔ میں نے چلتے چلتے اُس کو بولا کہ "شہادت کی اُمید پر۔ جو سب سے بڑی نعمت ہے۔ اور تم اُس کو کیا جانو"

اِس مقام پر یہ بات بھی بیان کرنا ضروری ہے کہ پارسن صاحب بھی ایڈورڈس صاحب سے بڑھ کر متعصب تھا اور اِس مقدمہ میں شروع سے اس نے ہم لوگوں پر بہت ظلم کیا تھا جس کی تفصیل یہ قلم بھی نہیں کر سکتا۔ مگر خداوند تعالیٰ منتقمِ حقیقی تو موجود تھا۔ گو اُس کے کام دیر اور سہولیت سے ہوتے ہیں ہم کو سزا ہو کر تھوڑے دن گزرے تھے کہ یہ بے خوف بھی دُنیا ہی میں پاگل ہو کر راہیٔ ملکِ عدم ہوا۔

اُس دن تماشہ بین لوگ ہماری پھانسی کا حکم سُنکر اکثر زار زار روتے تھے۔ کوئی خدا کی مرضی اور راضی بقضا سے اپنے رانج کو روکتا تھا۔ کوئی دم بخود ساکت ہو کر ہم کو دیکھ رہا تھا۔ جیل خانہ تک بیسیوں مرد عورت ارد گرد سڑک کے ہمارا حسرت دیکھتے ہوئے چلے گئے۔ اِسی حالت کے اندر پولس ہم کو جیل خانہ میں لے گئی اور وہاں پہونچ کر ہمارے کپڑے اور لباس معمولی اتار کر ضبط کر لئے گئے اور ہم سب کو گیروا لباس پہنا دیا۔ ہم تین پھانسی والوں کو علیحدہ علیحدہ تین پھانسی گھروں میں بند کر دیا۔ باقی آٹھ آدمیوں کو جیل خانہ میں دوسرے قیدیوں کے ساتھ ملا دیا۔

۲ مئی کی رات کو جب ہم اُن تنگ و تاریک کوٹھریوں میں جو نواب سراج الدولہ کے بلیک ہول قلعہٗ کلکتہ سے بھی بڑھی ہوئی تھیں، بند ہوئے تو پہلی ہی رات کو ایک جہنم کا نمونہ ہو گیا۔ اُسی کی صبح کو ہم نے اہالیانِ جیل خانہ سے اپنی یہ تکلیف بیان کر کے چاہا کہ کسی طرح ہم کو بوقتِ شب اِن کوٹھریوں سے باہر رکھا جائے مگر سب اہالی جیل خانہ مارے ڈر کے انکار کر کے باہر چلے گئے۔ لیکن اُن کا انکار کر کے جیل خانہ سے باہر نکلنا تھا کہ سامنے سے ایک سوار تار گھر سے ایک ضروری لفافہ لے کر پہونچا۔ لفافہ کھول کر جو دیکھا تو اُس میں یہی لکھا تھا کہ ان تینوں پھانسی والوں کو بوقتِ شب میدان میں باہر سُلایا کرو۔ یہ طرفہ تماشہ تائیدِ الٰہی کا دیکھ کر اُسی دم جیل خانہ والوں نے ہم کو یہ حکم سُنا دیا۔ ہمارے واسطے بڑے اہتمام سے تین نئی پھانسیاں اور اُس کے ریشمی رَسّے تیار ہوئے اور اُدھر مثل مقدمہ کو واسطے منظوری پھانسی کے محکمۂ چیف کورٹ پنجاب میں بھیج دیا۔"

"۲ مئی تاریخ سنانے حکم پھانسی سے ۱۶ ستمبر تک ہم پھانسی گھروں میں بند رہے۔ اہالیانِ جیل ہمارے پھانسی دینے کا سامان تیار کر رہے تھے اور اُدھر ہم انگریزوں کا تماشہ بن رہے تھے۔ صدہا صاحب لوگ اور میم روزانہ ہمارے دیکھنے کو پھانسی گھروں میں آتے تھے مگر بخلاف دوسرے عام پھانسی پانیوالوں کے ہم کو نہایت شاداں و فرحاں پاکر یہ یورپین زوار بہت تعجب کرتے۔ اکثر ہم سے پوچھتے تھے کہ تم کو بہت جلد پھانسی ہوگی۔ تم خوشی کس واسطے کرتے ہو؟" ہم اس کے جواب میں صرف اسی قدر کہہ دیتے کہ ہمارے مذہب میں خدا کی راہ میں ایسے ظلم سے مارے جانے پر درجہ شہادت کا ملتا ہے اس واسطے ہم کو خوشی ہے۔"

"اب اُس مقلب القلوب کی ظاہری کارروائی کو سنئے۔ جب بہت سے صاحب اور میم ہم کو پھانسی گھروں میں نہایت شاداں و فرحاں دیکھ گئے تو یہ چرچا سب صاحب لوگوں میں پھیلا۔ تب اُن صاحب لوگوں نے جو ہمارے جانی دشمن تھے یہ خیال کیا کہ ایسے دشمنوں کو منہ مانگی موت شہادت جس کے واسطے وہ ایسا خوش ہو رہے ہیں دینی نہیں چاہئے بلکہ اُن کو کالے پانی بھیج کر وہاں کے مصائب اور سختیوں سے ہلاک کرانا چاہئے۔ ہم نے دیکھا کہ مطابق اُسی ہماری پیشین گوئی کے صاحب ڈپٹی کمشنر انبالہ ۱۶ ستمبر کو پھانسی گھروں میں تشریف لائے اور چیف کورٹ کا حکم ہم کو پڑھ کر سنا دیا کہ تم لوگ پھانسی پڑنے کو بہت دوست رکھتے ہو اور شہادت سمجھتے ہو۔ اِس واسطے تمہاری پھانسی سزائے دائم الحبس بعبور دریائے شور سے بدل گئی۔ پھر وہ سُنانے اس حکم کے پھانسی گھروں سے دوسرے قیدیوں کے ساتھ بارکوں میں ملا دیا اور جیل خانہ کے دستور کے موافق مقراضِ حجام سے ڈاڑھی مونچھ اور سر کے بال وغیرہ سب

نسس کر منڈی۔ بھیڑ سا بنا دیا۔ اُس وقت میں نے دیکھا کہ مولوی یحییٰ علی صاحب اپنی ڈاڑھی کے کٹے ہوئے بالوں کو اُٹھا اُٹھا کر کہتے تھے کہ افسوس ہے کہ تو خدا کی راہ میں پکڑی گئی اور اُس کے واسطے کتری گئی۔"

۱۸۶۵ء میں یہ لوگ پورٹ بلیر انڈمان بھیجے گئے۔ اِن لوگوں کے جانے کے بعد صادق پور پٹنہ کے وہ مکانات جن میں جماعت کے لوگ ٹھیرتے تھے مع مکانات [illegible] کھدوا کر پھنکوائے گئے۔ سنہ ۱۸۷۱ء کے اخیر تک بہار اور بنگال میں گرفتاری کا سلسلہ جاری رہا۔ پٹنہ میں امیر خاں سوداگر چرم اور مولوی تبارک علی وغیرہ۔ پٹنہ میں مولوی امیر الدین صاحب اور اسلام پور میں ایک معمر وضعیف شخص ابراہیم منڈل کو گرفتار کیا گیا اور پرانے گواہوں سے گواہی دلوا کر "کالے پانی" روانہ کر دیا گیا۔ امیر خاں کی جائداد سے حکومت نے مقدمہ کا کل خرچ پورا کیا۔

مولانا یحییٰ علی صاحب

مولانا یحییٰ علی صاحب پٹنہ میں ہندوستان کی "جماعت مجاہدین" کے امیر تھے۔ مولانا عبدالرحیم صاحب صادق پوری نے "درِ منثور" میں آپ کے جیل کے جو حالات لکھے ہیں اُن سے آپ کی عظمت اور سیرت و اخلاق کا اندازہ ہو سکتا ہے:-

"ہمارے حضرت مولانا صاحب کا استقلال اُس وقت کا قابل دید تھا۔ شب کو آپ اور ہم ایک ہی جگہ رہتے۔ آپ پچھلی شب حسب معمول نماز و دعا وغیرہ میں مشغول رہتے اور اکثر اشعار عاشقانہ دیوان ثنائی و حافظ وغیرہ کے پڑھتے اور ایک نہایت وجدی کیفیت آپ پر طاری ہوتی۔ ہم لوگ سب ہوش باختہ ہوتے اور آپ نہایت مسرور و خوش۔ آپ کے چہرہ بشرہ سے کچھ بھی آثار رنج و محن کے پائے نہیں جاتے۔ ذکر اللہ سے رطب اللسان رہتے۔ میرے پاس ایسے الفاظ نہیں ہیں کہ جن سے آپ کی اُس کیفیتِ وجدی و صبر و شکر کا ایک شمہ بھی بیان کر سکوں اور اُس کی تصویر کھینچ کر ھدیۂ ناظرین کرنا تو یہ ایک امر محال ہے۔"

"چونکہ موسم نہایت گرم تھا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ آدمی ایک ہفتہ سے زیادہ اُس کوٹھری میں رہے اور پھر جانبر ہو۔ لہٰذا ڈاکٹر نے حکم دیا کہ کوٹھری کا دروازہ کھلا رہے اور ایک پہرا سپاہی کا خاص اِسی دروازہ پر مقرر ہو کہ وہ لوگ کوٹھری سے قدم باہر نہ لا سکیں۔ چنانچہ ہمارے حضرت اِس قید تنہائی میں پھر تخمیناً دو ڈھائی مہینے رہے اور نہایت صبر و استقلال کے ساتھ اُن ایام کو آپ نے بسر کیا اور جب کوئی سپاہی پہرے والا یا اور کوئی سپاہی یا قیدی آپ کے سامنے آجاتا ہندو یا مسلمان۔

سب کو آپ توحید باری کا وعظ سُناتے اور عذاب آخرت و قبر وغیرہ سے ڈراتے۔
الغرض ایک عجب طرح کا فیض آپ کا اُس قیدِ تنہائی میں بھی جاری رہا۔ سپاہی جو پہرے کے واسطے آتا وہ سکھ ہوتا یا گورکھا اور مسلمان نہ ہوتا، آپ اس آیت کریمہ کا وعظ سُناتے۔ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۔ سپاہی کھڑا روتا اور جب اُس کے پہرے کی بدلی ہوتی تو اس صحبت کو چھوڑ کر جانا پسند نہیں کرتا۔ میں کچھ لکھ نہیں سکتا کہ کس قدر فائدہ اُس وقت پہرے والوں کو پہونچا اور کتنے موحد ہو گئے اور کتنے دینِ آبائی کو چھوڑ کر مسلمان ہو گئے۔ لَا يَعْلَمُهٗ اِلَّا اللّٰهُ
آپ کا فیض کبھی کسی حالت میں بند نہ ہوا۔ آپ کا جسم مبارک قیدی تھا مگر آپ کے دل و زبان آزاد تھے اُس پر کسی کی حکومت نہ تھی بجز اُس حاکم حقیقی کے۔ اگر ایک منٹ کے واسطے بھی کوئی آدمی سامنے آجاتا آپ امر بالمعروف و نہی عن المنکر بجا لاتے۔
بعد اس کے حکم پھانسی منسوخ ہوا اور حکم دوام حبس بعبور دریائے شور مع ضبطی جائداد۔ ان تینوں پھانسی والوں کے واسطے بھی صادر ہوا اور یہ لوگ قیدیوں میں ملا دئیے گئے اور حسب دستور اُس جیل کے جیسے ہم لوگوں کی ڈاڑھی منڈا دی گئی تھی، ویسا ہی آپ کی ڈاڑھی منڈا دی گئی۔ اور ایک کرتا کرتیک کا گیروا رنگا ہوا اور ایک ٹوپی کان ڈھپی گیروا رنگی ہو پہنا دی گئی۔ یہ جوڑا ناساس اُس جیل میں قانوناً ہر ایک کو دیا جاتا تھا۔
اُس کی صبح کو کپتان ٹائی صاحب مجسٹریٹ و ڈپٹی کمشنر انبالہ و پارسن صاحب سپرنٹنڈنٹ پولس جیل میں آئے اور داروغہ کو حکم دیا کہ مولانا سے سخت تر مشقت لی جاوے۔ چنانچہ خود اُس نے اپنے روبرو کھڑے ہو کر ایک بڑے کنوئیں پر جو رہٹ چل رہا تھا عین تمازتِ آفتاب میں اُس رہٹ کو آٹھ دس قیدی چلا رہے تھے اور وہ بمشکل چلتا تھا، آپ کو بھی اُس میں دے دیا۔ آپ دو تین روز تک تمام روز اُس کو چلاتے رہے۔ آپ کو باعث حرارت آفتاب خون کا پیشاب آنے لگا۔ آپ نہایت صبر و شکر سے اُس کو انجام دیتے رہے۔ دوسرے قیدی جو نہایت قوی و توانا تھے اُس رہٹ کو کھینچتے کھینچتے بیٹھ جاتے مگر آپ صبح سے شام تک اس میں لگے ہی رہتے۔
چونکہ اُس وقت ڈاکٹر صاحب موجود نہ تھے، مجسٹریٹ صاحب نے یہ کارروائی اپنے دل کا غصہ نکالنے کو کر لی۔ جب ڈاکٹر دو تین روز کے بعد جیل میں تشریف لائے اور نو آمد قیدیوں کو ملاحظہ کیا، جناب مولانا کو رہٹ کے کام میں دیکھ کر داروغہ پر نہایت خفا ہوئے کہ اس کو یہاں کیوں لگایا ہے؟ داروغہ نے عرض کیا کہ مجسٹریٹ صاحب خود تشریف لا کر لگا گئے ہیں۔ چونکہ ڈاکٹر کو مجسٹریٹ سے

چلتی تھی، فی الفور آپ کو وہاں سے چھڑا کر برعکس اس کے ایک نہایت آسان کام میں لگا دیا۔ یعنی دری بانی کے کارخانہ میں چھت کے نیچے دری کا سوت کھولنے کا کام آپ کو دیا گیا۔ آپ حمد و ثنائے باری میں شب و روز مصروف رہتے اور کام مفوضۂ سرکاری کو بھی باحسن وجوہ انجام دیتے۔ مثل اور قیدیوں کے آپ اہل و متکاہل کو کام میں نہ لاتے اور دوسرے قیدیوں کو بھی نصیحت فرماتے کہ جب تم سرکاری کھانا کھاتے ہو اور کپڑا پہنتے ہو اور مکان میں رہتے ہو تب ضرور ہے کہ سرکاری کام کو انجام دو اور قیدی لوگ جو جیل کے اندر حکم عدولی اور بدمعاشی وغیرہ کرتے اُس سے اُن کو روکتے اور نصیحت کرتے، صدہا قیدی اُس جیل میں ایسے نیک چلن ہو گئے کہ جس کو دیکھ کر داروغہ وغیرہ اہل کاران جیل حیران رہ جاتے۔"

"ہمارے حضرت نہایت باطمینانِ قلب، نہایت خنداں و شاداں و فرحاں یادِ الٰہی میں اور لوگوں کو استقامت دلانے میں شب و روز مصروف رہتے۔ دُنیائے دوں کی بے ثباتی اور اُس کے راحت و آرام کی بے قراری اور ثوابِ آخرت اور جنتِ نعیم کی پائداری یاد دلاتے اور رِضْوَانٌ مِّنَ اللهِ أَكْبَرُ کو خوب کھول کر فرماتے۔ اُس وقت کی کیفیت آپ کی قابل دید تھی۔ قلم کو جو ایک کاہِ خشک ہے کہاں وہ طاقت کہ جو اس کو بیاں کر سکے۔

فقیر مؤلف بھی اُس زلزلہ میں گرفتار تھا۔ آپ کے قدموں کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے بچا لیا کہ اغوائے شیطانی سے محفوظ رہ کر بیہودہ گوئی و ہفوات بکنے سے رکا رہا اور مغاکِ ہلاک میں نہ گرا۔ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ عَلٰى ذٰلِكَ۔ اگر آپ کا ساتھ نہ ہوتا تو ایسے مہالک سے بچنا متعسر بل محال تھا، صبر و استقلال تو مجھ ایسے نالائق کو کہاں میسر یہ تو بہت بڑے لوگوں کا کام ہے، صرف اس قدر کہ زبان ناپاک باتوں سے بچی رہی۔ ہزار ہزار شکر اُس قادرِ مطلق کا ہے اُس وقت ایک اور امتحان اِس نالائق پر خاص کر کے آیا کہ کمشنر صاحب و ڈپٹی کمشنر صاحب کی خواہش ہوئی کہ بذریعہ کمترین مولوی عبداللہ ساکن افغانستان سے پیغامِ مصالحت کیا جائے کہ جس سے بمقام انبیلہ وغیرہ سرکار سے جنگ ہوئی تھی اور وہ اِس کمترین کے چچا زاد بھائی تھے اِسی حالت میں قیدیوں کی چالان انبالہ سے لاہور جانے کو تیار کی گئی۔ اِس میں جناب حضرت مولانا و منشی محمد جعفر صاحب وغیرہ کل تیار کر لئے گئے مگر محمد شفیع و عبدالکریم و الٰہی بخش جو بوجہ گواہی ہم لوگوں سے علٰحدہ کر لئے گئے تھے رکھ لئے گئے اور یہ فقیر بھی بوجہ کارروائی صلح روک لیا گیا اور نیز میں تنفس سخت میں اُس وقت مبتلا تھا کہ لیاقتِ سفر مطلق نہ تھی۔ اِس وجہ سے بھی ڈاکٹر نے مجھے روک لیا اور جناب حضرت مع چند آدمیوں کے روانہ

جیل لاہور کئے گئے۔ اب اُس وقت سے عرصہ دُو سال تک میں صحبت کیمیا خاصیت سے اپنی بداعمالیوں کے سبب مہجور کر دیا گیا۔ اب جو کچھ میں بیان کروں گا اُن دُو سالوں کی کیفیت وہ شنی ہوئی ہو گی۔

الغرض آپ انبالہ سے روانہ ہو کر مع دوسرے ستر پچھتر قیدیوں کے جیل لاہور میں پہونچے اور وہاں قریب ایک برس کے آپ کا قیام رہا اور اس اثنا میں برابر قیدیوں کو آپ پند و نصائح کیا کرتے۔ چونکہ قید خانہ میں مجمع بدکاروں اور چور ڈاکو وغیرہ کا رہا کرتا ہے۔ آپ کا وعظ بھی انھیں افعالِ ذمیمہ کے بیان میں ہوتا اور توحید و تاکید صوم و صلوٰۃ کی ہوتی۔ صدہا چور اور ڈاکوؤں نے توبہ کی کہ اب کبھی اِس پیشہ کو نہ کریں گے۔ آپ اُن کو عذاب دائم مقیم سے "ڈراتے۔ صدہا موحد اور نمازی ہو گئے۔

ایک بلوچ ڈاکو کا ماجرا بیان کیا جاتا ہے اس کا نام مہدی تھا۔ اِس کے آباؤ اجداد سے چوری اور ڈکیتی کا پیشہ چلا آتا تھا۔ وہ نہایت قوی ہیکل جوان تھا۔ اُس نے جیل خانہ میں آکر بھی بہت کچھ شرارت کی تھی سرکاری کام ہرگز نہیں کرتا۔ صدہا بید اس کو لگائے گئے مگر اِس نے اُف نہیں کی۔ اپنی بدچلنی سے باز نہیں آیا۔ بیڑی اور ڈنڈا بیڑی۔ ہتھکڑی اور طوق و قید تنہائی وغیرہ جو کچھ سزا دی جاتی وہ سب اُس پر عمل میں لایا گیا۔ لیکن وہ باز نہ آیا۔ داروغہ و جمعدار سب اُس سے ڈرتے وہ ان کو بھی موقع پا کر ہتھکڑی سے پیٹ دیتا۔ خدا کے حکم سے آپ کا بستر اور اُس کا ایک ہی جگہ ہو گیا۔ خدا کی قدرت کہ آپ کی نصیحت و پند سے تھوڑے ہی عرصہ میں اِس کی کیفیت بدل گئی، اس نے سرکاری مشقت کرنی شروع کر دی اور ایسا نیک چلن بن گیا کہ داروغہ وغیرہ سب متحیر ہو گئے۔ ہتھکڑی اور طوق وغیرہ سب اُس سے دُور کر دئے گئے اور پارچہ بافی کے کارخانہ میں وہ داخل کر دیا گیا کہ جہاں دائم الحبس اور بڑے بڑے میعادی قیدی کام کیا کرتے تھے اور عمدہ کام کرنے اور زیادہ کام کرنے پر سال میں دُو ایک ماہ قید معاف بھی ملا کرتی۔ اِس نے وہاں جا کر بہت جلد پارچہ بافی کا کام سیکھ لیا اور نہایت عمدہ کپڑا بننے لگا۔

میں جب لاہور کے جیل میں گیا خود میں نے اِس بلوچ کو دیکھا کہ وہ پانچوں وقت نماز پابندی کے ساتھ پڑھتا اور اپنے گزشتہ اعمال کو یاد کر کے خوف خدا سے اکثر روتا۔ اے بھائیو! میں سچ کہتا ہوں کہ میں نے جب اُس کو دیکھا ایک "ولی" پایا۔ اِس قسم کے اور بہت سے ماجرے ہیں، میں نے یہ ایک تمثیلاً بیان کیا۔

الغرض آپ کا وجود باجود اُس قید خانہ میں واسطے ہدایت قیدیوں کے بھیج دیا گیا تھا کہ ہزاروں

فیض یاب ہو گئے۔ اہل کاران جیل اِس کرامات کو آپ کی دیکھ دیکھ کر نہایت متحیر و متعجب ہوتے،
تمام ہندو آپ کو دیوتا اور اوتار کہتے اور مسلمان ولی سمجھتے۔ اتوار کا روز جو فرصت کا قیدیوں
کی ہوتا۔ فجر کو بعد ملاحظہ ڈاکٹر آپ کے پاس مجمع ہو جاتا۔ آپ حسب حال اُن قیدیوں کے بدکاریوں
سے بچنے کا اور نیک چلنی اور توحیدِ الٰہی کا بیان فرماتے اور صوم و صلوٰۃ کی تاکید فرماتے۔ بعد اِس
کے آپ مع دوسرے قیدیوں کے لاہور سے بسواری ریل روانہ ملتان ہوئے: وہاں ہفتہ
عشرہ قیام کرکے بسواری مرکبِ دُخانی روہڑی بھکر سکھر جو ملکِ سندھ میں واقع ہے ہوتے
ہوئے کوٹری پہونچے۔ اور وہاں سے بذریعہ ریل کراچی بندر اور وہاں ہفتہ عشرہ قیام کرکے
بسواری مرکب دخانی براہِ سمندر بمبئی پہونچے اور وہاں سے بسواری ریل بمقام تھانہ (جو ایک
شہر کا نام ہے) اور وہاں بہت بڑا قلعہ جو مرہٹوں کا بنایا ہوا ہے اور اب وہ جیل کا کام دیتا ہے۔
اُس میں بھیج دئے گئے۔ وہ نہایت سخت جیل ہے کہ دوسرے جیلی اِس سے پناہ مانگتے ہیں، وہاں
کے اہل کار جیلر وغیرہ قسوت قلبی میں دوسرے جیلوں کے نسبت بدرجہا زیادہ۔ تمام احاطۂ بمبئی و
پنجاب کے شریر ترین قیدی اُس جیل میں بھیج دئے جاتے ہیں۔

آپ ہر جگہ اپنا کام کرتے رہے۔ چند مہینوں تک آپ کا وہاں قیام رہا۔ آپ کا فیض بدستور
وہاں بھی جاری رہا۔ بعد اس کے آپ آٹھویں دسمبر ۱۸۶۵ء بسواری جہاز بادبانی مع دیگر قیدیوں
کے روانہ پورٹ بلیر انڈمان ہوئے اور صعوبات و تکلیفات جہاز کو طے کرکے بتاریخ گیارھویں
جنوری ۱۸۶۶ء آپ داخل جزیرۂ انڈمان ہوئے۔ بعد اس کے جناب منشی محمد اکبر زماں صاحب
نے آپ کو اپنے مکان میں لیجا کر
رکھا اور باجازت چیف کمشنر صاحب اپنی تائید میں لے لیا۔ چونکہ جناب منشی صاحب کو کام بہت بسپرد
تھے اکثر فرصت کے وقت میں آپ مکان پر بھی سرکاری کام کیا کرتے تھے۔ لہٰذا جناب مولانا کو
حاضری کچہری سے بچا کر اسی مد میں داخل کیا۔ اب دونوں حضرات یعنی جناب مولانا احمد اللہ و مولانا
یحییٰ علی رحمۃ اللہ علیہما ایک ہی جگہ جمع ہو گئے اور میاں عبد الغفار صاحب کو بھی منشی صاحب ممدوح
نے کام نمبر سازی سکھا کر اُن کو بھی اپنے ہی مکان میں جگہ دی۔

بالجملہ یہ تینوں شخص ایک ہی مکان میں رہنے لگے۔ جناب مولانا کا کام یہ تھا کہ بعد فرصت از کار
سرکار لوگوں کو قرآن و حدیث پڑھاتے۔ نصیحت کرتے۔ گھر گھر پھرتے۔ عورتوں کو نماز کی تعلیم
کرتے۔ قرآن پڑھاتے۔ صدہا مرد و عورت کہ جنھوں نے اپنے معبود حقیقی کے سامنے سر جھکایا

تھا کچے نمازی بن گئے۔ اسی اثنا میں یہ کمترین بھی بعد مہاجرت دو برس سے پورٹ بلیر پہونچ گیا اور تقریباً تین چار مہینے آپ کی حضوری خدمت سے پھر مشرف ہوا۔ دو برس آپ وہاں اپنی عمر عزیز کو یادِ خدا و تعلیم و تلقین خلق اللہ میں صرف کرکے بتاریخ بیسویں فروری ۱۸۶۸ء کو لبیک کہتے ہوئے داخلِ خلد بریں ہوئے۔"

مقدمۂ سازش میں حکومت نے ان کے مکاناتِ مسکونہ تک مسمار کردئے اور صادق پور کا وہ محلّہ جہاں محل کھڑے تھے کفِ دست میدان بناکر اور مکانوں پر ہل چلواکر بلدیہ کی عمارت بنوادی اور قدیم تعمیر کی ایک ایک یادگار اور ایک ایک نشان مٹا دیا۔ قبریں بھی مشتبہ کہہ کر کھود کر پھینک دیں حتےٰ کہ کھجور کا ایک درخت رہ گیا تھا جو اس چمن خزاں دیدہ کی یادگار تھا۔ اُس کو بھی اُکھڑوا دیا۔ مولانا یحییٰ علی صاحب علیہ الرحمہ کو جب اِن مکانوں کے کھُدنے کی اطلاع انڈمان میں ہوئی تو آپ نے اپنی اہلیہ کو ایک خط لکھا جو خوش قسمتی سے ہم کو مل گیا ہے اُس کا کچھ مضمون جو اس واقعہ سے متعلق ہے نقل کیا جاتا ہے :-

"فروری لکھنا یہ ہے کہ خط سے نورِ چشم محمد حسن مدعمرہٗ کے حال انہدام دونوں مکانوں کا معلوم ہوا۔ البتہ دل کو قلق ہوا اور صدمہ بہت گزرا۔ کیونکہ مکان سکونتِ قدیم سے خصوصاً وہ مکان جس میں ذکر اللہ بہت ہوا ہو اور کاروبار فریضہ (فرضیہ) بہت اجرا پائے ہوں، مومنین کو اِن سے محبت بطور اہل و عیال کے ہوتی ہے۔ اِسی روز شب کو زیارت رُوح انور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشرف ہوا میں۔ تبسّم کناں فرمانے لگے کہ البتہ انہدام سے مکانوں کے مالکانِ مکان کو خصوصاً نسواں کو رنج و الم بہت ہوا ہے اور ہونے کی جگہ ہے اور ان آیاتِ کریمہ کو زبان سے ارشاد فرمایا۔ بشّر الصابرین الذین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انّا للّٰہ وانا الیہ راجعون ط اولئک علیھم صلوٰۃ من ربھم ورحمۃ واولئک ھم المھتدون ط ربنا افرغ علینا صبرًا و توفنا مسلمین ط عسیٰ ربنا ان یبدلنا خیرا منھا انّا الیٰ ربنا راغبون ط اور فرمایا کہ ان آیاتِ کریمہ کو وردِ زبان رکھو۔ عبادت خانے اور مسجد اقصیٰ اور مکانات انبیاء علیھم السلام بختِ نصر اور جالوت کے ہاتھ سے انہدام پائے تھے۔ آخر منہدم کرنے والے نسیاً منسیا ہوئے۔ اور یہ اماکن متبرکہ از سرِ نو بنا ہوئے اور پہلے سے زیادہ آباد ہوئے۔ تم بھی اپنے رب کے فضل سے ایسی ہی اُمید رکھو۔ عنقریب یہ بشارتیں ہونے والی ہیں۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ دشمنانِ خدا ان کے دوستوں کو اچھی طرح ستالیں۔ بعد اس کے اچھی طرح اس کا بدلہ پادیں دشمنانِ خدا منافقین ہیں وہ حکام سے جھوٹی جھوٹی

باتیں مسلمانوں کے حق میں لگا کے اِن کو ایذا دلواتے ہیں) اللہ تعالےٰ کا بہت شکر کرو کہ تم ایسے امتحانوں کے لائق ٹھہرے۔ بعد اس کے فرمایا کہ اس مکاشفہ کو بعینہٖ اُم یوسف کے پاس لکھ بھیجو کہ سب نسوان و مالکانِ مکان کو سُنا دے اور رجال مالکانِ مکان بھی اس کو دیکھیں اور پنبۂ غفلت کو کانوں سے نکالیں۔ اِس کے بعد دیر تک ہاتھ اُٹھا کر دُعا کی اور تشریف لے گئے۔"

پورٹ بلیر ہی میں مولانا یحییٰ علی صاحب اور اُن کے رفیق مولانا احمد اللہ صاحب نے انتقال فرمایا۔ ۱۸۸۳ء میں اٹھارہ برس کے بعد مولوی محمد جعفر صاحب اور اُن کے رفقاء کی رہائی کے احکام جاری ہوئے اور یہ حضرات ہندوستان واپس آئے۔ مولانا عبد الرحیم صاحب نے "صادق پور پٹنہ" کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ اُن ہی کے الفاظ میں سُننے کے قابل ہے:-

"صادق پور گیا تو وہاں دیکھا کہ ہم لوگوں کے مکانات کُل منہدم کر کے کفِ دست میدان بنا دیا گیا ہے اور اُس پر بازار اور میونسپلٹی کے مکانات بنا دئے گئے ہیں۔ میں نے چاہا کہ اپنے خاندانی مقبرہ کو کہ جہاں چودہ پشت سے ہمارے آباؤ اجداد دفن ہوتے چلے آئے تھے جا کر دیکھوں اور خصوصاً اپنے والدین ماجدین غفر اللہ لہما کے مزار کی زیارت کروں اور اُس پر دعائے مغفرت اور فاتحہ پڑھوں مگر ہر چند کوشش کی پتہ نہ ملا۔ بعد تجسس و تفحص بسیار غور و فکر کے قرینہ سے معلوم ہوا کہ حضرت والدین ماجدین کی قبریں کھود کر اُس پر بنائے عمارت میونسپلٹی بنا دی گئی ہے۔

اے حضرات ناظرین اِس وقت اِس حرکت کا جو ہمارے اموات کے ساتھ کی گئی۔ جو صدمہ دل پر گزرا وہ بیرون از حیطۂ تحریر و تقریر ہے۔ اِس وقت تک اُس کی یاد سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے جرم میں ہمارے اموات و آباؤ اجداد کی قبریں کیوں کھودی گئیں اور وہ مقبرہ کیوں معرضِ ضبطی میں آیا۔ ہماری 'عادل' گورنمنٹ نے کیوں یہ کام کیا۔"

اُردو ــــ اور ــــ تعلیم گاہیں

(از جناب قاضی محمد عدیل صاحب عباسی)

محکمۂ تعلیمات نے جو احکام نافذ کئے ہیں اور جن کا عمل درآمد تمام تعلیمی درسگاہوں میں نئے کریکولم کے ساتھ جولائی ۱۹۴۷ء سے ہوگیا ہے۔ ان کا منشا یہ ہے کہ زبان اردو کی تعلیم قطعی طور پر صوبہ متحدہ میں ختم ہوجائے گی علاوہ ازیں جو طریقہ برتا جارہا ہے اس سے جو لڑکے اردو کو اب تک ذریعۂ تعلیم بنائے ہوئے تھے انھیں جاہل رہنا پڑیگا۔ حسب ذیل واقعات میرے نظریہ کی وضاحت کریں گے۔

(۱) نئے کریکولم کے لحاظ سے ہندوستانی مڈل اسکول اور ہائی اسکول کا کورس جہاں تک ان کا ساتھ ہے ایک کردیا گیا ہے۔ اور تمام اسکول تین حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں۔ اول بیسک اسکول جو درجہ ۴ تک ہونگے اور چونکہ اب درجہ طفلان کو درجہ ایک قرار دیا گیا ہے اس لئے درجہ اول درجہ ۲ ہوگیا ہے اور درجہ پنجم تک ہے اس طرح جدید درجہ ۵ تک بیسک اسکول ہے۔ دویم جونیر ہائی اسکول جو درجہ ۶ سے درجہ ۸ تک ہوگا۔ سوم سینیر ہائی اسکول جو درجہ ۹ سے درجہ ۱۲ تک ہوگا۔ کریکولم ابھی درجہ ۱۰ تک تیار ہوا ہے۔ درجہ ۱۱ اور ۱۲ کا کریکولم ابھی تیار نہیں ہوا ہے۔

نئے قانون کی رو سے بیسک اسکول جونیر اسکول اور سینیر اسکول سب کا ذریعۂ تعلیم نہ صرف محکمہ کے احکام کے ماتحت بلکہ حکومت کے آرڈر کے مطابق جبریہ ہندی قرار دیا گیا ہے۔ ہر طالب علم کو اول زبان ہندی لینی ہے۔ کوئی طالب علم اردو کو بطور زبان اول نہیں لے سکتا۔ اس طرح اردو کہیں بھی ذریعۂ تعلیم نہیں ہے۔ البتہ جو لڑکے درجہ ۶ قدیم میں ہیں یعنی امسال درجہ ۵ قدیم پاس کرکے گئے ہیں وہ اردو کو بہ طور اصل زبان قائم رکھ سکیں گے۔ لیکن صرف درجہ ۸ تک۔ درجہ ۹ میں پہونچتے ہی انھیں اچانک اپنی اصلی زبان "ہندی" قرار دینی پڑے گی۔ یہ کریکولم اور طریقے گزٹ میں بھی شائع ہوچکے ہیں اور ان کی تشریح میں وضاحت کے ساتھ گورنمنٹ اور محکمۂ تعلیم کے احکام بھی موصول ہوچکے ہیں۔ اس طرح اب اس پر کسی مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں کہ اردو بطور ذریعۂ تعلیم ختم ہوچکی ہے اور محکمہ تعلیمات نے اردو ختم کردینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے۔

(۲) "اردو" بہ طور اختیاری سکنڈ فارم یا دیگر زبان کے ضرور قائم و برقرار ہے اور کاغذ پر یہ حکم موجود ہے

کہ جو طالب علم چاہے وہ ہندوستانی مڈل اسکولوں کے درجہ ۶ سے اور سیکنڈری ہائی اسکول کے درجہ ۹ سے اردو کو بہ طور دیگر زبان اختیاری مضمون میں لے سکتا ہے۔ لیکن اردو کا بطور دیگر زبان لینا بھی ناممکن ہے [illegible] اردو زبان بہ طور اختیاری مضمون بھی ختم ہو جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "اردو دیگر زبان" [illegible] رکھا گیا ہے جو "اردو" اول زبان کا ہے۔ اس لئے جو لڑکا بیسک اسکول میں درجہ ۵ تک صرف ہندی اور [illegible] صرف ہندی پڑھ کر آیا ہے وہ اچانک درجہ ۶ جدید میں کیسے اردو کی وہ کتاب بہ طور دیگر زبان پڑھ لیگا جو زبان اول کا کورس ہے۔ یہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ ترمیم اس کریکولم میں نہیں ہوئی ہے بلکہ دو سال پہلے سے رائج ہے لیکن موجودہ کریکولم میں اس کو قائم رکھا گیا ہے۔ دو سال سے اردو اور ہندی دونوں دیگر زبانوں کا وہی کورس کر دیا گیا تھا جو زبان اول کا کورس تھا۔ اور نتیجہ یہ ہے کہ ماسٹروں نے ایک سال تجربہ کرنے کے بعد اردو اور ہندی دونوں کو بطور دیگر زبان لڑکوں کو دلانا بند کر دیا تھا۔ بلکہ جن لڑکوں نے درجہ ششم میں ایسی غلطی کی تھی ان کا کورس درجہ ۶ میں بدلوا دیا تھا۔ اور چونکہ آرٹ بھی اختیاری مضامین میں شامل ہے اور جملہ مدرسان آرٹ میں ٹریننگ پائے ہوئے ہیں اس لئے آسانی سے لڑکوں کو آرٹ دلا دیا جاتا ہے۔ اسی اردو اور ہندی سکنڈ فارم سے بچنے کے لئے کثرت سے انگریزی درجے گزشتہ دو سال میں کھلے ہیں تاکہ انگریزی بطور دیگر زبان لے کر اردو اور ہندی سکنڈ فارم سے نجات مل جائے۔

اگر اس سلسلہ میں اعداد و شمار فراہم کئے جائیں تو نہایت دلچسپ ثابت ہوں گے۔ پس ظاہر ہے کہ جو طالب علم اب خالص ہندی بیسک درجوں میں پڑھ کر آئیں گے وہ اردو کو ناممکن تصور کر کے بطور دیگر زبان نہیں لیں گے۔ لہذا آئندہ چار پانچ سال بعد اردو بطور دیگر زبان بھی قطعی طور پر ختم ہو جائے گی اور جونیئر ہائی اسکولوں میں تین سال کے اندر بطور زبان اول ختم ہو جائے گی اور کہیں بطور زبان اول بھی نہیں۔ پس زیادہ سے زیادہ چار یا پانچ سال کے اندر اردو کسی درجہ میں پڑھائی ہی نہیں جا سکتی ہے۔

(۳) اس کے ساتھ مزید ظلم یہ ہے کہ گورنمنٹ کے ان سخت احکامات کے عملدرآمد میں ماتحتین کچھ اپنی غیر معمولی سختیاں بھی شامل کر رہے ہیں۔ مثلاً گورنمنٹ ہائی اسکول بستی کے ہیڈ ماسٹر نے ان لڑکوں کو جو درجہ ۸ تک اردو زبان اول لے کر آئے ہیں درجہ ۹ میں اردو بطور دیگر زبان لینے کی بعض حالات میں اجازت نہیں دی ہے۔ مثلاً جو لڑکے جنرل سائنس لینا چاہتے ہیں انھیں اردو لینے کی اجازت نہیں ہے اور اس قسم کی اور بھی پابندیاں عائد کر کے اردو زبان کو بطور سیکنڈ فارم بھی ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ میں نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو چٹھی لکھی اور ان سے عرض کیا کہ کس گورنمنٹ کے حکم کے ماتحت وہ ایسا کر رہے ہیں۔ تو انھوں نے جواب ہی نہیں دیا۔ اس کے پہلے مجھے معلوم ہوا تھا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے عربی تعلیم

بالکل ختم کردی ہے اور جو لڑکے درجہ ۱ تک عربی بطور دیگر زبان لئے تھے انھیں حکم دیدیا ہے کہ وہ کوئی دوسرا مضمون لے لیں۔ میں نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو ایک خط لکھ کر دریافت کیا کہ ایسا کیسے کیا جا سکتا ہے تو صرف موصوف نے اتنا جواب دیا کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں گورنمنٹ کے حکم سے کر رہا ہوں۔ اب میں نے مزید تفصیلات عربی اور اردو کے متعلق معلوم کرنی چاہی انھوں نے جواب ہی نہیں دیا۔ تب میں نے ڈسٹرکٹ انسپکٹر کو جملہ حالات لکھا اور بعد ازاں ہیڈ ماسٹر صاحب نے ایک گول مول جواب روانہ کیا۔ جس میں میرے سوالات کو قطعی نظر انداز کر گیا تھا۔ یہاں اس مراسلت کی تفصیلات سے بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ صرف یہ دکھلانا ہے کہ پوری سرگرمی اور مستعدی سے اردو فارسی اور عربی کو گروپنگ وغیرہ کے قاعدوں سے قطعی فنا کرنے کی پُر جوش کوشش ہو رہی ہے۔ اور شاید کریکولم اور حکومت کے احکام نے یہ فضا پیدا کر دی ہے کہ وہ اپنے اس فعل کو مستحسن سمجھ کر پبلک کے آدمیوں کو یہ بتلانے کی بھی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ وہ کیا پالیسی اختیار کر رہے ہیں۔ یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ میں نے ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول بستی کو لکھا کہ مجھ سے زیادہ کوئی شخص احکام گورنمنٹ کی اتباع کا قائل نہ ہوگا مگر میں ایک ماہر تعلیم نہیں ہوں اس لئے براہ کرم مجھے ملاقات کا موقع دیجئے اور کوئی وقت مقرر کیجئے کہ میں آپ سے سب باتیں سمجھ لوں۔ مگر ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے شرف باریابی عطا نہیں فرمایا۔ شاید وہ اقوال کی معقول سند نہیں رکھتے تھے اور نہ اسے مجھے اچھی طرح سمجھا سکتے تھے۔ اسی طرح ڈپٹی انسپکٹر مدارس ضلع بستی تمام اسکولوں میں زبانی حکم دے رہے ہیں کہ جو لڑکے درجہ ۴ تک اردو بطور زبان اول پڑھ کر آئے ہیں انھیں کو درجہ ۶ جدید میں اردو زبان دیگر جائے اور جو لڑکے ہندی بطور زبان اول لئے تھے انھیں سنسکرت بطور زبان دیگر دی جائے۔ یہ مشورہ حکماً جاری کیا جا رہا ہے اور اس طرح اردو کو بطور دیگر زبان فنا کرنے کی عملی کوشش شدت کے ساتھ جاری ہے۔ ان واقعات سے بخوبی ظاہر ہے کہ اردو دیگر زبان بھی قائم نہیں رہ سکتی ہے جب تک حکومت اس معاملہ میں دلچسپی نہ لے اور اس مسئلہ کو پوری مستعدی سے حل نہ کرے۔ گروپنگ کے جو قاعدے ڈائرکٹر تعلیمات نے مرتب کئے ہیں ان سے بھی اردو کے دیگر زبان کے طور پر مضمون بننے میں سخت رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں اور سب سے زیادہ وہ فضا ہے جو گورنمنٹ نے اردو کے خلاف قائم کر دی ہے۔ بلا اس فضا کے بدلے "اردو" زبان کا قائم رہنا محال ہے۔

(۳) یہ سب کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کی تعلیمی پستی کو دور کرنے کے لئے حکومت نے ایک علیحدہ بجٹ منظور کیا تھا اور اس روپیہ سے مکاتب و مدارس اسلامیہ قائم تھے۔ مدارس اسلامیہ کا کورس وہی تھا جو دیگر پرائمری (بیسک) اسکولوں کا تھا۔ مگر مکاتب اسلامیہ کا نصاب تعلیم مختلف تھا۔ اس میں قرآن پاک اور مذہبی

امور کی بھی تعلیم ہوتی تھی۔ گورنمنٹ کے حالیہ حکم کے اندر یہ عبارت موجود ہے کہ تمام امدادی مدارس میں زبان اول ہندی ہوگی۔ چنانچہ مکاتب اسلامیہ میں بھی ہندی پڑھانے اور اردو کو نہ پڑھانے کا حکم جاری ہوگیا ہے۔ تعجب ہے کہ نصاب تعلیم کے مرتب ہوئے بغیر مذہبی تعلیم ہندی میں کیسے دی جائے گی اور بچے پر قرآن پاک اور ہندی دونوں کا کتنا بوجھ پڑے گا۔ اب تک مکاتب اسلامیہ میں ہندو لڑکے پڑھ سکتے تھے مگر ہندی نہیں پڑھائی جاتی تھی۔ مکاتب اسلامیہ سے اردو کے خارج ہونے کے بعد ان کے زندہ رہنے کی کیا صورت باقی رہتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ امدادی اسکولوں میں حکومت نے مکاتب اسلامیہ کو ہرگز شامل نہیں کیا ہے۔ مگر حکم کی تشریح اسی طرح کی جارہی ہے۔ ضرورت ہے کہ حکومت جلد از جلد اس معاملہ کو صاف کردے میرے خیال میں اگر اردو کو مکاتب اسلامیہ میں ممنوع قرار دینا ہے تو مکاتب اسلامیہ کا توڑ ہی دینا بہتر ہے اور اس رقم کو مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ان کے حسب حال علیحدہ کریکولم مرتب کر کے دے دینا چاہیئے مگر یہ ایک علیحدہ بحث ہے جس پر پھر کبھی روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔

(۵) اردو کو صرف آئندہ کے لئے کریکولم میں ممنوع نہیں قرار دیا گیا ہے بلکہ جن لڑکوں نے آج تک اردو کو ذریعۂ تعلیم بنایا تھا انھیں مجرم قرار دے کر ان کی سزا بھی دی جارہی ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ لڑکے ہرگز اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکیں گے جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں۔ مڈل اسکول کے درجہ چہارم قدیم اور درجہ پنجم جدید تک اردو کو خارج کر دیا گیا ہے۔ اور ان کو ایک دم ہندی زبان اول قرار دینے پر مجبور کیا گیا ہے۔ اس طرح درجہ اول، دوم، سوم اور درجہ چہارم قایم میں جو لڑکے اردو زبان لے کر پڑھتے آئے ہیں انھیں ایک دم ہندی کو ذریعہ تعلیم بنانا ہے۔ وہی کتاب زبان کی پڑھنا ہے جو اس کلاس کا کورس ہے۔ اور نہ صرف یہ بلکہ جغرافیہ۔ تاریخ۔ حساب وغیرہ سب چیزیں اور جملہ مضامین ہندی میں پڑھنے ہیں۔ اور ہندی ہی میں پرچے لکھنے ہیں۔ میرے دو لڑکے امسال درجہ ۴ قدیم پاس کر کے درجہ ۶ جدید میں داخل ہوئے ہیں۔ دونوں لڑکے ذہین اور شوقین ہیں۔ مگر اچانک ہندی کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی مشکلات کے سمندر کو وہ ہرگز عبور نہیں کر سکتے۔ میں نے بہت سے ماسٹروں سے جو تعلیم کا تجربہ رکھتے ہیں اور چند ماہرین تعلیمات سے مشورہ کیا وہ سب متفق الرائے ہیں کہ لڑکے نہیں چل سکتے۔ کوئی شکل نہیں ہے۔ غالباً دیہاتوں میں ایسے لڑکے مار مار کر نکال دئے جائیں گے یا پست ہمت ہو کر بیٹھ جائیں گے۔ اگر محکمہ تعلیمات ایسے لڑکوں کے اعداد شمار رکھے جنھیں درجہ ۲ و ۳ و ۴ و ۵ قدیم اور درجہ ۳ و ۴ و ۵ و ۶ جدید میں اچانک اردو سے ہندی زبان بدلنی پڑے گی تو معلوم ہوگا کہ ۵ فی صدی بھی لڑکے اسکول میں باقی نہ رہ جائیں گے

اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اردو کو بطور ذریعہ تعلیم قائم رکھنا منظور نہیں ہے تو بھی اس شدت اور عجلت کے ساتھ ہندی کو زبردستی رائج نہ کرنا چاہیئے تھا بلکہ رفتہ رفتہ کرنا چاہیئے تھا تاکہ بچوں کی تعلیم کا نقصان نہ ہوتا۔ اور اس نقصان میں کسی فرقہ کی تخصیص نہیں ہے۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کوئی معقول پسند انسان اسے تسلیم کرنے سے انکار نہ کرے گا کہ جس لڑکے نے پانچ سال ہندی پڑھی ہے اس سے وہ لڑکا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جس نے ایک دن بھی ہندی نہیں پڑھی ہے۔ حکومت نے شاید اس مشکل کا اندازہ کیا تھا کیونکہ گزٹ میں کریکولم کے ساتھ یہ تحریر کر دیا گیا ہے کہ ایسے لڑکوں کے ساتھ بیش از بیش محنت کی جائے۔ میں نے بڑے اچھے ہندی داں ہندو مدرسوں سے گفتگو کی تو وہ اس ہدایت پر صرف مسکرا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے پاس کوئی ایسا آلہ نہیں ہے کہ پانچ سال کی تعلیم ہم ایک دن یا ایک سال میں پوری کر لیں۔ ایک شخص بھی مجھے ایسا نہ ملا جو اسے ناممکن نہ تصور کرتا ہو۔

مندرجہ بالا واقعات کسی مزید تنقید کے محتاج نہیں ہیں۔ مجھے آخر میں صرف اس قدر اور عرض کرنا ہے کہ اردو دوست طبقہ ہندی کا مخالف نہیں ہے وہ صرف اردو کی بقا چاہتا ہے۔ اگر کانگریس کا یہ اصول ترک بھی کر دیا جائے کہ ہندوستانی اردو اور ہندی دونوں رسم الخط کے ساتھ جاری ہو اور صرف ہندی سرکاری زبان بنائی جائے تب بھی کوئی وجہ نہیں ہے کہ اردو کو تعلیم گاہوں سے بطور ذریعہ تعلیم یا بطور زبان دیگر فوراً یا عملاً خارج کر دیا جائے۔ تعلیم کا مقصد حصول ملازمت نہیں ہے۔ حکومت یہ شرط لگا سکتی ہے کہ صرف ہندی داں کو ملازمت دی جائے گی مگر اردو کی تعلیم بند کرنا مناسب نہیں ہے۔ جو لوگ اردو اختیار کریں گے وہ سمجھ بوجھ کر اختیار کریں گے کہ انھیں ملازمت نہیں ملے گی کیا امید کروں کہ حکومت جلد معاملات پر غور کر کے اپنے احکام میں مناسب ترمیم کرے گی۔

(قومی آواز و انصاری)

نئی کتابیں

(از جنرل قدوائی)

بیگمات اودھ کے خطوط

ناشر مکتبۂ ادب اُردو بازار۔ دہلی قیمت عہ؍ مجلد

محترم شہابی صاحب کے اشہب قلم نے ایک مختصر تعارف کے ساتھ حرم ادب کی بوقلمونیوں اور ادبیات حرم کی گلکاریوں یا فکری طاؤس خرامیوں کے کرشمے عنوان بالا سے پیش کئے ہیں۔

مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی کا نام کسی کتاب پر ہونا اس کی اہمیت کی کافی دلیل ہے۔

ان خطوط کو اِس لحاظ سے ایک اہم تاریخی حیثیت حاصل ہے کہ ان سے سوسائٹی کی فکری حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ زبان کا رنگ اور بیان کا انداز قومی نفسیات کی موثر تنویریں ہوتی ہیں اور ذرا احتیاط کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان خطوط کو پڑھ کر "نیا ادب" پرانا معلوم ہوتا ہے اور جس طرح کھلے بندوں "شرملنے والی باتیں" اس وقت بے جھجک حوالۂ قلم کی جا سکتی تھیں اس کے پیش نظر نئی روشنی اپنے کو پھیکا اور پھیپھس محسوس کر سکتی ہے۔

شہابی صاحب اُردو ادب کے محسنوں میں سے ہیں اور یہ کتاب ان کی مستحسن کوششوں کے اہم سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور لٹریچر و سوشل ہسٹری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے نئی دریافت کا خزینہ ہے!

کتاب کے آخر میں مولانا عبداللہ خاں صاحب شروانی کی تقریظ بھی شامل ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد

شائع کردہ اقبال اکیڈمی قیمت عہ

زیر نظر کتاب ہمارے سعید بزمی صاحب کی رزم پسندی، اخلاص اور جہاد مسلسل کا ایک جلوۂ شوق افزا ہے اور ۴×۶ سائز کا ایک مقبول سیرت و قبول صورت ہدیۂ عقیدت

ع۔ بہار عارض حسنش دل وجاں تازہ می دارد

اس کے گردوپیش کا انقلابی رنگ اور فاختیٔ جلد بے تکلف عزم شاہیں اور سکونِ حق سرۂ کے امتزاج کا اشارہ اور کتاب جامہ ات فاختیٔ ساختیٔ یعنی چہ ؟ کا دلپذیر جواب۔
بزمی پراسئے مجاہد اچھے لکھنے والے دیر صاحب نظر" نوجوان" ہیں جن کی دل کی گرمی پاک بینی اور جان کی بیتابی ایک ایسے افسانے کے اجزا ہیں جو آزادی کی جدوجہد کی اندرونی تاریخ کہا جا سکتا ہے۔ شدائد کے مصائب نے ان میں وہ سکون اور وقار پیدا کر دیا ہے۔ جو ان کے ہیرو آنریبل آزاد کا طرۂ امتیاز ہے۔ ایک اچھوتے انداز میں یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ ع

" ٹپکے ہے لہو قلب کا جوں دیدۂ تر سے"

عبارت کی سلاست و روانی مسائل اختلافی کی قدرانہ تحلیل و تسہیل اس کی خصوصیات ہیں۔ جس صفائی کے ساتھ ہر بات کو پیش کیا گیا ہے اور جس صداقتِ اظہار کا اہتمام رکھا گیا ہے اُس نے کتاب کو تاریخی اہمیت عطا کر دی ہے۔

آنریبل آزاد صاحب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جائے گا لیکن یہ کتاب بہ قامت کمتر و بہ قیمت بہتر ہی رہے گی

تاریخ آزاد ہند فوج

از منشی عبدالقدیر صاحب حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ قیمت ۳؎

ہندوستان کے محبوب فدائی سبھاش چندر بوس کی آخری اور دلیرانہ سعی جس نے انگریزوں کے واقعی چھکے چھڑا دیئے اور ہندستان و پاکستان کی آزادی کا سبب قریب بنی ہر خوددار ہندستانی کے دل میں ایک زندہ ولولہ پیدا کرتی ہے۔ آزاد ہند فوج کی تاریخ اِن حیات بخش جاں کاہیوں، جاں فزا قربانیوں، مشقتوں فاقہ کشیوں اور مصائب کی کہانی ہے۔ جو آزاد بھارت کے سپوتوں کے دلوں کو ہمیشہ گرم، اور سروں کو بلند رکھیگی طرزِ بیان مخلصانہ اور سادہ ہے۔ بچے، اور معمولی تعلیم کے لوگ بھی اپنی اِس پیاری کتاب کو آسانی سے پڑھ سکتے ہیں۔

اس کتاب میں وہ تمام باتیں درج ہیں جو ہم اپنی آزاد فوج کے متعلق جاننا چاہتے تھے۔ شاہنواز، ڈھلن اور سہگل جیسے سورماؤں کے احوال مقدمات و تقاریر بھی

اس میں دی گئی ہیں۔

نیتاجی بوس کے بہادر شاہ کی قبر پر اس عہد کے الفاظ کہ "ہم آپ کی نعش دہلی لے چلیں گے" جس صداقت سے لبریز ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ صفحہ ۷۰ سے وہ ترانے شروع ہوتے ہیں جو ہماری فوج گاتی تھی ؎

"اب دہلی چلو، دہلی چلو، دہلی چلیں گے" "قدم قدم بڑھائے جا، خوشی کے گیت گائے جا" "بھارت بھاگ ہے جاگا" وغیرہ جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

سنگ وخشت

دانا دشمنوں اور دشمن دوست نادانوں کی اُلٹی کھوپڑیوں اور خوش مذاق ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لئے سنگ وخشت کی یہ بارش زیرِ نظر کتاب کی صورت میں دانش محل فیض گنج دہلی سے بحساب تین روپیہ فی جلد ارزانی فرمائی گئی ہے۔

آئے جسے جسے ہو ارادہ خرید کا

احمقؔ کے درد بھرے دل کی دھڑکنوں کے نقوش کا یہ مرقع اپنے خاکستری پیرہن میں نواہائے "سوختہ درگلو" کے سوز وساز کی عرصہ گاہ ہے۔ شہر کے لڑکوں کی مراد اور دیوانوں کو تحسین وداد۔ جوہرؔ علیہ الرحمہ ؎

شہر کے لڑکوں کی برآئی مراد قید سے دیوانہ رہا ہو گیا

مافیہا خوبیاں پتھر میں نمک کی عمومی تاثیر کے بارے میں غالب علیہ الرحمہ کی دُعا کی قبولیت کی آئینہ دار ہیں بلکہ طفلانہ بے پروائی کا ہر شائبہ مشقِ بے محابا سے مفقود اور پختہ کاری کا ثبوت ہر پڑھنے والے کے سر کی خیر منا تی ہے۔ پڑھئے اور سر دُھنئے

سنگ پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک
کیا مزا ہوتا کہیں جو سنگ میں ہوتا نمک (غالبؔ)

احمقؔ کا کلام ایک دل سیر تبصرہ چاہتا ہے۔ ان کی فکر ان کی تدبیر پر حاوی ہے اور ان کی وارستگی ان کی تقدیر کی غماز۔ جب آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں: تو "بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر"۔ بقولِ علیہ ما علیہ ؎

جہاں میں کہیں عقل وحکمت کی احمقؔ نظر آئی ہم کو نہ جب بات ال کلتی

تو ہم نے بھی اپنی خرد مندیوں کو جنون وحماقت کے سانچوں میں ڈھالا ان کا کریڈٹ، ان کا مشن بلکہ ان کے پھن ان کے تیوروں سے ظاہر ہیں۔ بھلا جس کی دعائے ڈبلیو رنس یہ ہو کہ ؎

مٹے ستم، ختم ہوں جفائیں، الم ہو برباد، غم ہو رخصت
الٰہی ان گورے گال والوں کا جلد از جلد منہ ہو کالا

اس کی قسمت میں سوا اس کے کیا ہوتا کہ ؎

احمق پہ چارج شیٹ لگا دی گئی وہاں — حُسنِ کلام کا بہت اچھا صلہ ملا

اور آخر کار ؎

ریل گاڑی میں لکھی ہے میں نے احمق یہ غزل — فتح گڑھ سے آگرہ کے جیل کو جاتے ہوئے

لیکن سکون وتوازن یا استغراق فی الحماقت ملاحظہ ہو کہ اسی غزل میں بطور پیشنگوئی فرماتے ہیں ؎

کونسل میں شیخ جی پہنچے جو اٹھلاتے ہوئے — خوف سے شیطان بھاگے ٹھوکریں کھاتے ہوئے

باوجود اس اتقائے خاص کے بھی شیخ جی — بارہا دیکھے گئے ہیں اک جگہ جاتے ہوئے

قسم کے اشعار بھی خوب ہیں جو "ہر حالیہ" کہے جا سکتے ہیں ؎

دل میں بتوں کا خوف زبان پر خدا کا نام — اے شیخ تیرے اس نئے اسلام کو سلام

گرمیاں کیسی دلوں میں طاعتِ معبود کی — اب خدا کو یاد کرتے ہیں بتوں کے ڈر سے ہم

مصیبت میں وہ اپنے کام آسکتا نہیں ہرگز — فراغت میں جسے غیروں کے کام آنا نہیں آتا

رہائی پا کے اسیرِ قفس کہاں جائے — کہیں چمن میں اُسے آشیاں نہیں ملتا

سرِ غیور کہاں، بابِ اہلِ جاہ کہاں — کبھی زمین سے یہ آسماں نہیں ملتا

ہر دانش مند کو کلامِ احمق پر عبور لازم ہے کیوں کہ ؎

از بطلیموس پرسیدند دانش از کہ آموختی گفت
از احمق و .... الخ

اور اب تو آزادی کے زمانہ میں اِس عذر کی بھی گنجائش نہیں کہ ؎

تلاشی کا رہتا ہے ہر وقت ڈر نہ رکھیں گے احمق کا دیوان ہم

اُردو ہندی رسم الخط

پروفیسر الحاج محمد الیاس برنی ایم اے علیگ۔ مطبوعہ اعظم پریس۔ ملنے کا پتہ بیت السلام سیف آباد حیدر آباد دکن۔

ہمارے بھائی برنی صاحب کی یہ بے بہا کتاب چشم خریدار پر احسان یعنی "سرمۂ مفت" نذر ہے۔ اردو اور ہندی کی لکھاوٹوں میں جو فرق ہے اس کو علمی اور عملی حیثیتوں سے واضح کرنے کی یہ سعی مشکور جو مصنف کی بالغ نظری اور وحید العصری کا نقشِ محکم ہے ہر لحاظ سے مفید اور قابل قدر ہے۔ ہندی حروف کی کتابت ذرا زیادہ صاف ہو جاتی تو اچھا تھا۔ ایسی اچھی کتاب میں ادنی اسقام بھی اس لئے نامناسب ہیں کہ "رقعۂ منشا دلش ہیچو کاغذ زری برزند" ہندی لکھاوٹ کی پیچیدگیوں کے اسباب کا اعتراف لائق مصنف نے صفحہ ۶۵ (۳۲) میں کیا ہے۔ یہ رسم الخط ایک خاص تہذیب (و علم) سے تعلق رکھتا ہے جس کا پسِ منظر اُردو سے قطعاً مختلف ہے۔ اولاً زبان خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہے جو ہر قوم کے سطحِ نظر و کردار کے تابع ہے۔ ثانیاً لکھاوٹ خود ضروریات انسانی کے بہت کچھ تابع ہے اور ہر ابھرنے والی قوم کے ساتھ اس کی زبان اور اس کا رسم الخط بدلتا ہے۔ زندہ مثال یورپ کی ہے جہاں مماثل لکھاوٹیں موثر اختلافات کے ساتھ مختلف قوموں میں رائج ہیں۔ ہندوستان کی بھی حالت کچھ ایسی ہی ہو سکے گی۔

جس قوم کی زبان سنسکرت تھی، ہم نہیں جانتے کہ اس کا کیا نام تھا۔ اہل یونان کی بے عقلی کی یہ ایک پائندہ یادگار ہے کہ اس ملک اور یہاں کے باشندوں کا ایسا نام مشہور ہوا جسے امر واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ عربوں نے اس بارہ میں ان سے شدید انتقام لیا اور ان کے سارے نام مروڑ ڈالے لیکن یہ ایک افسوسناک کیفیت ہے کہ دوسری زبان کے ناموں کو مسخ کیا جائے بشرطیکہ حروف تہجی اس کے متحمل ہو سکیں۔ انگریز اس باب میں سب سے زیادہ مضحکہ خیز حرکتوں کے ذمہ دار ہیں۔

اہل چین اپنی لسانی معذوری کے باعث ترجمہ سا کر لیتے ہیں۔ البتہ اہل ہند نے ناموں کو بجنسہ اختیار کیا اور غالباً ایسا وہ اپنی زبان کی وسعت کی وجہ سے کر سکے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ بیرونی الفاظ ابتک ہندی بھاشا میں محفوظ نظر آتے ہیں۔

اہل ہند کے حروف کی بنا حرف "اوم" ہے جو ان کے عقیدہ میں ذاتِ بے چون جل وعلا کا بے آواز نام ہے۔ اس بنیادی آواز سے مختلف آوازوں کا استخراج، ان کی ترتیب اور ان کے قلمبند کرنے کے لئے تحریری اشارات یعنی حروف تہجی اس فکری پس منظر سے متعلق ہیں جو ہمہ اوست کے عقیدہ کو (پانچہزار برس قبل مسیحؑ) مصر و یونان تک لے گیا (اپنی میسر بحوالہ ڈیوڈ ورس) سنسکرت میں ہر نقطہ، ہر لفظ، ہر لکیر، ہر دائرہ کے معنی متعین ہیں اور زیادہ سے زیادہ مفہوم کو کم سے کم حروف کے الفاظ میں ادا کرنے کا غیر معمولی اہتمام ہے لیکن ہندی میں اس کی پابندی نہ تو کی گئی نہ ہو سکتی ہے۔ ایسے ہی عربی زبان کے ہر حرف اور ہر لفظ کی وسعت و اہمیت جدا ہے مگر اردو میں اس کی پابندی نہیں بلکہ طبائع کی آسانیوں پر ہر چیز قربان کرنے کی جدوجہد برسوں سے جاری ہے جس سے ہندی لکھاوٹ کے مویدین کو تائید ملتی ہے۔ پھر بھی اردو خط کی اہمیت ہندی لکھاوٹ کے مقابلہ میں ہر لحاظ سے مسلّمہ اور نمایاں ہے کیونکہ تحریر میں اہم ترین چیز آسانی ہے۔۔ آسانی اظہار کی اور آسانی اختصار کی لیکن

میں نہ سمجھوں تو بھلا کیا مجھے سمجھائے کوئی

تبصرۂ منظوم
مقالاتِ شیروانی

تعالی اللہ چہ اعجاز بیانے — کہ در ہر لفظ معنی ہمچو جانے
ز شیروانی مقالاتِ کمالات — پئے گیتی بہارِ بے خزانے

سر اُردو و تاجِ سر بلندی — ز سینے راچہ زیبا آسمانے
مبارک از پئے اقلیم اُردو — جہانبانے بشکلِ پاسبانے
بناز د بخت اردوئے معلیٰ — ز بہرا و ہمایوں ارمغانے
بہار گل بماند چند روزہ — بہارِ خامہ باشد جاودانے
ز دستش ہر گلے رشک بہاراں — چہ فرخ باغبانِ گلستانے
بہ گیتی ہم ز شہد و شیر موعود — روان موجبت باطرزِ بیانے
چو انجم نقطہ ہر حرف مجلاّست — کہ ہر سطر یست رشکِ کہکشانے
بہ تسکینِ یکے جاری زبانش — بدارد حکمرانی حکمرانے

مطہرے بود در جامِ طاہر — کہ کوثر خیزہ ہر موج روانے
علم باشد قلم، قرطاس میداں — نشانے مملکت را ہم نشانے
بہ ہر جیبے بہ صفحاتِ کتابش — ز دامانِ ادب گوہر فشانے
بہ ہر طرزِ ہنر بزمے بیار است — ادیبے فاضلے ہم نکتہ دانے
بجائے خویش ہر معنی بہ لفظے — بہ موجے ہست دریا در گرانے
زہے تاثیرِ تسخیرِ دل و جاں — تو گوئی تیر جستہ از کمانے
ہمہ موجود از معقول و منقول — بہ اندازِ ادیبانہ بہ شانے
بہ شکلِ تبصرہ تبصیر آورد — برائے دیدۂ دل راز دانے
بہ ہر لفظے بہ ہر حرفے بہ ہر طرز — بہ ارزانیست سودائے گرانے
ہمی بخشد بہ ہر گاہے کہ دارد — کریم و فیض بخش و مہربانے
بیفزاید ہماں چنداں کہ بخشد — کہ ایں سودے نمی داند زیانے
تصور ہم بود تصویرِ تصدیق — بگوید فی الحقیقت داستانے
چو در بزمِ غزل حرفے کہ برزد — تو گوئی شمع را سوزِ نہانے
بہ سلکِ لفظ او حسنِ معانی — بود یوسف برائے کاروانے
زباں در نظم چوں گاہے کشاید — عنادل را دہد اذنِ فغانے
بہ ہر سویش کہ رہوارِ قلم ہست — بہ دستِ خویش میدارد عنانے
چناں تاثیرِ دل را جاں پذیرد — کہ در جنت ہمی آید جوانے
چہ گویم من از فضل و کمالش — کہ او باشد مرا بیش از گمانے
حبیبِ داورِ رحماں بذاتہ — ندارم بیش ازیں تاب بیانے
کریمٌ باذلٌ بالجد خیرٌ — ز تاثیرِ دلی گوید زبانے
الٰہی زندہ و پائندہ بادا — زمانے تا بود اندر مکانے
ز فیضِ او جہاں معمور باشد — دعا از قلب و آمیں از جہانے
بہ نظم آوردہ ام موجے ز بحرے — مگر در نثر ہیں بحرِ روانے
شب آخر گشتہ دا فسانہ باقیست — چہ گوید کیفیِ عاجز بیانے
ھذا عوا اللہ فی کل الاوان — ادام حبیبہ طول الزمان

([illegible] کیفی)

پروفیسر عبدالمجید صاحب قریشی

کراچی ۷ رنومبر ۴۷ء

افسوس ہے کہ علی گڑھ سے روانگی ایسی جلدی میں ہوئی کہ آپ سے ملنا بھی نہ ہو سکا۔ اور بالخصوص جب یہ بھی پتہ نہیں کہ پھر ملاقات کب ہوگی۔ حالات نے جو پلٹا لیا ہے اور آئے دن جو انقلابات رونما ہو رہے ہیں وہ ایسے نہیں کہ اب دلجمعی جلد واپس آئے لیکن دل غمزدہ اُن گلیوں کو ابتک یاد کر کے روتا ہے جہاں جوانی کے جملہ افکار و حوادث دفن ہیں۔ خیر میں ۳۱ راکتوبر کو یکایک علی گڑھ سے چل دیا۔ ۳۰ رتک کچھ طے نہ تھا۔ یکم نومبر کو دہلی میں رہا۔ ۲ رنومبر کو ۹ بجے صبح ہوائی جہاز سے روانہ ہو کر ۱۱ بجے ملتان پہنچا جہاں حملب علیہ الرحمۃ ۱۹۲۴ء میں پہنچے تھے۔ ۳ رکو ڈیرہ غازی خاں۔ وہاں کچھ دن رہا۔ بچوں کو وہاں چھوڑا اور ۱۱ رکو میں یہاں پہنچا۔ سفر کی صعوبتیں سخت جاں کاہ ہیں۔ اتنی بھیڑ ہوتی ہے کہ سفر ناممکن ہو گیا ہے۔ ابھی تک وطن نہیں جا سکا یہ بھی نہیں معلوم کب تک جانا ہوگا۔

آپ سب بہت یاد آتے ہیں۔ کانفرنس کے کارکنان حکیم صاحب۔ شیخ عطاء اللہ صاحب۔ رشید صدیقی صاحب شہزاد صاحب۔ سراج الحق قریشی صاحب۔ مولانا اکرام اللہ صاحب۔ غرضیکہ جو ملے اس سے کہدینا کہ مجھے سب یاد آتے ہیں اور سلام پہنچا دینا۔ یہ دوسرا خط نواب صاحب قبلہ کی خدمت میں بھجوا دینا ۔ خدا حافظ!

کراچی۔ ۲۷ رنومبر ۴۷ء

محبت نامہ ملا۔ عید کے بعد تمھارے نہ ملنے سے یہ خیال ہوا تھا کہ شاید تم علی گڑھ سے باہر ہو لیکن پریشانی میں معلوم نہ کر سکا۔ علی گڑھ میں ۴۴ سال کی رہائش کو ترک کرنا آسان نہ تھا۔ بھاری پتھر کلیجے پر رکھنا پڑا۔ اب بھی ہجرت نہیں کہہ سکتا۔ کونہ کونہ اور بچہ بچہ نگاہوں کے سامنے ہے۔ واپسی کے لئے جی تڑپ رہا ہے۔ پاکستان میں ان دنوں ایک تعلیمی کمیٹی ہو رہی ہے۔ جی چاہتا تھا میں بھی حصہ لوں لیکن ہی خود داری مانع رہی۔ ابتک سوائے حلیم صاحب کے اور وہ بھی ایک دفعہ ان کے دفتر میں اور کسی سے ملاقات نہیں ہوئی، کراچی کی دنیا میرے لئے نئی اور ایک حد تک غریب الوطنی کی دنیا ہے۔ کام کرنے کے یہاں اور وہاں بہت ہیں لیکن مجھ میں جرأت کی کمی اور دنیا صرف گھسنے والوں کے لئے کشادہ۔ آپ جیسے مخلص رفیقوں نے ابتک مجھ سے کام لیا۔ یہاں کون پوچھتا ہے۔ تم کہتے ہو علی گڑھ آجاؤ۔ علی گڑھ میں نے چھوڑا کب۔ اگر وہاں کام کرنے کے مواقع

رہے تو ضرور آؤں گا۔ جو فضا اس وقت ملک میں ہے اس میں صحیح کام ممکن نہیں۔

جو طرزِ عمل ملک اب چاہتا ہے وہ میرے اندر نہیں۔ میں بنی نوعِ انسان اور اس کی حاصلات کو ایک جائداد سمجھتا ہوں۔ اس کا مٹانا یا مٹتے دیکھنا میرے بس کی چیز نہیں۔ جو تباہی اور بربادی ملک میں ہوئی اور ہو رہی ہے اس پر دل روتا ہے۔ لیکن روتا یوں ہی کہ میں بے بس ہوں۔ علی گڑھ چھوٹ نہیں سکتا، اور اب تعلیمی پروگرام سے زیادہ اصلاحی پروگرام ضروری ہے۔ حیوانیت سے پھر انسانیت کی طرف رجوع کرانا ہے۔ انسان اپنی بلندی کے خوابوں سے محروم ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

پیر الٰہی بخش صاحب سے ابتک میری ملاقات نہیں ہوئی اور نہ میں کسی اور گوشہ نما یہ ہستی سے ملا ہوں میں اپنی خو سے مجبور ہوں۔ تمھاری ضرورت ہر قدم پر محسوس کرتا ہوں۔ پسماندگان حالی کو سلام اور یہ بھی سمجھا دینا۔

گو میں رہا رہینِ ستمہائے روزگار
لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا

میں اپنا آئندہ کا پروگرام اس وقت طے کروں گا جب لاہور ہو آؤں۔ سردست سفر مشکل ہے۔ کوئلے کی قلت کی وجہ سے گاڑیاں کم ہیں۔ ریلوں میں وہ بھیڑ ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ ابھی تک خانہ بدوشی کی زندگی ہے۔ کوئی مستقل جائے قیام بنے تو کام کروں۔ بچے زیادہ تر ڈیرہ غازی خاں کچھ یہاں ہیں۔ جو وہاں ہیں ان کی تعلیم کا وہاں انتظام کیا ہے۔ بعض کو یہاں داخل کرا رہا ہوں۔ علی گڑھ کیا چھٹا سب نظم ختم ہو گیا ہے۔ اب زندگی کیا ہے! ہاں، خدا کا شکر ہے ہزاروں سے اچھی ہے۔ کسی کام کے کرنے کا البتہ ابھی سامان نہیں۔

لو خدا حافظ! گھر میں دعا بچوں کو دعا۔

کراچی۔ ۷ر دسمبر ۱۹۴۷ء

۳ر دسمبر کا محبت نامہ پیشِ نظر ہے۔ ساتھ ہی ساتھ آپ کا مضمون "غدا راہ دیجئے" بھی ملا بالاستیعاب نہیں۔ غور سے اسے پڑھا۔ تاریخ و سائنس کے مادی نظریوں نے قوموں کی جو گت بنائی ہے اس نے ابتک بھی ہمیں بیدار نہیں کیا۔ عقل جو بیش از بیش کچھ نہیں کہ وہ ہماری مادی ضروریات اور جذبات کی فراہمی اور پرورش کے لئے ایک آلۂ کار ہے ابتک مصیبت سے بچنے کے لئے کارفرما نظر آتی ہے۔ مادی اور طبعی ضروریات انسانی تسلیم لیکن یہ انسان اور حیوان میں مشترک ہیں۔ انسان اس سے بہت بالاتر ہستی تھی۔ یہ حقیقت فراموش ہو گئی۔ پاکستان اور ہندوستان دنیا کے عام رجحانات میں شریک ہیں۔ اخلاقی اور روحانی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے وحی کی تعلیم کی طرف رجوع کرنا کوئی ملک و قوم پسند نہیں کر رہا گو ہر طرف یہاں وہاں سب جگہ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ جو گتھیاں انسانی ترقی میں پڑ گئی ہیں وہ اکیلے عقل کی بس کی نہیں

زاویۂ نگاہ کو یکسر بدلنا ضروری ہے لیکن ابھی خدا سے بھٹکا ہوا انسان راہ راست پر آ نہیں رہا۔ تمھارا مضمون بھی اسی راہ پر ہے۔ اعترافِ شکست اس میں نہیں لیکن علاج وہی تجویز ہوا ہے جو مادی نگاہ کو نظر آیا۔ ارے بھائی معاف کرنا میں نہ معلوم بہک کر کہاں سے کہاں جا نکلا۔ مقصود تمھارے مضمون کی تحقیر نہ تھی۔ سب مفکروں کی تھی خیر۔

یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ علی گڑھ کی فضا امید افزا ہے۔ خدا کرے آپ سب کو پورا اطمینان ہو۔ شریف صاحب وغیرہ واپس آ گئے بہت اچھا ہوا۔ تیسری جنگ عظیم اگر آنے والی ہے تو آئے مجھے کیا اندیشہ۔ عمر بھر کے تعلقات اور محبتوں کا اندوختہ تو پہلے ہاتھ سے جا چکا ہے۔ سرمایہ نہ پہلے تھا نہ اب ہے۔ گھر بار کچھ ایسی چیزیں نہیں جو دلوں کی خوشیوں کے باعث ہوں۔ پہلا محاذ پاکستان ہو یا ہندوستان مجھے تو جو چیز رلائے گی وہ اپنے ہم وطنوں اور ہم قوموں کی اخلاقی اور روحانی پستی۔ اسی سے جی جلا اور اب بھی جلتا ہے۔ جب وطن میں حیوان ہی حیوان نظر آئیں تو تباہی سے کیوں جی ڈرے۔ حیوانوں کے ساتھ مجھے کیا ہمدردی۔ ہاں جو تمدن و تہذیب ورثے میں آئی تھی وہ جب ہمارے ہاتھوں مٹ گئی اور اس کا ذرہ برابر اثر کسی انسان میں باقی نہ رہا تو اب جنگ آئے یا کوئی اور تباہی ہم اس کے مستحق ہیں۔ لہذا میں اپنے مستقبل کے پروگرام کو خواہ وہ کام کے متعلق ہو یا رہائش کے متعلق جنگ کے محاذ کے پیش نظر طے نہیں کروں گا۔ میں انسانوں کی جماعت کا متلاشی ہوں وہ جہاں میسر آ جائیں وہاں رہ پڑوں گا۔ سردست کچھ طے نہیں۔ آپ نے جس جس طرح سے علی گڑھ واپس آنے کے دلائل دئے ہیں اس سے آپ کی محبت و خلوص واضح ہیں۔ لیکن یہ کیسے معلوم کہ میں خود وہاں آنے کو کتنا بے تاب ہوں۔ بعض اوقات تو بے اختیار واپس آ جانے کو جی چاہتا ہے لیکن نہ میں نے اپنے ارادے سے علی گڑھ چھوڑا اور نہ واپسی اپنے ارادے کے ماتحت ہوتی نظر آتی ہے۔ بہرحال اپنی دعاؤں میں مجھے یاد رکھئے اور اپنے کام میں مجھے شریک۔ میں ابھی تک یہاں کسی سے نہیں ملا۔ اور وطن کی طرف بھی ابھی جانا نہیں ہوا۔ جن ضرورتوں کے لئے یہاں آیا تھا وہ بھی بدستور معلق ہیں۔

کراچی - ۳۲ دسمبر ۱۹۴۷ء | غریب الدیار قریشی کی دعا و سلام۔ بھائی ڈرو اور بندے کا۔ توبہ کرو تم سید ہو۔ خدا کا سامنا اور شہدائے عظام کی صف میں کیسے کرو گے؟

کون کہتا ہے کہ قریشی ناراض ہے اور وہ بھی انصاف علی سے۔ اور وہ بھی علی گڑھ سے باہر۔ غریب الوطنی میں۔ توبہ کرو خدا سے ڈرو اور مجھے دور بیٹھے بیٹھے گنہگار نہ بناؤ۔ نہیں بھائی میں ناراض نہیں۔

تم کام کرنے کو کہتے ہو جس ناکارے آدمی سے خط بھی لکھانے کا نہ لکھا جائے وہ کام کیا کرے گا۔ یوں
تو جب تک سانس چلتی ہے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا لیکن سردست تو یوں سمجھو کہ ایک نئی دنیا میں آگیا ہوں۔ اس
دیار کی کیوں کہوں کسی دیار کی راہ و رسم سے ناآشنا ہوں۔ میری زبان کوئی سمجھتا ہے اور نہ میں کسی کی
زبان۔ جیسا کام لوگ کر رہے ہیں وہ مجھ سے بن نہیں پڑتا اور جو میں کرنا چاہتا ہوں اس سے کسی کو
لگاؤ نہیں کام بنے تو کیونکر۔ میں ابھی تک یہاں اپنے سامان کا جو بمبئی کے راستے بھیجا تھا انتظار کر رہا ہوں لیکن
قیاس یہ ہے کہ دو ایک روز میں اب یہاں سے نکلوں گا۔ کہاں جاؤں گا ابھی کچھ طے نہیں۔ پتہ سردست
یہیں کا رہے گا۔ ڈاک مجھے ملتی رہے گی۔ ابھی تک حالات سفر نا مساعد ہیں اور مہاجرین کی نقل و حرکت
کی وجہ سے امن و چین کی زندگی ممکن نہیں۔ کانفرنس گزٹ ملا آپ کا مضمون یونیورسٹی کے متعلق دیکھا
اطمینان ہوا۔ الہ آباد یونیورسٹی کے کانووکیشن ایڈریس کا شکریہ۔ میں سمجھا۔ یہ آپ نے کیوں بھیجا۔ کہنا یہی
چاہتا تھا لیکن کہہ نہ پایا۔ یہ روشنی عقل کی عطا کردہ ہے اس لئے جنگل کا دیا ہے۔ شمع ہدایت نہیں۔
اس کے لئے اور ہی روشنی درکار ہے۔ میں نہ آسکا تو تمھارا آنا ضروری ہوگا۔ لیکن کبتک ابھی کچھ نہیں معلوم۔

ڈیرہ غازی خاں۔ ۷/ جنوری ۴۸ء | محبت نامہ مورخہ ۲۶/ دسمبر کراچی سے منعطف ہو کر مجھے کل یہاں ملا۔
جس پابندی اور باقاعدگی کے ساتھ آپ مجھے یاد کرنے کے لئے وقت نکال لیتے ہیں وہ قابل قدر ہے۔
میں تو بیکار ہوں خطوں کا انتظار کرتا رہتا ہوں لیکن آپ ایک کام والے آدمی بلکہ کاروبار والے۔ آپ
قابل تعریف ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو خدا جنت نصیب کرے۔ کام کرتے کرتے اللہ کو پیارے ہوئے۔ چاہتے
تو بہت پہلے کام کا جوا اتار کر رکھ دیتے اور آرام کرتے لیکن قوم کی خدمت کی ایک دھن تھی جو جان کے
ساتھ رخصت ہوئی۔ انھوں نے جو کچھ کیا کئی زندگیوں پر بھاری ہے۔ پھر جس حالت میں کیا کہ اپنے پرائے
سب مخالف رہے اور بھی قابل عزت ہے۔ مسلمانوں نے ان پر حسد کیا۔ رشک کرتے تو قوم کا بیڑا پار
ہو جاتا۔ قوم مرثیہ خوانی اچھی کر لیتی ہے۔ محفلیں اور جلسے کرتی ہے لیکن نہ کسی کے کام کی قدر اس کے دل میں
ہے اور نہ خود کام کرنے کے لئے آمادہ۔ مرنے والا مر گیا اور کام کر گیا۔ اب شیخ صاحب ہوں یا سید صاحب
اپنے گریبان میں منہ ڈالیں اور شرمندہ ہوں۔ میرے دل پر کیا گذری اور گذر رہی ہے اس کو کیا لکھوں نصف
صدی کا ساتھ تھا اور وہ بھی ایسا کہ ایک لمحے کو خلوص میں لغزش نہ آئی۔ میں نے مرحوم کی عقیدت میں
پرورش پائی اور ان کی محبت کے لطف اٹھائے۔ کیا کیا خوبیاں تھیں جو وہ ساتھ لے گئے۔ پرانے اخلاق
کے نمونے اب کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ خدا مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین

تم نے اُن کے وطن کے سلسلے میں عزیزی قدوائی کا تذکرہ کیا۔ میری روانگی سے کچھ عرصہ قبل سے
ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اور میں اس خیال میں تھا کہ وہ علی گڑھ سے چلے گئے۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ
وہیں ہیں۔ کیا کر رہے ہیں۔ میرا سلام اُن سے کہنا اور یہ بھی پوچھنا کہ اپنے پیر اور استاد سید ظفر الحسن کا پتہ
مجھے لکھیں۔ میں کراچی میں ڈیڑھ ماہ سے زائد رہا لیکن ان کا پتہ نہ چلا۔

میں ۲۷ دسمبر سے یہاں ہوں۔ اس نیت سے آیا تھا کہ آگے وطن کی طرف بڑھونگا لیکن سفر آجکل سخت
صعوبت ہے آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہوتی جاؤں گا لیکن کب تک اس کا پتہ نہیں۔ لکھنؤ کانفرنس کے ساتھ
بہت امیدیں وابستہ تھیں لیکن اخباروں سے جو حالات معلوم ہوئے ہیں وہ کچھ امید افزا نہ نکلے۔ مسلمان
کو اپنے رہنماؤں سے چھٹکارا حاصل کرنا پڑے گا۔ لیکن یہ میں نے کیا غلط بات کہی۔ رہنما تو قوم کے آئینہ دار
ہوتے ہیں۔ جو صورت قوم کی ہوگی وہی ان میں جھلکے گی۔ میں کب تک واپس کراچی جاؤں گا کچھ پتہ نہیں
آپ سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن خدا کرے یہ اُن آرزوؤں میں سے نہ ہو جو خاک ہونا اپنے مقدر میں رکھتی
ہیں۔ سب پرسندگان کو سلام۔ خدا حافظ!

ڈیرہ غازی خاں۔ ۲۱ جنوری ۴۸ء | محبت نامہ مورخہ ۲ ماہ حال پرسوں ملا۔ یہ معلوم کرکے افسوس ہوا کہ آپ
بستر علالت پر ہیں۔ خدا کرے جب تک یہ عریضہ پہونچے آپ بالکل اچھے ہوں اب آپ کچھ زیادہ بیمار رہنے
لگے ہیں یہ آئے دن کی بیماریاں اچھی نہیں۔ پھر بیماری تو رئیسوں ہی کے لئے کچھ زیبا ہے کہ حکیم ڈاکٹر آ رہے ہیں
دوائیاں تیار ہو رہی ہیں۔ مصاحبین غمگساریاں کر رہے ہیں اور چھینک کو بخار بنا رہے ہیں۔ کام کرنے والے
کے پاس اتنا وقت کہاں۔ اس ریاست کو چھوڑیئے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کے متعلق وہ کیا تاثرات تھے جو آپ نے کانفرنس گزٹ کے حوالے کئے۔ میری تحریر کب
اس قابل ہوتی ہے کہ وہ اخباروں میں چھپے اس میں تو ہمیشہ "شخص واحد سے شخص واحد تک" کی ہی لذت ہوتی ہے
آپ کے خط کے ساتھ ساتھ ہی یکم جنوری۔ ۸ جنوری اور ۱۶ جنوری کے گزٹ اور رسالہ مصنف بھی ہے۔ پہلا
موقعہ ہے کہ گزٹ اور مصنف آپ نے بھجوائے۔ شکریہ قبول کیجئے۔ گزٹ میں پہلی مرتبہ پنڈت سندر لال صاحب
کی تحریر میں نے پوری دیکھی۔ جستہ جستہ ٹکڑے اس کے پہلے دیکھے تھے۔ خوب لکھا ہے لیکن ہماری بے حسی کے سامنے
یہ سب تحریریں بیکار ہیں۔ مصنف کو دیکھ رہا ہوں۔ بزم مصنف میں آپ کے احباب کے تاثرات دیکھے۔
اللھم زد فزد۔

یہ معلوم کرکے افسوس ہوا کہ عبدالباری صاحب علیل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے وصال نے کتنوں کو

بے حال کر دیا۔ جب وہ زندہ تھے یہ خیال بھی نہ گزرتا تھا کہ یہ کبھی نہ ہوں گے۔ علی گڑھ کی یاد جبتک رہے گی ان کا نام مٹ نہیں سکتا۔ باری صاحب کو میرا سلام پہنچا دیجئے۔ قدوائی صاحب کے نام الگ خط لکھ رہا ہوں وہ ان کو دیدیجئے۔ لکھنؤ کی کانفرنس میں شرکت نہ کر سکنے کا مجھے بہت رنج ہے۔ میں بالطبع کانفرنسوں سے بچتا ہوں مگر یہ ایک اہم کانفرنس تھی۔ خدا کرے اس کی کوششیں بارآور ہوں اور مسلمانان ہندوستان کو مفید رہنمائی مل جائے۔ یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ ایک اچھی جماعت کام کے لئے نکل آئی۔ خدا کامیابی دے۔

ڈیرہ غازی خاں۔ ۷ فروری ۱۹۴۸ء | یکم فروری کا محبت نامہ کل شام کو ملا۔ تمہارا خط آجاتا ہے تو سمجھتا ہوں علی گڑھ میں نصف صدی کا قیام رائگاں نہیں گیا۔ ہر دلعزیزی کا سب یقین دلاتے تھے۔ میں بدکتا تھا۔ اب کہ علی گڑھ سے دور ہوں اور آنکھ سے اوجھل" دل سے دور" کا لطف آرہا ہے کسی محبت کرنے والے کا خط آجاتا ہے۔ تو دل بڑھ جاتا ہے۔

یہ قدوائی صاحب کا خط پڑھوا کر جو آپ نے واپس لے لیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ میں اُن کے جواب سے محروم رہوں۔ یا عقل سے دور آپ کا یہ ارادہ ہے کہ ہر رطب و یابس کا آپ ذخیرہ کرتے جائیں۔ اگر کاغذوں کے جمع کرنے کا شوق آپ کا اس حد تک بڑھ گیا ہے تو آپ ہندوستان کیا علی گڑھ بھی کبھی نہ چھوڑ سکیں گے اور پسماندگان کے لئے ہفتوں نہیں مہینوں کے لئے دفینوں میں سے موتی کی تلاش میں گم رہنے کا مشغلہ چھوڑ جائیں گے خدا کرے کوئی اور نیت بد اس میں شامل نہ ہو۔ آپ نے یہ نہ لکھا کہ قدوائی صاحب ہیں کہاں اور کس ضروری کام میں معروف ہیں کہ آپ کے خط کے ہمرشتہ ان کا خط نہ آیا۔ مجھے اس موقع پر کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی نعش وہاں آکر دفن ہو رہی ہے علی گڑھ سے اپنی غیر حاضری کا سخت صدمہ ہے۔ اتنی مدت ساتھ رہنا اور شفقتوں سے لطف اٹھانا اور ایسے وقت میں وہاں نہ ہونا بدنصیبی نہیں تو کیا ہے۔ یہی امید اب تسکین کے لئے رہ گئی کہ وہ چلے گئے تو کیا اپنی روانگی میں بھی زیادہ دیر نہیں۔ ناگوار خاطر نہ ہو تو میری طرف سے بھی ان کی تربت پر پھول چڑھا دیجئے گا۔

مجھے یاد پڑتا ہے میں نے پچھلے عریضہ میں بھی لکھا تھا اور اب پھر لکھتا ہوں کہ یہ بیماری کا مشغلہ اچھا نہیں۔ کوئی عضوی بیماری تو خیر غیر اختیاری چیز ہے لیکن باقی عام بیماری کو تو میں اختیاری چیز سمجھتا ہوں۔ جب مالی حالت اچھی نہ ہو تو اس سے بچنا ہی اچھا ہے۔ آپ تندرست رہنے کا طے کر لیجئے اور ڈاکٹر حکیم کی دوستی کم کر دیجئے میں دعا کرتا ہوں کہ آپ معہ اپنے خاندان کے اچھے ہوں اور رہیں۔ آمین۔ مہاتما گاندھی کا قتل ایک جہاں کا مصیبت ہے۔ یہ جو کچھ ہوا اس کے آثار بہت پہلے سے ظاہر ہو رہے تھے۔ اب تو ہجرت کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن جائیں کہاں۔

اس لعنتی ملک کے رہنے والوں کو تو کوئی ملک بھی قبول نہیں کرتا۔ تم نے اپنی حالت کے مطابق جو شعر لکھا وہ غالباً مذاق کے پیرائے میں ہے ورنہ میں جانتا ہوں تم اس حالت سے مطمئن نہیں ہو۔ تم کو ابھی کام کرنا ہے اور مفرور کرتے رہوگے بھائی تم کو مجھ سے محبت ہے اور یہ تم جانتے ہو کہ محبت کی آنکھیں ہمیشہ خوبی کو دیکھتی ہیں بلکہ اکثر و بیشتر برائیاں بھی اسے خوبی معلوم ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو میرے خطوں میں لذت آتی ہے۔ ورنہ میں جانتا ہوں کہ میں کیا ہوں اتنا احساس ضرور ہے کہ خوش نصیب ہوں۔ آجتک محبت کرنے والوں نے اچھالا۔ جبتک علی گڑھ میں رہا محبت والوں کے خلوص کے سہارے بڑھا۔ پاکستان میں آکر معلوم ہوا کہ یوسف بے کارواں کیا ہوتا ہے۔ توبہ توبہ یوسف کیسا؟ ہاں مطلب یہ ہے اپنی قیمت معلوم ہو گئی۔ علی گڑھ کی دنیا بھی بدل چکی ہے لطف زندگی اب وہاں بھی نہ ملے گا۔ لیکن پھر بھی علی گڑھ علی گڑھ ہے۔

نواب صاحب قبلہ کو صدمہ ضرور ہوگا لیکن جس خاندان اور جن روایات میں ان کی پرورش ہوئی تھی وہ انسان کو کوہ وقار و صبر تحمل بنا دیتی ہے۔ یہ صفات ہمارے نواب صاحب میں بدرجہ اولیٰ ہیں۔ خدا ان کو خوش رکھے گا انشاءاللہ۔ میرا سلام کہئے گا۔

بھیرہ۔ ضلع سرگودہا۔ مغربی پنجاب
۱۱ مارچ ۱۹۵۴ء

محبت نامہ مورخہ ۱۴ فروری اور وہ لفافہ جس میں ڈاکٹر صدیقی صاحب کا کارڈ ملفوف تھا آج مجھے یہاں ملے۔ میں ۱۴ فروری کو ڈیرہ غازی خاں سے لاہور کی طرف سے روانہ ہوا۔ وہاں دو ایک روز قیام کے بعد سرگودھے آیا اور پھر یہاں پہونچا۔ آپ کے مکتوب گرامی کو یوں میرا پیچھا کرنا پڑا اور ظاہر ہے اس میں وقت لگتا۔ میں ابھی تک اپنے مستقبل کے متعلق کچھ طے نہیں کر پایا۔ کراچی اور ڈیرہ غازی خاں والے وہاں مجھے روکتے رہے۔ لاہور والوں نے اپنے جال پھیلائے۔ سرگودہے پہنچا تو وہاں کی بیڑیاں کافی سخت گیر ثابت ہوئیں۔ ایک مکان بھی میرے لئے لے لیا گیا۔ لیکن میں ہر جگہ غیر مطمئن اور تماشہ بیں بنا رہا۔ یہاں وطن میں اس نیت سے آیا تھا کہ بزرگوں کی قبروں پر آنکھیں بچھاؤں اور فاتحہ پڑھ لوں لیکن یہاں کی بندھنیں بہت سخت نکلیں۔ ایک مکان لے لیا گیا اور وہ مرمت اور صفائی طلب تھا۔ کام شروع کرایا لیکن بارشیں امسال اس نواح میں بے طرح ہو رہی ہیں۔ کام ہو نہیں سکتا۔ میں تقریباً گھر میں قید ہوں۔ دل گھبراتا ہے لیکن بے بس ہوں۔ آپ دور ہیں ورنہ کوئی صورت نجات کی نکل آتی۔ زمانے کے تیز دھارے پر میری حالت ایک بےکس تنکے کی ہے۔ یہ قصبہ پہلے کبھی اچھا تھا۔ اب سخت گندہ ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ پناہ گزینوں کی کثرت اور بارش کے سلسلے نے اس کو اور تباہ حال کر رکھا ہے۔ علی گڑھ کی یاد کسی وقت دل سے نہیں جاتی۔ زندگی سمٹ کر محبت کرنے والوں کے

خطوط پڑھنے اور جواب لکھنے پر منحصر ہو رہی ہے۔ کتاب دیکھے مدتیں ہوگئیں۔ اخبار بھی کبھی کبھار دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ بیکاری ہے اور پُرانے احباب کی دعوتیں۔ اور وہ بھی ایسے وقت میں جب معدہ ضعیف ہو چکا ہے اور دانت گِر چکے ہیں۔

قدوائی صاحب کے خط کے جواب کا ابتک انتظار ہے۔ ان کو سرسید کے جانشینوں کو آخری ٹھکانے تک پہنچانے سے فرصت ملے تو زندہ محب کی یاد ان کو آئے۔ ملیں تو میرا سلام شوق کہدیجے اور کہئے غالب کے بقول ایک رہینِ ستمہائے روزگار ابتک ان کی یاد سے دل کو بہلایا کرتا ہے۔ وہ وائس چانسلرہیں یا کسی صوبہ کے گورنر ہیں کام کے آدمی۔ لیکن وقت ان کو اچھا نہیں ملا۔

بھائی میں خط کیا لکھتا ہوں ورق سیاہ کرتا ہوں۔ یہ تمھاری محبت ہے جو میری تحریر میں لذت پیدا کر دیتی ہے اور یہ بھی اپنی خوش نصیبی کا صدقہ سمجھتا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کی وفات کے بعد جو ہنگامہ وہاں ہوا نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ دنیا پر کیسی کیسی آفتیں آئیں لیکن واہ رے علی گڑھ۔ میرے محبوب علی گڑھ تیری اداؤں میں فرق نہ آیا۔

علامہ کیفی صاحب تو بہت بے کیف ہوں گے۔ میرا سلام اُن سے کہئے اور عرض کیجیے کہ سندھ کی سرزمین اُن کو راس آئے گی۔ مُرید خیر خطہ ہے۔ لیکن پیر کو سر کی بازی لگانا پڑتی ہے۔ بن جائے تو نعوذ باللہ خدائی کریں۔ نہ بنے تو قبر سے بھی محروم۔ لیکن اس میں سندھ کو کیا خصوصیت ہے۔ سدا بہار قدر دان البتہ ان کو علی گڑھ میں ہی میسر آئیں گے۔

خدا کا شکر ہے آپ کی صحت اب بہتر ہے گو یہ سُنکر افسوس ہوا کہ اس کا مصرف آپ بیکار زندگیوں کے احوال دنیا کے سامنے پیش کرانے میں کر رہے ہیں۔ آپ سمجھئے۔ لو اب کاغذ جواب دے گیا اور ابھی لکھنے کو بہت کچھ تھا۔ گھر میں دعا۔ والسلام

کراچی۔ ۲۰ مئی ۱۹۴۸ء | ۱۱ مئی کا محبت نامہ ۱۸ مئی کو مل گیا۔ علی گڑھ سے چلے آنے کے بعد بہت کم لوگ ایسے تھے جن سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ تھوڑی ہی مدت میں یہ سلسلہ سکڑتا گیا۔ جب ایک مُدت سے آپ کا بھی خط نہ پایا تو میں مایوس ہو گیا۔ اسی عرصے میں آپ کا ارسال کردہ اپریل کا 'مصنف' کا پرچہ بھی ملا تھا "بات اور صرف ایک بات" میں آپ نے جو کچھ لکھا خوب لکھا۔ تمھیں یقین آئے یا نہ آئے جی چاہا کہ فوراً قلم ہاتھ میں لوں اور داد دوں۔ لیکن پھر وضعداری آڑے آئی۔ میرے خط کا جواب اگر کوئی نہ دے تو پھر میں اسے خط نہیں لکھتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ خط کا جواب نہ دینا راہ و رسم کو قطع کر دینے کا مترادف ہے۔

پھر سنو کہ تم نے جو کچھ لکھا خوب لکھا۔ حالات ناساز گار ہیں۔ مگر حق کی دل سے نکلی ہوئی بات رائیگاں نہ جائے گی۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ کانفرنس کے حالات سنکر افسوس ہوا۔ دنیا بدل گئی نہ بدلا تو مسلمان۔ وہ یہاں اور وہاں دونوں جگہ ایک ہی حال میں ہے۔ عملی قوتیں مفلوج ہو چکی ہیں۔ روزی کمانے کے راستے اس پر بند ہیں تو وہ سوائے تخریبی کام کے اور کچھ کرنے کے قابل نہیں رہا۔ ایک دوسرے پر حسد اور طعن اس کا شعار ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کام کر سکتے ہیں اور آپ کو موقع ملے تو آپ قوم کی اچھی خدمت کر لیں گے۔ لیکن نوکری سے آزادی حاصل ہونا لازمی ہے۔ کاروبار سے بڑھکر عزت کی زندگی کسی چیز میں نہیں۔

میں ابھی تک بے خان و ماں ہوں اور بے دوست احباب۔ وہ لوگ جو میرے آستانے پر دن رات حاضری دیا کرتے تھے اب سلام کے لئے ہاتھ اٹھانے کے بھی روادار نہیں۔ یہ ان کا حال ہے جو یہاں آ گئے۔ جو وہاں رہ گئے وہ سلام و پیام کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے۔ دنیا کا یہی حال ہے۔ لیکن خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں اب بھی اپنی روش پر قایم ہوں۔ گدائے متکبر کسی کے آستانے پر حاضری نہ پہلے کبھی دی نہ اب دیتا ہوں۔ اپنی گدائی میں مست ہوں۔ ہاں آپ جیسے مخلص دوستوں کو دیکھ کر دل کو مسرور کرنا چاہتا ہوں وہ میسر نہیں تو یہی کیا کم ہے کہ آپ کی تحریر جنت نظر ہو جاتی ہے۔ جزاک اللہ۔

علی گڑھ آنے کو بہت بے تاب ہوں۔ ان دنوں تو وہاں گرمی کا دور دورہ ہوگا۔ گرمی یہاں بھی کافی پڑتی ہے لیکن ہوا اکثر چلتی رہتی ہے۔ زیادہ ناگوار نہیں ہوتا۔ آم یہاں ملتا ہے لیکن بہت برا۔ وہاں کا آم اور بالخصوص اپنے باغ کا بہت یاد آتا ہے۔ دیکھئے کب تک محروم رہنا پڑتا ہے۔

کراچی - ۱۱ / اپریل ۱۹۴۸ء

اب تو ڈاک کی حالت کافی بہتر ہو گئی ہے اور جو فصل علی گڑھ اور کراچی میں ڈاک کی ابتری کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا وہ کم ہو گیا۔ علی گڑھ سے جب کوئی خط آجاتا ہے تو دل میں ایک خاص مسرت کو محسوس کرتا ہوں، اور بعد مکانی جو ہر گھڑی ان احساسات کو مٹانے میں لگا رہتا ہے پھر اپنی ناکامی سے دوچار ہو جاتا ہے۔ آپ کا افتتاحیہ مجھے پسند آیا غالباً آپ اس کے متمنی ہوں گے کہ جو بھی لکھوں تحسین ناشناسی کوئی ایسی وقیع چیز تو ہے نہیں۔ لیکن سن لیجئے۔ مجھے اس میں ایک شانِ قلندرانہ نظر آئی۔ ہر چند کہ وہ حکمت عملی کے خاکستر میں دبی ہوئی تھی۔ لیکن دل کی گرمی کا پتہ دے رہی تھی۔ میں کہ ادب کی خوبیوں سے قطعاً نا آشنا ہوں اچھے ادیب کی صرف یہ خوبی کو پہنچانتا ہوں اور وہ وہی ہے جو ایک عرب ادیب نے لکھی ہے یعنی اس میں طوالت نہ ہو۔ مگر خلوص ہو۔ ایسا ادب دل کی گہرائیوں سے نکلتا ہے اور سیدھا دل میں اتر جاتا ہے

مجلسِ مصنّفین علیگڑھ کا سہ ماہی

اپریل ۱۹۴۸ء

مُدیر و ناشر

سید الطاف علی بریلوی، بی، اے، (علیگ)

قیمت سالانہ:- للعہ چار روپے

بیت المصنف

کانفرنس کمپاؤنڈ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

باہتمام مولوی منظور احمد خاں منیجر

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ طبع شد

کلچرل میدان میں ہندوؤں نے ہندو یونیورسٹی قائم کی اور مسلمانوں نے مسلم یونیورسٹی شہر شہر اور قصبہ قصبہ اسلامیہ اسکولوں کے ساتھ ہی ساتھ آریہ سماج، دھرم سماج اور خالصہ اسکول بنے۔ طرح طرح کی انجمنوں کے ساتھ قسم قسم کی سبھائیں وجود میں آئیں۔ اردو کی جدوجہد کے ساتھ ہندی کے پرچار کا بھی ہنگامہ ہوا۔ ہندوؤں نے شدھی سنگھٹن چلائی مسلمانوں نے تبلیغ و تنظیم۔ ہندوؤں نے مہا سبھا اور راشٹریہ سنگھ کا زور باندھا۔ مسلمانوں نے مسلم لیگ اور نیشنل گارڈ کی تحریک اٹھائی۔ ہندوؤں نے آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے چودہ نکات ٹھکرائے مسلمانوں نے تقسیم ملک کی ہٹ دھرمی شروع کر دی۔ "کرپس مشن" اور "کیبنٹ مشن" کی آمد کے موقع پر دونوں نے غیر ضروری ضد اور تنگ نظری کا ثبوت دیا۔ کیبنٹ وفد بحث و تکرار کے بعد مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن کی تجاویز کو مان لیا تو کانگریس نے آسام کا قضیہ کھڑا کر دیا اور تقسیم پنجاب و بنگال کے مطالبے پیش کر دئے۔ بڑی کش مکش کے بعد تقسیم در تقسیم کے بعد ہندوستان و پاکستان کی دو آزاد حکومتیں قائم ہوئیں۔

---

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے کچھ پہلے دونوں مملکتوں کی پر تعصب اقلیتوں کے بارے میں کبھی ایک متفقہ اعلان شائع ہوا کہ "پچھلے گناہ معاف۔ جملہ حقوق محفوظ۔ اور جان کی امان دے دی گئی۔"

لیکن توبہ کیجئے۔ یہ اعلان ایک دن بھی یاد نہ رہا۔ کاغذ کی سیاہی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ عفریت انتقام اپنی پوری ہیبت ناکی اور درندگی کے ساتھ ناچ رہا تھا۔ ہر سال اس کی چیر پھاڑ میں مصروف ہو گیا۔

اس چیر پھاڑ کا سب سے زیادہ تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ ——— :

"بزدلی کو بہادری اور کمینہ پن کو شرافت کا نام دیا گیا!!"

جس وقت تک انگریزی پولیس۔ فوج اور اس کے علم بردار موجود تھے۔ پاکستانی و ہندوستانی علاقوں کے سارے کے سارے "مجاہد" اور "سورما" سخت سے سخت اشتعال انگیزی کے باوجود اپنے گوشۂ ملامت میں منہ چھپائے پڑے رہے۔ لیکن جوں ہی کمزور کے لئے انگریزی سرپرستی مشترکہ فوج کی حفاظت اور مختلف مذاہب والوں کی مخلوط "سول سروس" ختم ہوئی "بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹ پڑا" جس مفسد و بزدل کو دیکھو مدبر و رستم زماں بنا پھر رہا ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ اپنی جماعت تنظیم اور ہتھیاروں کے پرائیویٹ ذخیروں کے باوجود ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے یہ لوگ کہاں تھے۔ محلہ محلہ اور گاؤں گاؤں ہندوستان میں مسلم لیگ کے کارکن اور پاکستان میں اکالی پارٹی اور راشٹریہ سنگھ کے ورکر ایک دوسرے کے خلاف زہر اگلتے پھرتے تھے۔ مگر کوئی نہیں کہتا تھا کہ تمہارے منہ میں کے دانت ہیں۔ آج کیا بات ہے کہ ایک ہی شخص چند منٹ پہلے سرحد کے اُس پار کمزور و بزدل اور

چند منٹ بعد سرحد کے اُس پار درندگی و خونخواری کا بھوت بن جاتا ہے۔
اصلی بہادر ہر جگہ اور ہر وقت بہادر ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ جب زبردست کا مقابلہ ہو تو بھیگی بلی اور کمزور سے واسطہ ہو تو ببر شیر۔ کوئی بھی قوم ہو اُس کی تہذیب و شرافت میں سب سے بڑی اور سب سے بنیادی صرف یہی ایک چیز دیکھی جاتی ہے۔

غریبوں۔ کمزوروں اور بے بس مخلوقِ خدا پر ہندوستان اور پاکستان میں جو بیتا پڑی۔ اُس نے ساری دُنیا میں دونوں قوموں اور ملکوں کا نہ صرف ہمیشہ کے واسطے منھ کالا کر دیا۔ بلکہ آزادی و حکومت کا بھی نا اہل قرار دے دیا۔
"سکندر" نے پنجاب کے راجہ "پورس" کو شکست دی۔ شکست خوردہ راجہ گرفتار ہو کر فاتح کے سامنے پیش ہوا تو سوال کیا گیا کہ:-
"بتاؤ تمہارے ساتھ کیسا سُلوک کیا جائے۔؟"
جواب دیا:- "جیسا ایک بہادر۔ بہادر کے ساتھ کرتا ہے۔"
سکندر نے پورس کو گلے سے لگا لیا اور مفتوحہ ملک اُس کو واپس کر دیا۔ اِسی بہادری اور جوہرِ شرافت نے رہتی دُنیا تک کے لئے سکندر کو "سکندرِ اعظم" بنا دیا۔ لیکن آج کیا ہو رہا ہے:-
"میں فوج کا ایک ادنٰے اور غریب سپاہی ہوں۔ میرے جنرلوں نے مجھ سے دغا کی۔ میدانِ جنگ میں مجھے چھوڑ کر خود بھاگ گئے۔ میں گرفتار ہوا۔ میں نے اپنی غلطی کی گڑگڑا گڑگڑا کر معافی مانگی۔ مجھے علی الاعلان معاف بھی کر دیا گیا۔ مگر جب میں خوش خوش گھر لوٹنے لگا تو پیچھے سے میری پیٹھ میں چھُرا گھونپ دیا گیا۔ میرا مکان چھین لیا۔ اور میرے بے قصور بال بچوں اور بوڑھے ماں باپ کو یا تو تہِ تیغ کر دیا گیا اور یا خانماں برباد کر دیا گیا۔"
بتاؤ! کیا یہ بہادری ہے؟ کیا یہ پابندیٔ عہد ہے؟ کیا یہ شرافت ہے؟ دُنیا اِس واقعہ کو کس نام سے پکارے گی؟ اور آیندہ کا مورخ اس حادثہ کو کس طور پر لکھے گا۔؟

انسانیت و شرافت۔ امن و انصاف اور آزادیٔ وطن کے دیوتا مہاتما گاندھی نے

پاکستان سے سرِ دست قطع نظر کر کے صرف ہند باشیوں کو راہِ راست پر لانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائی۔ عدیم المثال اخلاقی جرأت و حق پرستی کا ثبوت دیا۔ مشرقی و مغربی بنگال اور بہار میں امن قائم کیا۔ مظلوموں کی داد رسی کرائی۔ لیکن دہلی و پنجاب کی آگ میں آ کر وہ کُودے تو خود جل کر بھسم ہو گئے۔ شر۔ خیر پر غالب آ گیا۔ ایک 'مہاویر' ٹوٹے ہوئے دلوں کا آخری سہارا تھا۔ اُس کی زندگی سے کروڑوں بے کس انسانوں کو ڈھارس تھی۔

اُس کی موت بھی ضائع نہ گئی اور بہت بڑا کام کر گئی۔ انسان اور درندوں میں پہلے جو پہچان مشکل ہو گئی تھی وہ کھل کر سامنے آ گئی۔ غلط کار افراد اور جماعتیں رائے عامہ کی تائید سے محروم ہو گئیں۔ دودھ اور پانی الگ الگ ہو گیا۔ اب صرف یہ دیکھنا اور باقی رہ گیا ہے کہ اس دودھ میں بھی تو آگے چل کر زہر نہیں نکلے گا۔

اخبارات کی اطلاعوں اور پیش آنے والے روزانہ واقعات پُر امید بھی ہیں اور مایوس کُن بھی۔ ایک سانس تقویت کا سبب ہوتی ہے تو دوسری اضمحلال کا باعث۔ یہ اُمید و بیم۔ یہ کشمکش۔ اور یہ بے اطمینانی عارضی ہے یا مستقل؟ اس کا فیصلہ دشوار اور سخت دشوار ہو گیا ہے۔ قوتِ عمل مفلوج اور اچھی صلاحیتیں ضائع ہو رہی ہیں۔

کیا ملک و قوم کو ہماری خدمت کی ضرورت نہیں ہے؟ اور اگر ہے تو اُس کے واسطے باعزت اور سازگار ماحول کب پیدا ہو گا؟ کروڑوں انسانوں کی ایک تربیت یافتہ اور کارآمد جماعت کا زیادہ عرصہ بے کار رہنا بہت بڑے ملکی و قومی نقصان کی بات ہے۔

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حُدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

سیّد الطاف علی بریلوی
(مدیر)

علی گڑھ — ۲۵ مارچ ۴۸ء

شذرات

لفٹنٹ کرنل ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد صاحب ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی۔ڈی ایس۔سی۔سی۔آئی۔ای۔ایم۔ایل۔اے (سنٹرل) سابق وائس چانسلر و ریکٹر مسلم یونیورسٹی کا سانحۂ ارتحال ہمارے ملی و ملکی حادثات میں ایک بہت بڑا حادثہ ہے۔ مرحوم ایک غریب گھر کے فرد تھے۔ ذاتی محنت۔ قابلیت سے ترقی کی وہ تمام منزلیں طے کیں جنکا کوئی اولوالعزم سے اولوالعزم انسان تصور کرسکتا ہے۔ ایک ماہر ریاضیات و فلکیات کے اعتبار سے اُن کا تبحر علمی بے مثل تھا لیکن انکی ہمت بلند نے اسی پر بس نہیں کیا۔ بلکہ سیاسی۔ مالیاتی اور تعلیمی میدانوں میں بھی اُنھوں نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دئے۔ تقریباً پون صدی تک سر سید اور اُنکے رفقائے کار نے تعمیر ملی کے کاموں میں لامحدود و لاتناہی جد و جہد کی جو روایات قائم کی تھیں۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب اس سلسلہ اور مکتبۂ خیال کے آخری فرد تھے۔ اب قومی نظریات اور قومی کام کی قدریں یکسر منقلب ہوگئیں اور اُن کے ساتھ ہی ساتھ ایک ایک کرکے پرانے کام کرنے والے بھی یا تو رخصت ہوگئے اور یا موجود ہیں تو بے کار ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی فطرت کے خلاف تھا کہ وہ ایک لمحہ بھی بے کار رہیں۔ اس لئے اپنی ضرورت ختم ہوتے دیکھ کر خود بھی ختم ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب اپنی زندگی میں مقبول بھی تھے اور نامقبول بھی اور یہ صورت حال ہر بڑے آدمی کے واسطے ناگزیر ہے۔ نامقبولیت انتقال کے بعد فراموش ہو گئی۔ صرف مقبولیت اُن کے نام کے ساتھ ہمیشہ باقی رہے گی۔

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب کی رحلت سے مسلمانوں کا جس طرح نقصان عظیم ہوا۔ اسی طرح برادران وطن میں ڈاکٹر مونجے اور بھائی پرمانند آنجہانی کی موتیں بھی ناقابل فراموشی ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ مسلمانوں سے انکا معاملہ کیسا تھا۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اپنے کردار و نظریات میں وہ کس قدر مضبوط۔ دلیر اور مستقل مزاج تھے اور اُن کو عملی جامہ پہنانے میں عیش و راحت اور دُنیوی ترقی کی راہیں ترک کرکے اُنھوں نے کیسی کیسی زبردست قربانیاں کیں اور تکالیف اُٹھائیں تیس تیس سال سے اِن ہندو مشاہیر کے ناموں اور کاموں سے کان گونج رہے تھے۔ اب یہ گونج ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ لیکن ہند جدید کا مؤرخ اُس کا

(مُخالف یا مُوافق) ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

گزشتہ ششماہی میں بہت سے معرکہ کے علمی آدمی بھی ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔ بالخصوص مولوی عبدالرزاق صاحب کانپوری کے انتقال سے تصنیفی دُنیا میں ایک ایسا خلاء ہوگیا جس کو پُر کرنا آسان نہ ہوگا۔ علّامہ شبلی نعمانی کے بعد یہ دوسرے بلند پایہ مُورّخ تھے۔ اُنکی معرکۃ الآرا تالیفات ' البرامکہ ' اور " نظام الملک طوسی " نے قابلِ رشک شہرت و مقبولیت حاصل کی اور یہ کتابیں رہتی دُنیا تک اہلِ علم کے وردِ زباں رہیں گی۔ دُعا ہے کہ جس طرح دُنیا میں آن مرحوم کی خدمت مقبول ہوئی بارگاہِ خداوندی میں بھی اُن کو صلۂ وافر نصیب ہو۔ آمین۔

حضرت ڈاکٹر نواب صدر یار جنگ بہادر مولوی حبیب الرحمٰن خانصاحب شروانی مدظلہ کے نامِ نامی کی 'غبارِ خاطر' اور 'کاروانِ خیال' (مجموعہ ہائے مکاتیب مابین نواب صاحب و مولانا آزاد) کے ذریعہ جو نشأۃِ ثانیہ ہوئی اُس نے موصوف کی دوسری تشنۂ طباعت تصانیف کو بھی منصّۂ شہود پر لانے میں مدد دی۔ چنانچہ آپ کے علمی - تاریخی - اور ادبی بلند پایہ مقالات کا پانچسو صفحات کا مجموعہ " مقالاتِ شروانی " چھپ کر مشاہیرِ اہلِ علم اور ملک کے مشہور کتب خانوں اور تعلیمی اداروں کو بلا قیمت تحفۃً روانہ کر دیا گیا۔ جس طرح علّامہ شبلی نعمانی نے خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ کی سوانح عمریؔ " الفاروق " لکھی تھی۔ اُسی طرح ایک زمانہ گزرا نواب صدر یار جنگ بہادر نے خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ کی لائف " سیرۃ الصدیق " تالیف فرمائی تھی۔ کتاب کا شمار نہایت مشہور و معیاری کتابوں میں تھا۔ الفاروق کی طرح اِس کے بھی متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔

مولانا ظفر علی خانصاحب نے 'الفاروق' کا انگریزی ترجمہ کیا تو خیال تھا کہ نواب صاحب قبلہ کی یہ قیمتی کتاب بھی اس بین الاقوامی زبان میں منتقل ہو جائے۔ اللہ کا احسان ہے کہ یہ کام ہوگیا۔ ہمارے عزیز دوست ڈاکٹر سیّد معین الحق صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی اُستاد شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی نے کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور " شیخ محمد اشرف لاہوری " نے بہت نفیس طریقہ سے اُس کی طبع و اشاعت کا انتظام کر دیا۔

اب آجکل نواب صاحب کا ' اردو دیوان ' مدینہ پریس بجنور میں اور ' دیوانِ فارسی ' ہماری " نیشنل پرنٹرس کمپنی " کے زیرِ اہتمام ہمارے " مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ " میں زیرِ طبع ہے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے نئے آنریری جوائنٹ سکریٹری شفاء الملک حکیم عبداللطیف صاحب

فلسفی ایک ذہین و طباع عالم و ادیب ہیں۔ آپ کی قریب ایک درجن چھوٹی بڑی علمی تصانیف ہیں۔ ہندی، اردو زبان و رسم الخط کا آج کل جو افسوسناک و جارحانہ قضیہ درپیش ہے۔ اِس پر بے نتیجہ شور و غوغا کرنے کے بجائے آپ نے پنڈت سندر لال صاحب اور ڈاکٹر بھگوان داس صاحب کی "ہندوستانی کلچر سوسائٹی" کی تقلید میں اپنی تازہ تصنیف "ہماری طب میں ہندوؤں کا ساجھا" ہندی اور اردو دونوں رسم الخطوں میں متوازی کالموں اور لائنوں میں چھپوائی ہے۔ اس طریقۂ طباعت کا یہ فائدہ ہوگا کہ ہندی یا اردو رسم الخطوں سے قطعاً ناواقف لوگ اُن کو آسانی اور بہت جلد سیکھ جائیں گے۔ نیز کسی بھی رسم الخط کے ساتھ ناانصافی کا محل باقی نہ رہے گا۔

شفاءالملک صاحب کی رہنمائی سے علیگڑھ کی "نیشنل پرنٹرس کمپنی علی گڑھ" نے بھی استفادہ کیا ہے۔ اور اس کا بچوں کا ماہوار رسالہ "دھنک" (دھنش) بھی اسی ماہ اپریل میں نہایت دیدہ زیب اور ہندی اردو متوازی رسم الخطوں میں شائع کیا جارہا ہے۔ اِس رسالہ کی زبان عام فہم اور روزمرہ کی بول چال ہوگی۔ اِس کی ایڈیٹری کے لئے مشہور اہل قلم مرزا شبیر بیگ صاحب سابق اسسٹنٹ ایڈیٹر و ایڈیٹر "مدینہ" بجنور۔ "زمزم" لاہور۔ "فشور" دہلی۔ "غنچہ" اور "صبح وطن" کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ حکیم صاحب کی کتاب اور رسالہ "دھنک" کا حسب دلخواہ خیر مقدم ہوا تو ارادہ ہے کہ بڑے پیمانہ پر اس کام کو وسعت دی جائیگی۔ انشاءاللہ!

تہافت الفلاسفہ:۔ امام غزالیؒ کی وہ معرکتہ الآرا تصنیف ہے جس میں اُنھوں نے فلاسفۂ قدیم کے اُن نظریات کی جو مذہب اسلام کے اصول اور عقائد کے خلاف ہیں تردید کی ہے۔ اس کتاب کی افادیت اس لحاظ سے بہت زیادہ ہے کہ جس قدر اعتراضات اور جوابات انسانی تخیل میں آسکتے ہیں وہ سب پیش کرکے فلاسفہ کے اصول کی عظمت پر خاک ڈال دی ہے۔ اس کتاب کا پہلا مسئلہ بہت ہی اہم ہے کیونکہ قدامت عالم پر فلاسفہ اور متکلمین میں بہت لمبی چوڑی بحثیں خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں چھڑی رہیں۔ اس کتاب میں صرف فلاسفہ کے نظریات کی تردید کی گئی ہے۔ کوئی بات ثابت نہیں کی گئی ہے۔ انگریزی یا اردو میں ابتک اس کتاب کا کوئی ترجمہ نہیں ہوا۔ اِس سلسلہ کی امام غزالیؒ کی ایک دوسری کتاب "مقاصد الفلاسفہ" کا البتہ حیدرآباد میں ترجمہ ہو رہا ہے۔ علامہ شبلیؒ نے اِس کا ترجمہ شروع کیا تھا مگر نہ معلوم کیوں چھوڑ دیا۔

ابوالقاسم محمد میاں صاحب انصاری بحرالعلومی خلف مولانا عبدالرشید صاحب فرنگی محلی بی اے

(آنرز) ریسرچ اسکالر فلاسفی ڈیپارٹمنٹ ہماری "کانفرنس اکیڈیمی آف اسلامک ریسرچ" میں زیر نگرانی خاص جناب پروفیسر میاں محمد شریف صاحب و شفاء الملک حکیم عبد اللطیف صاحب ترجمہ کر رہے ہیں۔
کانفرنس اکیڈیمی کے ایک دوسرے ریسرچ اسکالر مسٹر فصیح احمد کمالی ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی اصل و ترجمہ کو انگریزی زبان میں منتقل کر رہے ہیں ـــــ ہر دو تراجم کافی مقدار میں ہو چکے ہیں اور اُمید ہے کہ جلد اشاعت پذیر ہو سکیں گے۔

تہافت الفلاسفہ کی طرح **الجواہر الغالیہ** کا بھی اکیڈیمی ترجمہ کرا رہی ہے۔ یہ کتاب علامہ خیر آبادی کا وہ کارنامہ ہے جس کی حلقۂ فلاسفہ میں جتنی قدر کی گئی اور کیجا رہی ہے کم ہوگی۔ اس رسالہ میں شمس العلماء علامہ عبد الحق خیر آبادی نے مابعد الطبیعات کے تمام اہم مسائل کے متعلق قابل ذکر فلاسفہ کے خیالات کا نہایت مختصر طور پر تذکرہ کیا ہے اور ساتھ ہی اپنے خیالات کا بھی اظہار کیا ہے۔ علامہ نے کوشش کی ہے کہ کسی بھی مسئلہ کو تشنہ نہ رکھا جائے۔ جہاں کہیں دوسرے فلاسفہ کے خیالات اُنھیں صحیح معلوم ہوئے اُنھیں برقرار رکھا اور جہاں کہیں اُن میں کسی قسم کی کوتاہی پائی اُنھوں نے اپنے دلائل پیش کر کے صحیح نظریہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ مابعد الطبیعات پر اس قسم کی کتابیں عام طور پر کم لکھی گئی ہیں۔
یہ کتاب ترجمہ ہونیکے بعد غیر عربی داں فلسفیوں کیلئے ایک بڑی مدد ثابت ہوگی۔ جہاں تک ہمارا علم ہے ابھی تک نہ تو انگریزی اور نہ ہی اُردو میں کوئی ایسی کتاب شائع ہوئی ہے جس میں عربی فلسفہ کے تمام نکات کو بیان کیا گیا ہو۔ اس کتاب کے ترجمہ کے بعد مغرب و شرق کے اُن حلقوں میں جہاں فلسفۂ اسلام کے متعلق کچھ غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں ثابت ہو جائیگا کہ مسلمان مابعد الطبیعاتی مسائل میں کس قدر غور و خوض کر چکے ہیں۔ بہرحال یہ کتاب فلسفہ کا ایک نہایت بیش قیمت خزانہ ہے جس سے ابھی تک کم لوگ متمتع ہو سکے ہیں۔ ہماری کانفرنس اکیڈیمی کے تیسرے ریسرچ اسکالر مسٹر عمر حیات خاں ایم۔اے "الجواہر الغالیہ" کے ترجمہ کی خدمت پر مامور ہیں اور جناب شفاء الملک حکیم عبد اللطیف صاحب اور پروفیسر میاں محمد شریف صاحب اُنکے کام میں بھی نگرانی خاص فرماتے ہیں۔

اللہ رب العزت مندرجۂ بالا اجل علمی و تصنیفی کاموں کے واسطے واجبی سہولتیں اور اُنکی تکمیل و اشاعت کے لئے ضروری امن و عافیت ارزانی فرمائے۔ آمین!

سید الطاف علی بریلوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پانی پت کا خونین میدان

(از سید جالب مرحوم دہلوی)

۲

پانی پت پر دونوں فوجوں کی صف آرائی

بھاؤ نے قصبہ پانی پت کی آبادی کو اپنے لشکر کے بیچ میں لے کر اپنے لئے مضبوط لائن تیار کی جس کے گرد ساٹھ فیٹ چوڑی اور بارہ فیٹ گہری خندق کھدوائی اور جو مٹی اس کھدائی میں نکلی اس سے اونچا دمدمہ تیار کرا کے اُس پر اپنی بھاری توپیں قائم کیں اور اس مضبوط حصار کے اندر مرہٹہ سرداروں کے کمپ الگ الگ قائم ہوئے۔ ہر کمپ کے گرد پہرہ چوکی کا انتظام تھا اور سردار کے خیام کمپ کے وسط میں نصب کئے گئے۔ جن میں ایک حصّہ زنانہ ڈیروں کا تھا۔

احمد شاہ ابدالی مرہٹوں کے پیچھے جب پانی پت پر پہنچا۔ اور اس نے مرہٹوں کو مضبوط لائن کے اندر دیکھا تو چار کوس آگے بڑھ کر ایک مقام کو جو شمال مغرب کی طرف قصبہ پانی پت کے عین مقابل تھا اپنے لشکر کے قیام کے لئے پسند کیا اور افغانوں نے اپنے ملک کے دستور کے موافق پتھروں اور درختوں کے تنوں سے سنگھڑین حفاظت کے لئے بنائیں اور اُن کے عقب میں توپیں لگائیں۔ لشکرگاہ کے اندر افغان و روہیلہ سرداروں کے کمپ الگ الگ قائم کئے گئے اور ہر سردار کی طرف سے اپنے کمپ کے سامنے دیدبانی اور حفاظت کا انتظام کیا گیا۔ دن کو ایک کمپ کے آدمی دوسرے کمپ میں

جاتے اور مشاغل تفریح میں شریک ہوتے تھے۔ شاہ ابدالی نے اپنے خیام قریباً وسط لشکر میں لگائے تھے اور کیمپ کے اگلے حصّے میں بھی ایک لال ڈیرہ نصب کیا تھا۔ جس میں شاہ روزانہ چند گھنٹہ گزارتا اور دشمن کے لشکر کی خبریں سنتا تھا۔ اور گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے کیمپ کے گرد چکر لگاتا اور بعض اوقات پانی پت کی طرف بڑھ جاتا تھا۔

گرد و نواح کی لڑائیاں

بھاؤ نے پانی پت پہنچنے سے قبل ہی گوبند راؤ پنڈت بوندیلے کو جو پیشوا کی طرف سے بوندیلکھنڈ اور انتربید (دوآبہ مابین گنگ و جمن) کے غربی حصّوں کوڑہ جہان آباد۔ اٹاوہ وغیرہ کے علاقوں میں تحصیل وصول مالگذاری پر مامور تھا۔ یہ حکم بھیجدیا تھا کہ اپنے علاقے سے وہ مرہٹوں کی امداد کے لئے فوج فراہم کرے اور افغانوں کے لشکر کی رسد کو روکے۔ گوبند راؤ بوندیلے اس کام میں خاص مہارت رکھتا تھا اور نجیب الدولہ پر مرہٹوں کی چڑھائی کے وقت اس نے گنگا کو عبور کر کے روہیلوں کے سینکڑوں گانوں تباہ و ویران کر دیئے تھے۔ بھاؤ کے حکم سے اُس نے دس بارہ ہزار فوج اکٹھی کی اور میرٹھ کو اپنا مستقر بنایا۔ اُس کے رسالے والے شاہ ابدالی کے لشکر کے عقب میں دُور دُور رہ کر گانوؤں کو تاراج کرتے اور رسد لانے والی پارٹیوں کو لُوٹتے رہے۔ پانی پت سے لیکر دہلی تک ذرائع آمد و رفت پہلے ہی مرہٹوں کے ہاتھ میں تھے۔ اس لئے گوبند راؤ بوندیلے نے جب روہیلوں اور بنگش کے علاقوں سے لشکر ابدالی میں رسد پہنچنے کی روک تھام کی تو افغانوں کو قلتِ اجناس خوراک سے بیحد تکلیف پہنچنے لگی اور بعض روایات کے بموجب چاول کا بھاؤ دو روپے سیر اور آرد گندم کا ایک روپے سیر تک لشکرِ ابدالی میں چڑھ گیا۔ افغان اِس طریقۂ جنگ کے عادی نہ تھے۔ اِس لئے وہ پریشان ہوئے لیکن اُن کے ہندوستانی رفیقوں نے شاہ کو ترکی بہ ترکی جواب دینے کی صلاح دی اور وزیر اعظم کے بھانجے عطائی خان کو جس کا باپ سردار عبدالصمد خاں کنج پورہ میں مرہٹوں کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔ پانچ ہزار افغان سواروں کے ساتھ گوبند راؤ کی دستبرد کی روک تھام کے لئے مامور کیا گیا اور عنایت خان خلف حافظ رحمت خان رئیس بریلی کے رسالے کے پانسو جوان افغانوں کی رہ نمائی و امداد کے لئے دیئے گئے۔ عطائی خان سہ پہر کو لشکر شاہ سے خاموشی کے ساتھ نکل کر غازی الدین نگر کو جس کے نواح میں بوندیلے کی موجودگی کی اطلاع ملی تھی روانہ ہوا اور رات بھر میں چالیس کوس کی منزل طے کر کے طلوع آفتاب کے ساتھ اس مقام پر جا پہنچا جہاں گوبند راؤ پنڈت ڈیڑھ ہزار آدمیوں کے ساتھ ایک آموں کے باغ میں مقیم تھا۔ افغانوں کو

یکایک اپنے سروں پر پاکر گوبند راؤ پنڈت اور اُس کے سواروں سے کچھ بن نہیں پڑا اور چوں کہ بوندیلے کا سن پچھتر سال سے متجاوز ہو چکا تھا اور جسم بہت فربہ تھا اس لئے جلد سوار ہو کر نکل بھاگنے کا اس کو موقعہ نہیں ملا اور عطائی خان کے سواروں نے اُس کو قتل کر ڈالا۔ اُس کے سپاہیوں کا سامان لوٹ لیا اور گوبند راؤ پنڈت کا سر کاٹ کر ساتھ لائے اور احمد شاہ ابدالی کی خدمت میں اُس کو نذر گذرانا۔ شاہِ موصوف نے اِس مہم کے سر کرنے پر اُس کو خلعت دیا۔ اور اس کے بعد لشکر شاہ میں فرخ آباد اور روہیلکھنڈ سے رسد پہنچنے لگی۔

گوبند راؤ پنڈت بوندیلے جیسے قابل و تجربہ کار سردار کے مارے جانے سے بھاؤ کو قدرتی طور پر سخت رنج پہنچا۔ اور شجاع الدولہ کی معرفت اندرونی طور پر جو گفت و شنید صلح کی بات قریب قریب علانیہ ہو رہی تھی اور جس میں مرہٹہ بتدریج شاہ ابدالی کے افغانستان واپس چلے جانے کے سابق مطالبہ کو چھوڑ کر پہلے لاہور اور بعد ازاں سرہند تک افغانوں کی حکومت میں داخل ہونے اور شجاع الدولہ و سردارانِ روہیلہ و نواب بنگش کے علاقوں پر کوئی دست درازی کئے بغیر اپنی فوجوں کو دکن واپس لیجانے پر رضا مند ہو گئے تھے وہ بند ہو گئی۔ بھاؤ کا دعویٰ تھا کہ گوبند پنڈت صرف اپنے لشکر کے لئے رسد فراہم کرتا تھا اور اُس کو اس طریقے پر دھاوا کر کے قتل کر ڈالنا جائز نہیں تھا۔

اِس واقعہ کے بعد شاہ ابدالی نے جہان خان کو چھ ہزار سواروں کی جمعیت کے ساتھ مرہٹوں کی رسد لانے والی پارٹیوں کی گرفتاری کے لئے اور شاہ پسند خان کو اسی قدر جمعیت کے ساتھ پانی پت کے آس پاس کے دیہات کو تباہ کرنے کے لئے مامور کیا اور بہادر خان کو چھ ہزار سواروں کے ساتھ مرہٹوں کی لائن کی نگرانی سپرد کی۔ جہان خان کے آدمیوں سے مرہٹوں کی رسد لانیوالی جماعتوں سے کئی بار مقابلے ہوئے اور اُن کی رسد افغانوں نے چھین لی۔ بہادر خان کے سپاہی مرہٹہ کیمپ کے گرد لگے رہتے تھے اور جو آدمی باہر نکلتے تھے اُن کو گرفتار کر لاتے تھے۔ کہا جاتا ہی کہ شاہ نے پہلے عہ/ اور بعد ازاں صہ/ فی سر انعام مقرر کیا تھا اور احمد خان بنگش مرہٹوں کو زندہ گرفتار کر کے لانے پر دو روپے سے صہ/ فی کس تک انعام دیتے تھے۔ اِن ماخوذین کو احمد خان دن بھر قید رکھتے اور آدھی رات کو غلّہ وغیرہ دے کر چھوڑ دیتے تھے۔ اِسی دوران میں مرہٹوں کو ایک اور بھی نقصان پہنچا کہ نارو شنکر برہمن نے دہلی سے اپنے آدمیوں کے ہاتھ زر نقد اور سامانِ رسد ایک فوجی بدرقہ کی زیر حفاظت مرہٹوں کے لشکر کو روانہ کیا تھا۔ پانی پت کے

قریب یہ لوگ افغانوں کے خوف سے شب کو سفر کر رہے تھے۔ شب کی تاریکی میں اتفاق سے اِس بدرقہ کا ایک حصّہ جس کے پاس روپیہ تھا راستہ بھول کر شاہ ابدالی کے لشکر کی طرف چلا گیا جہاں افغانوں نے تمام آدمیوں کو قتل کر کے اُن کا روپیہ چھین لیا۔

اِن وجوہ سے مرہٹوں کی طرف سامانِ خوراک کی قلّت شروع ہوئی۔ اور جس قدر ذخائر غلّے کے قصبۂ پانی پت میں موجود تھے۔ تھوڑے ہی دنوں میں انہوں نے کھا پی کر برابر کر دیئے۔ سورج مل اور راجپوتانہ کے راجہ اپنے علاقوں سے کچھ رسد مرہٹوں کو بھیجتے تھے اور سورج مل نے کئی مرتبہ روپیہ بھی روانہ کیا۔ مرہٹوں کی ایک دستاویز سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ سورج مل نے ایک کروڑ کی رقم بھیجی جو مرہٹوں کے لشکر میں پہنچ بھی گئی مگر چُوں کہ بنجارے وغیرہ جو غلّہ جان جوکھوں اٹھا کر لاتے تھے اُس کی وہ بہت بڑی قیمت طلب کرتے تھے۔ اِس لئے روپیہ کی قلّت بھی محسوس ہونے لگی اور آخری ایّام میں تو یہاں تک نوبت پہنچی کہ عورتوں کے زیورات اور طلائی و نقرئی ظروف و سامان کو گلوا کر اُن کی اشرفیاں اور روپے اُن ٹکسالوں میں ڈھالے گئے جو مرہٹہ کیمپ میں قائم کی گئیں تھیں۔ الغرض اب مرہٹے گویا محاصرے میں آ گئے اور اس کی مدّت جسقدر طوالت پذیر ہوتی گئی اُن کی تکالیف و مشکلات بڑھتی گئیں۔

تین درمیانی لڑائیاں

ملہار راؤ ہولکر اور جنکوجی سیندھیا اِس طریقۂ جنگ کے پہلے سے مخالف تھے مگر بھاؤ نے ان کے مشوروں پر کان نہیں دھرا۔

جس روز نارو شنکر کا دہلی سے بھیجا ہوا روپیہ اور غلّہ افغانوں کے ہاتھ آ گیا تو ہولکر نے دشمن پر حملہ کرنے کی رائے دی۔ چنانچہ اس کے بعد ایک لڑائی مرہٹوں اور افغانوں کے درمیان ہوئی۔ مرہٹہ مؤرخین اس کو وزیر کی لائن پر باقاعدہ حملہ قرار دیتے ہیں جو ہولکر کی زیر کمان پندرہ ہزار آدمیوں کی جمعیت سے کیا گیا تھا اور مرہٹے دھاوا کرتے ہوئے افغانوں کی صفوف کو توڑ کر وزیر کے کیمپ میں گھس گئے تھے مگر چاروں طرف سے وزیر کو کمک پہنچی تو مرہٹوں پر دباؤ پڑا اور وہ پیچھے ہٹ آنے کے لئے مجبور ہوئے۔ مرہٹوں نے ابتدائی حملے میں دو ہزار پٹھانوں کو قتل کر ڈالا تھا مگر بعد میں اُن کو بھی بقول گرانٹ ڈف ایک ہزار اور فارسی تاریخوں کے بموجب تین چار ہزار آدمیوں کا نقصان اُٹھانا پڑا۔ اور پٹھانوں نے مرہٹہ کیمپ تک ان کا تعاقب کیا۔

دوسری لڑائی کی ابتدا کے متعلق بھی اِسی طرح مرہٹہ و فارسی روایات کا اختلاف ہے۔ مرہٹہ روایات کے بموجب بھاؤ نے وسواس راؤ۔ ملہار راؤ ہولکر۔ بلونت راؤ گنپت مینڈلی اور کئی دیگر نامی

سرداروں کی معیت میں شاہ ولی خان وزیر اعظم پر جو ایک مسجد میں نماز پڑھنے جا رہے تھے حملہ کیا اور وزیر کو چاروں طرف سے گھیر لیا، مگر انہوں نے اپنے حواس برجا رکھے اور کیمپ میں اطلاع بھیجی نجیب الدولہ و دیگر سردار اُن کی امداد کے لئے دوڑے اور سخت خون ریز لڑائی واقع ہوئی نجیب الدولہ اپنے آدمیوں کے ساتھ مرہٹوں کو دباتے ہوئے آگے نکل آئے اور مرہٹوں کے کیمپ کے قریب پہنچ گئے اُس وقت بلونت راؤ کئی ہزار آدمیوں کے ساتھ نجیب الدولہ پر حملہ آور ہوا اور تین ہزار آدمی نجیب الدولہ کے مارے گئے سردار موصوف پر یہ ایک نازک وقت تھا اور مرہٹہ مورخین کا دعویٰ ہے کہ مرہٹے اس روز کی لڑائی قریب قریب جیت چکے تھے۔ نجیب الدولہ اِس طرح گھرے تھے کہ وہ شاید زندہ پلٹ کر شاہ ابدالی کے لشکر میں نہ جا سکتے اور قتل یا گرفتار ہو جاتے۔ مگر شام کے قریب ایک بندوق کی گولی بلونت راؤ کے لگی جس سے اُن کی حالت غیر ہونے لگی۔ بھاؤ اپنے برادر نسبتی و مشیر خاص کو مہلک زخم پہنچنے سے بدحواس ہوگیا اور اُس نے مرہٹوں کو واپسی کا حکم دیدیا۔ سیر المتاخرین و خزانۂ عامرہ کی روایات کے بموجب شاہ ولی خان وزیر کو مرہٹوں نے نہیں آگھیرا تھا بلکہ خود افغانوں نے شام کے حکم سے مرہٹوں کے توپ خانے پر باقاعدہ حملہ کیا تھا اور ان کے تمام سردار اپنی فوجوں کے ساتھ اِس حملے میں شریک ہوئے تھے۔ مرہٹے حملے کی خبر پا کر مقابلے کو نکلے اور دونوں فوجوں میں باہم لڑائی ہوتی رہی نجیب الدولہ نے اِس موقعہ پر زیادہ جوش دکھایا اور اپنے آدمیوں کے ساتھ بندوقیں مارتے ہوئے مرہٹوں کے مورچوں میں گھس گئے جہاں وہ مرہٹوں کے درمیان گھر گئے۔ مگر نجیب الدولہ کے رفقا نے مرہٹوں کے سردار بلونت سنگھ کو بندوق کا نشانہ بنایا جس سے لڑائی کا رنگ بدل گیا۔ نجیب الدولہ کے کئی ہزار آدمی ضائع ہوئے مگر وہ بخیریت مرہٹوں کی لائن سے نکل کر اپنے لشکر میں آگئے۔

تاریخ فرخ آباد میں ایک شبخون کا ذکر ہے جو ابراہیم خان گاردی نے احمد خان بنگش کی فوج پر مارنا اور ایک دم ہلہ کر کے اُن کی توپوں کو چھین لینا چاہا تھا مگر احمد خان کے آدمی ہوشیار تھے اور اُن کی توپوں میں گراب بھرا رہتا تھا، جب مرہٹوں کی آمد کا اُن کو پتہ لگا تو انہوں نے توپوں کو بتی دکھائی۔ جب توپیں چلیں تو گاردی کے سینکڑوں آدمی مجروح و مقتول ہوئے اور وہ واپس چلے گئے۔

اِسی قسم کے ایک شبخون کا تاریخ رام پور میں حوالہ دیا گیا ہے جو نواب فیض اللہ خاں کے ماتحت سردار رضی خان کی فوج پر گاردی کے بھائی فتح خاں نے مارنا چاہا تھا لیکن رضی خان نے

بڑی سرگرمی کے ساتھ دشمن کی مدافعت کی اور مرہٹے تین سو آدمیوں کا نقصان اٹھاکر اور اپنی چند توپیں چھوڑ کر واپس ہو گئے۔ نواب فیض اللہ خاں نے جنگ ختم ہونے کے بعد رام پور واپس آکر رضی خان کو اس روز کی فتح پر خلعت دیا اور ایک موضع جاگیر میں عنایت کیا۔ مرہٹہ مورخوں کی کتابوں میں ان دونوں شبخونوں کا کوئی حوالہ نہیں دیا گیا ہے بلکہ وہ افغانوں پر الزام لگاتے ہیں اور فارسی تاریخوں سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ انہوں نے شب کو دھوکے سے جنگل میں مرہٹوں کے گھسیاروں اور لکڑہاروں وغیرہ پر حملہ کیا اور کئی ہزار آدمیوں کو جان سے مار ڈالا شاہ ابدالی نے صبح کو جاکر دیکھا تو لاشوں اور سروں کے انبار پائے اور مرہٹوں کو جب اس ہولناک واقعہ کی خبر ہوئی تو غم و غصہ کے ساتھ عالم ہراس و اضطراب اُن پر چھا گیا

مصالحت کی سلسلہ جنبانی

یہ لڑائیاں فریقین میں ہو رہی تھیں اور دونوں طرف سے روزآنہ توپیں بھی چلتی تھیں مگر اندرونی طور پر مصالحت کی سلسلہ جنبانی بھی قائم تھی۔ بھاؤ کے پیام شجاع الدولہ کے پاس اور ملہار راؤ ہولکر کے نجیب الدولہ کے پاس آتے تھے اور معتمد علیہ اشخاص بھی آتے جاتے تھے۔ چنانچہ شجاع الدولہ نے راجہ دیبی دت و کاشی راؤ کو بھاؤ کے پاس بھیجا اور بھاؤ نے بھوانی شنکر برادر راجہ نارو شنکر و گنیش راؤ کو روانہ کیا۔ نواب شجاع الدولہ صلح کی طرف مائل تھے اور انہوں نے وزیر کی معرفت احمد شاہ ابدالی کو بھی مطلع کیا۔ احمد شاہ نے کہدیا تھا کہ میں آپ لوگوں کا بلایا ہوا آیا ہوں اگر آپ مرہٹوں سے صلح کرنی چاہیں تو آپ کو اس بارے میں کامل اختیار ہے لیکن اگر جنگ ہوئی تو اس وقت آپ لوگوں کو میری مرضی پر چلنا ہوگا۔ نجیب الدولہ چوں کہ مرہٹوں کے ہاتھوں بہت اذیت پاچکے تھے، اور اُن کے علاقے کو گوبند راؤ پنڈت نے ویران کر دیا تھا نیز بھاؤ کے غرور کا حال اُن کو معلوم تھا جس میں مذہبی تعصب کا رنگ بھی صاف جھلکتا تھا۔ اس لئے انہوں نے ہمیشہ صلح کی مخالفت کی اور کہا کہ اس وقت مرہٹے مجبور و لاچار ہیں۔ اس لئے تمام شرائط ماننے کو تیار ہیں۔ لیکن اس خطرے سے چھوٹنے کے بعد وہ کسی عہد و پیمان کی پرواہ نہ کریں گے۔ شاہ ابدالی اپنے ملک کو واپس چلے جائیں گے اور یہاں ہم سب کے علاقوں کو مرہٹے جی بھر کے تاراج کریں گے اور ہندوستانی امراء کو نان شبینہ سے محتاج کر دیں گے۔ نجیب الدولہ نے شاہ ابدالی کی خدمت میں جاکر بھی اپنے یہی خیالات بیان کئے اور ان کے وزیر اعظم شاہ ولی خان کو بالکل اپنے موافق

کرلیا۔ اس لئے شجاع الدولہ کی کوششیں مصالحت کے متعلق کامیاب نہ ہوسکیں۔ لیکن ہندوستان کے دستور کے موافق آخری معرکہ شروع ہونے کے وقت تک نامہ و پیام بھاؤ اور شجاع الدولہ کے درمیان جاری رہے۔ ملہار راؤ ہولکر اور نجیب الدولہ کے درمیان بھی خفیہ نامہ و پیام ہوتے تھے اور اُن دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ رعایت برتنے کا معاہدہ کرلیا تھا۔ جس کا عملی طور پر نفاذ بھی کیا گیا اور ملہار راؤ ہولکر کے نکتہ چیں اس پر برابر یہ الزام لگاتے رہے کہ اُس نے معرکہ پانی پت میں کافی بہادری نہیں دکھائی اور جان چرا کر بھاگ گیا۔ چنانچہ وٹھل راؤ شیدیو اور ملہار راؤ ہولکر کی ایک مشترکہ عرض داشت بنام بالاجی باجی راؤ پیشوا جو اصل فارسی زبان میں موجود ہے اور جس کا ترجمہ کنکیڈ و پارسنیس کی تاریخ مرہٹہ میں دیا گیا ہے، اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیشوا کو اِسی بنا پر ان سے رنج تھا اور یہ اس کے موردِ عتاب تھے۔ انہوں نے پیشوا کو یقین دلایا ہے کہ ان کی طرف سے کوئی کوتاہی معرکۂ جنگ میں نہیں ہوئی اور یہ محض اتفاق ہے کہ وہ اپنے زخموں سے شفا پا گئے۔

مرہٹوں کی زار و نزار حالت مرہٹوں کی حالت ڈھائی ماہ تک حصار کے اندر پڑے پڑے برابر خراب ہوتی گئی اور جب رسد کے ملنے کا کسی طرف سے سہارا نہیں رہا اور قصبۂ پانی پت کے اصلی باشندے بھی جن کے ذخائرِ اجناس کو مرہٹے ختم کر چکے تھے۔ اُن کے ساتھ بھوک سے مرنے لگے۔ مویشی جو دانہ چارہ میسر نہ آنے کے باعث ہلاک ہوتے تھے۔ اُن کی لاشوں کو پھینکنے یا دبانے کا بھی موقعہ نہ ملتا تھا۔ گویا ایک انگریزی مورخ کے الفاظ میں لاکھوں آدمی مرغیوں کی طرح ایک بڑے کھانچے میں بند تھے۔ جس میں زندوں کی غلاظت اور مرنے والوں کی لاشوں کے سڑنے سے سخت عفونت پھیلی ہوئی تھی۔ جو لوگ حصار سے باہر قدم رکھتے تھے اُن کو پٹھان جو روز افزوں سختی کے ساتھ نگرانی کر رہے تھے سنگوا لیتے تھے۔ آخر میں دو روز تک برابر جب سپاہ کو آذوقہ میسر نہ آیا اور سینکڑوں آدمی گرسنگی سے جاں بلب اور بعض ہلاک بھی ہوگئے تو ہولکر اور بڑے بڑے مرہٹہ سردار بھاؤ کے خیمے پر آئے اور [illegible] نے لشکر کی صورتِ حال بیان کرکے کہا کہ بھوک اور وبائی امراض سے تڑپ تڑپ کر مرنے کی [illegible] یہ بہتر ہے کہ میدانِ جنگ میں مردانہ وار جان دی جائے اور کم از کم بزدلی و نامردی کا الزام اپنے اوپر نہ لیا جائے۔ بھاؤ پہلے ہی صورتِ حال سے بے حد ملول و پریشان تھا۔ اُس نے سرداروں کی اِس رائے سے اتفاق کیا۔ اور سرداروں کے رخصت ہونے پر اپنے ہاتھ سے

پان کے بیڑے ان کو دیئے۔ جو غلہ وغیرہ لشکر میں باقی تھا وہ سب لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیا گیا تاکہ وہ لڑائی پر جانے سے پہلے آخری کھانا پیٹ بھر کھالیں۔ اس کے ساتھ ہی فوج کے تمام حصّوں کو لڑائی کے لئے کمربندی کا حکم سنادیا گیا اور سرداروں اور سپاہیوں نے "کیسری بانے" (زرد لباس) زیبِ تن کئے، جس سے یہ مراد تھی کہ وہ اپنی جان قربان کرنے کو جارہے ہیں۔ آدھی رات کو بھاؤ نے بدست خاص ایک پرچہ دیوان کاشی رائے نواب شجاع الدولہ کے معتمد کارندے کو جس کی وساطت سے گفتگوئے مصالحت ہوتی رہی تھی لکھ کر بھیجا کہ وہ نواب سے کہے کہ "پیالہ اب لبریز ہو چکا ہے اور ایک قطرے کی بھی گنجایش نہ رہی تھی۔ اگر دوست کو کچھ کرنا ہے تو اُس کا یہ آخری وقت ہے ورنہ صاف جواب دینا چاہیئے کیوں کہ نوشت وخواند کا وقت گذر چکا ہے۔"

مرہٹوں کی لڑائی کیلئے پیش قدمی

یہ تحریر بھاؤ کی کاشی رائے کو نصف شب کے بعد پہنچی اور وہ تین بجے کے قریب اُس کا مضمون نواب شجاع الدولہ کو پڑھ کر سنا رہا تھا کہ دیوانِ موصوف کے جاسوس یہ خبر لائے کہ مرہٹے آلاتِ حرب سے آراستہ و پیراستہ ہو کر حصار سے نکل رہے ہیں اور بارادۂ جنگ شاہ ابدالی کے لشکر کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ نواب شجاع الدولہ یہ سن کر فی الفور شاہ ابدالی کے ڈیرے پر گئے اور وہ شاہ کو جگانے کیلئے آدمیوں سے کہہ رہے تھے کہ شاہ موصوف ہتھیار لگائے حجرۂ خواب گاہ سے برآمد ہوئے اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر مرہٹہ لائن کی طرف چلے۔ اِس کے ساتھ ہی اُنھوں نے کاشی رائے کے بلانے کے لئے نواب شجاع الدولہ سے کہا اور جب دیوان موصوف آیا تو اُس کے جاسوسوں کی لائی ہوئی خبر کے متعلق اُس سے مزید تفصیلات دریافت کر رہے تھے کہ چند افغان سپاہیوں کو اپنے لشکر سے پون کوس آگے اُن کو مرہٹہ لائن کی طرف سے واپس آتے ہوئے دیکھا جن کے پاس کچھ مالِ غنیمت بھی تھا۔ شاہ کے دریافت کرنے پر انھوں نے کہا کہ مرہٹوں نے پیش قدمی کرنی چاہی تھی مگر اقبالِ شاہی سے وہ پیچھے ہٹا دیئے گئے اور اُن کا سامان وہ لوٹ لائے۔ شاہ کو یہ متضاد خبر سُنکر تعجب ہوا اور انھوں نے متانت و اطمینان کے ساتھ قلیان (حقّہ) کا سرا اپنے ملازم کے حوالے کرتے ہوئے شجاع الدولہ سے کہا کہ "تمہارے آدمی کی اطلاع کو میں درست پاتا ہوں۔" اس کے بعد فوج کو جلد آگے بڑھنے کا حکم سنایا اور مقابلے کے انتظامات کی بذاتِ خود نگرانی کرنے لگے۔ ابھی شب کی تاریکی قدرے باقی تھی۔ جب صبح کی ابتدائی روشنی ہوئی تو مرہٹوں کی سپاہ قطار در قطار توپوں کو آگے لئے ہوئے بڑھتی نظر آئی۔ دونوں لشکروں میں

مختلف سرداروں کی فوجیں جس ترتیب کے ساتھ قیام پذیر تھیں وہ نقشہ میں دکھائی گئی ہے مرہٹوں
نے پیش قدمی میں بڑے درجے تک اس ترتیب کو قائم رکھا تھا اور شاہ ابدالی نے بھی اپنے سرداروں
کو قریباً وہی ترتیب قائم رکھنے اور آہستہ آہستہ دشمن کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ نواب احمد خان بنگش
کے ساتھ چونکہ فوجی قوت بہت کم تھی اس لئے اُن کو عورتوں کی حفاظت کیلئے چھوڑنا چاہا مگر
نواب موصوف نے کہا کہ عورتوں کی حفاظت محلیوں اور خواجہ سراؤں کے سپرد ہونی چاہیے۔ میرا
کام میدانِ جنگ میں لڑنے کا ہے اور شاہ میری جمعیت کے قلیل ہونے کی پرواہ نہ کریں کیونکہ
انہی تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ میں نے بڑے بڑے میدانوں میں کامیابی حاصل کی ہے۔
اس پر شاہ نے اُن کو میسرہ کی طرف جانے کا حکم دیا اور خود اُس لال ڈیرے میں چلے گئے جس میں
وہ دشمن کی نقل و حرکت دیکھنے اور جاسوسوں کی رپورٹ سننے کے لئے آخری حصہ شب میں اور سہپہر
کو اکثر بیٹھا کرتے تھے اور اب فوج کے آگے بڑھ آنے کی وجہ سے وہ ڈیرہ پیچھے رہ گیا تھا۔

گاردی کی پلٹنوں کا افغانوں پر حملہ

مرہٹوں کی توپوں کے گولے پہلے تو شاہ کی فوج تک نہ پہنچتے تھے اور سامنے میدان میں گرتے تھے۔ اب کچھ
گولے فوج کے درمیان گرے جن سے کچھ آدمیوں کو نقصان پہنچا، مگر چونکہ دونوں فوجیں متحرک
تھیں اس لئے جلد توپوں کے گولے فوج کے اُوپر سے گذرنے لگے اور سپاہیوں کے لئے بے ضرر
ہو گئے۔ یہ کیفیت جب ابراہیم خان گاردی نے دیکھی تو اُس نے بھاؤ کے سامنے جو قلب سپاہ پر
بسواس راؤ کے ساتھ جاگزین تھا حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں جب اپنے آدمیوں کی تنخواہ کا تقاضا
کرتا تھا تو آپ کو ناگوار گذرتا تھا، آج ملاحظہ فرمائیں کہ جو تنخواہ ان لوگوں کی ملی ہے وہ ضائع نہیں
ہوئی ہے اس کے بعد اس نے ایک جھنڈی ہاتھ میں لی اور اپنے آدمیوں کو جو بندوقیں چلاتے
بڑھ رہے تھے حکم دیا کہ وہ فیر بند کر دیں اور بندوقوں پر سنگینیں چڑھا کر افغانوں پر حملہ آور ہوں۔
گاردی کی باقاعدہ فوج کے سنگینوں کے ساتھ ہلّہ کرنے سے روہیلوں کی جو اس وقت ان کے
مقابل تھے صفیں ٹوٹ گئیں اور وہ بھاگنے لگے مگر حافظ رحمت خاں نے جو بوجہ علالت اب تک
صفِ جنگ میں شریک نہ ہوئے تھے اور پالکی میں پڑے ہوئے آرہے تھے جب ان کو بھاگتے
دیکھا تو روہیلوں کو سخت ملامت کی اور اُن کو ساتھ لے کر میدان کی طرف چلے اور عنایت خان
خلف حافظ رحمت خان نے افغان سرداروں کے ساتھ گاردی کے دستوں پر حملہ کیا اور
احمد خان بنگش بھی اس کی مدد کو آگئے۔ گاردی کے آدمیوں نے انتہائی شجاعت و استقامت کا

ثبوت دیا اور اُن پر دباؤ پڑتے دیکھکر دوسرے مرہٹہ سردار بھی اپنی فوجوں کے ساتھ ان کی مدد کو آگئے اور سخت خون ریز لڑائی ہونے لگی۔ دتاجی گائیکوار معہ اپنے آدمیوں کے ابتدا سے گاردی کے ساتھ تھا اور مرہٹے برابر گھسے چلے آتے تھے لیکن اس وقت ابراہیم خان گاردی عنایت خان کے آدمیوں کے ہاتھوں پیہم زخم کھا کر اپنے آدمیوں کو لڑانے کے ناقابل ہوگیا اور دتاجی گائیکوار کے بھی چار زخم لگے۔ اب دونوں فوجیں آپس میں مل گئیں تھیں اور شپاشپ تلواریں چل رہی تھیں۔ مرہٹے چابک دست تھے اور اُن کے سوار تیزی کے ساتھ نقل و حرکت کرتے تھے مگر جب دست بدست لڑائی ہونے لگی تو افغانوں کے بھاری جسم اور ہتھیاروں کا اُن پر بوجھ پڑا۔

وزیرِ شاہ ابدالی پر تنگ وقت

عین اِس حالت میں بھاؤ نے خود اپنی درمیانی تازہ دم فوج کو بڑھا کر وزیر پر دباؤ ڈالا ان کا بھتیجا عطائی خان جس نے گوبند پنڈت بوندیلے کو شباشب چالیس کوس کا دھاوا مار کر غازی الدین نگر میں پہنچکر معہ اُس کے آدمیوں کے قتل کیا تھا وزیر کے برابر مارا گیا اور بعض دیگر افغان سردار بھی قتل ہوئے۔ یہاں اِس قدر خون ریز لڑائی ہوئی کہ آٹھ دس ہزار پیادے کابلی اور ایک ہزار اونٹ زنبورک کے جو وزیر کی خاص جمعیت میں شامل تھے مرہٹوں کے ہاتھوں قتل و بیکار ہوئے اشرف الوزرا معہ دو تین سو سواروں اور ۵۰ اونٹ زنبورک کے اُن کے آگے باقی رہ گئے مگر وزیر نے جو از سرتا پا غرقِ آہن تھا اپنی جگہ نہیں چھوڑی اور اپنے آدمیوں کو برابر للکارتا تھا۔ اِس اثنا میں نواب شجاع الدولہ نے اپنے وکیل سے کہا کہ وزیر کی طرف سے آواز نہیں آتی ہے اس کا کیا سبب ہے؟ خبر لاؤ۔ وکیل گھوڑا دوڑا کر اُدھر گیا تو دیکھا کہ وزیر پر بڑا نازک وقت ہے وہ بھرے ہوئے پڑتا تھا، منہ سے کف جاری تھا اور اپنی فوج کے آدمیوں پر جو جان بچانے کے لئے بھاگے جاتے تھے سخت الفاظ میں غیظ و غضب ظاہر کر رہا تھا کہ نامردو کہاں بھاگے جا رہے ہو؟ ولایت یہاں سے بہت دُور ہے، مگر آدمیوں پر بظاہر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ ایسی حالت میں وکیلِ شجاع الدولہ کو دیکھکر وزیر نے کہا کہ شجاع الدولہ سے جا کر کہو کہ اِس وقت مجھ پر تنگ وقت ہے اگر اب بھی انہوں نے مدد نہ دی تو کب دیں گے۔ وکیل نے فوراً واپس آکر نواب شجاع الدولہ کو اطلاع دی۔ نواب نے کہا کہ اس وقت وہاں تک پہنچنا بہت مشکل ہوگا۔ ابتک نواب کی فوج لڑائی میں پورے طور سے مشغول نہیں ہوئی تھی۔ توپیں زنجیرہ بند کی ہوئی تیار تھیں۔

کئی دفعہ ایسا معلوم ہوا کہ مرہٹے ان پر حملہ آور ہو رہے ہیں اور برچھیاں اور تلواریں چمکتی نظر آئیں مگر دونوں فوجیں بھڑنے نہیں پائیں۔ اب شجاع الدولہ نے خود اپنی فوج کو مرہٹوں پر دباؤ ڈالنے کا حکم دیا اور وزیر کو مدد دینی چاہی مگر وہاں تک پہنچ نہیں سکے۔

نجیب الدولہ کی ہوشیاری

نواب شجاع الدولہ کے بائیں طرف نجیب الدولہ اپنی فوج کو جس کی تعداد روہیلہ سرداروں کی سپاہ موجودہ میدان پانی پت میں سب سے زیادہ تھی اِس طریقے پر آگے بڑھا رہے تھے کہ پیادے آگے آگے اور سوار اُن کے پیچھے تھے اور ایک مستند روایت کے بموجب خود نجیب الدولہ بھی اُس وقت گھوڑے سے اُترے ہوئے اپنے آدمیوں کے ساتھ اگلی صف میں چل رہے تھے۔ بیلدار پیادوں سے آگے بیلچے اور کدالیں لئے ہوئے مٹی کھود کھود کے ڈالتے جاتے اور ایک ہاتھ اونچی دیوار اٹھاتے تھے جس کی اوٹ میں پیادے بڑھتے تھے اور سوار بندوقوں کو اُٹھا کر گولیاں چلاتے جاتے تھے جو پیادوں کے سروں کے اُوپر سے سَن سَن کرتی ہوئی مرہٹوں کی طرف جاتی تھیں اور پیادے بھی دیوار کی آڑ میں ہو کر بندوقیں چھوڑتے تھے۔ اِس اثنا میں بیلدار گولی کے نصف ٹپّے پر آگے مٹی کی دیوار اٹھاتے تھے۔ نجیب الدولہ بہت ہوشیاری و احتیاط کے ساتھ لڑ رہے تھے اور ان کے پاس گولی بارود بھی بافراط موجود تھی اور بانون کے بیسیوں چھکڑے ساتھ تھے۔ نجیب الدولہ کے بالمقابل جھنکوجی سیندھیا کی پوری سپاہ اور ہولکر کے دستے تھے۔ اسی جھنکوجی نے اپنے چچا دتّاجی سیندھیا کے ساتھ شکرتال پر نجیب الدولہ کو بہت تنگ کیا تھا اور اُس کے علاقے کے سینکڑوں دیہات کو تباہ کر ڈالا تھا۔ لہٰذا نجیب الدولہ اِس لڑائی سے اپنا خاص تعلق سمجھتے تھے اور یہی کہہ کر اپنے آدمیوں کو ہمّت دلاتے تھے جھنکوجی خاص طور سے نجیب الدولہ کی فکر میں تھا اور وہ بھی اُس کو مغلوب کرنا چاہتے تھے۔

ہولکر اور نجیب الدولہ کے تعلّقات

برخلاف ازیں ملہار راؤ ہولکر کی نسبت نجیب الدولہ کے دل میں عداوت کے کوئی خیالات نہیں تھے اور یہاں تک مشہور تھا کہ اِن دونوں میں باہم دوستانہ معاہدہ ہو چکا ہے کہ جنگ میں ایک دوسرے کے حال سے تعرّض نہ کرے گا۔ کم از کم ملہار راؤ ہولکر کو اُس کے معاصر مرہٹہ سردار برابر یہ طعنہ دیتے رہے اور بالاجی باجی راؤ پیشوا کے دل میں بھی اِس قسم کا شبہ تھا اور وہ ملہار راؤ کے معرکۂ پانی پت سے زندہ بچ کر نکلنے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ چنانچہ دیتقل اور شدید

سورج مل جاٹ نے کیمپ گنگر ونی واقع مالوہ سے جو خط رگھناتھ راؤ برادر پیشوا کو بھیجا تھا اُس میں رگھوبا کے خطوط صوبہ دار ملہار راؤ ہولکر کے پاس آنے کا ذکر کرکے لکھا تھا کہ "ہم دونوں ایک ہی کیمپ میں ساتھ رہتے ہیں.... پیشوا جو ہم کو خط نہیں لکھتے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ اِس بات پر ناراض ہیں کہ ہم میدانِ جنگ میں کام نہیں آ گئے۔ یہ سچ ہے کہ کوئی شخص موت سے بچ نہیں سکتا مگر جتنا زمانہ کسی کی حیات کا مقدر ہے اس میں اُس کا موت سے بچ جانا بھی ناگزیر ہے۔ یہ محض خدا کی ایک مہربانی تھی کہ ہمیں سخت مجروح ہونے کے بعد بھی آرام ہو گیا۔ یہ کس قدر صحیح ہے کہ "زندگی کے معنی فرض کے ہیں اور حیات خود قوتِ لایموت مہیا کرتی ہے۔" باوجود اس کے ہم کو ندامت کا سخت ناگوار احساس ہے، جو کچھ کہ گذرا ہے اُس کو ہم بھولے نہیں ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہماری تمام کوششیں میدانِ جنگ میں بُری بھلی جیسی کچھ بھی تھیں خدائے قادر و توانا کے غصے کی وجہ سے بیکار ثابت ہوئیں۔"

اِسی طرح ہولکر کے دیوان کی جو چٹھی رگھناتھ راؤ کے نام کنکیڈ نے جلد سوم تاریخ مرہٹہ میں دی ہے اس میں بھی دیوانِ موصوف نے اِس امر پر اظہارِ افسوس کیا ہے کہ "گذشتہ ایام میں سرکار شری پیشوا باجی راؤ نے اپنے مفاد ملہار راؤ ہولکر کو تفویض کئے۔ مگر امسال شریمنت (پیشوا) کے بستر رنج سے پلٹنے کے وقت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صوبیدار (ہولکر) کو ان کا وہ اعتماد حاصل نہیں ہے۔ ملہار راؤ ہولکر کی طرف سے ادائے فرض میں کوئی غفلت نہیں ہوئی۔ جنگِ پانی پت میں شریک ہونے والے جو لوگ بھاگ کر بچ رہے ہیں وہ آں جناب سے ملے ہوں گے اور انھوں نے صحیح احوال آپ سے بیان کیا ہوگا، ایک شکست کو سراہنے سے بھلا کیا فائدہ ہے؟ یہ سب لوگوں کو بخوبی معلوم ہے کہ سرکار کے قدیم ملازمین سیندھیا اور پنوار کا لڑائی میں کیا حال ہوا؟ آں جناب نے صوبیدار کے معاملات دکن میں قرق کئے جانے کی جو اطلاع لکھ کر بھیجی ہے اُس سے اُن پر سخت رنج و مایوسی طاری ہے۔ وہ اکثر شکایات کرتے ہیں کہ اُن کی کوشش کا اگر یہ ثمرہ ہے تو آیندہ کی کیا امید ہو سکتی ہے؟"

اِن تحریروں سے عیاں ہے کہ ملہار راؤ ہولکر کے میدان پانی پت پر دشمن کے مقابلے میں طرح دینے کا خیال پیشوا سے لے کر ادنیٰ اہل کاروں تک سب لوگوں کے دلوں میں جاگزین تھا اور اسی پر پیشوا کا عتاب بھی ہولکر کی جاگیرات دکن کی ضبطی کی صورت میں نازل ہوا تھا ملہار راؤ ہولکر نے خود لڑائی کا جو حال لکھا ہے اس میں بھی اپنی صفائی پیش کی ہو مگر نانا فرنویس کی

ایک مشہور تحریر میں جو حال معرکۂ جنگ کے احوال پر مشتمل ہے ہولکر اور دیگر سرداروں پر بھاؤ کو میدانِ کارزار میں چھوڑ دینے کا صاف الزام لگایا گیا ہے اور خود آخر دم تک "آقا کے ساتھ رہنے" پر فخر کیا گیا ہے۔

نجیب الدولہ اور جھنکوجی سیندھیا کی آویزش

نجیب الدولہ نے اپنے پیادوں کے ساتھ جھنکوجی سیندھیا کی فوج پر دباؤ ڈالا۔ اور بیک وقت دو دو ہزار گولے ان کے سپاہیوں نے مرہٹوں پر پھینکے۔ ان کی آواز سے دل دہلتے تھے اور دھوئیں کی تاریکی میں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اسی دھوئیں کی آڑ میں نجیب الدولہ کے آدمی آگے بڑھتے رہے اور مرہٹے بوجہ تاریکی اُن پر گولیاں چلانے یا بھالوں سے حملہ آور ہونے کا پورا موقعہ نہ پا سکے۔ اس کے بعد پیادوں نے دو طرفہ ہٹ کر توپوں کو آگ برسانے کا موقعہ دیا۔ جس سے جھنکوجی سیندھیا کی فوج اور ہلکر کے دستوں کو پیچھے ہٹنے کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہیں آیا اور مرہٹہ لائن میں اسطرف خمیدگی واقع ہوئی۔

شاہ پسند خان اور نپوارڑ

نجیب الدولہ کی بائیں طرف شاہ پسند خان افغانوں کا مشہور سردار معہ اپنی فوج کے بڑھتا آیا۔ یہ دلاور و آزمودہ کار سردار ایسی قوت کے ساتھ لڑ رہا تھا کہ مرہٹوں کو اس کے سامنے دَم لینے کی فرصت نہ ملتی تھی اور نپوارڑ کے جو دستے اس کے مقابل تھے اُن کی قوت برابر گھٹتی جاتی تھی۔

شاہ ابدالی کا آخری زبردست حملہ

اسی طرح پورے خطِ حرب پر صبح سے دوپہر تک لڑائی جاری رہی۔ ہر چند گاردی کے زخمی ہونے کے بعد اُس کی پلٹنوں کا زور ٹوٹ گیا تھا اور افغانوں کی نسبت مرہٹوں کا زیادہ نقصان ہو رہا تھا تاہم مرہٹے ایسی شجاعت کے ساتھ لڑ رہے تھے اور افغان سپاہ کے قلب میں اِس قدر گھسے ہوئے تھے کہ بظاہر غلبہ انہیں کا معلوم ہوتا تھا اور وزیر شاہ ولی خان جو شاہ ابدالی کے قلبِ لشکر کا محافظ تھا اپنی جان کو سخت خطرے میں پاتا تھا۔ شجاع الدولہ کی طرف سے کوئی قابلِ ذکر مدد وزیر کو نہیں پہنچ سکی۔ اگرچہ ان کی فوج نے مرہٹوں کی بعض جمعیتوں کو اُن پر مزید دباؤ ڈالنے سے روکا۔ اِسی اثناء میں احمد شاہ ابدالی نے اپنے محافظ دستوں کا ایک حصّہ وزیر کی کمک کے لئے بھیجا جس سے افغانوں کے پاؤں پھر جم گئے۔ مگر اب تک مرہٹوں کا زور پڑ رہا تھا اور افغانی لائن کا زیادہ دیر تک قائم رہنا دشوار نظر آتا تھا کہ اس نازک وقت میں شاہ ابدالی نے اپنی زبردست حربی قابلیت کا اظہار کیا اور اپنے بقیہ محافظ دستوں کو ساتھ لیکر

اور وزیر کی فوج کے پسپا شدہ آدمیوں کو سمیٹ کر ایک زبردست ہلّہ کیا جس نے میدانِ کارزار کی حالت بدل دی۔ مرہٹے شاہ کے اِس آخری طاقتور حملے کی تاب نہ لا سکے۔

بھاؤ پر عالمِ یاس طاری ہوا

بسواس راؤ کے جب مہلک زخم لگا تو بھاؤ کی آنکھوں میں جہان تاریک ہو گیا کیوں کہ وہ اپنے بھتیجے سے اولاد کی طرح محبت کرتا تھا۔ اُس کی جان پر زد پڑنے سے بھاؤ کی گویا کمر ٹوٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی خود بھاؤ کے بھی کئی زخم لگے۔ اس نے بسواس راؤ کو ہاتھی کے ہودے میں لٹانے کا حکم دیا اور خود ہاتھی سے اُتر کر اپنے عربی گھوڑے پر بیٹھا اور لڑائی کے بھنور میں کُود پڑا۔ فوج جب اپنے سپہ سالار کی رہنمائی سے محروم ہو گئی تو اُس کے پاؤں میدان سے اکھڑنے لگے۔ اِس سے پٹھانوں کو پہلے تو تعجب ہوا مگر پھر اُن کی ہمت بڑھ گئی اور نیا جوش پیدا ہو گیا۔ وہ تمام سمتوں سے مرہٹوں کو رگیدتے ہوئے چلے حتیٰ کہ چار بجتے بجتے سارا میدان مرہٹہ جنگ جویوں سے خالی ہو گیا اور ہر طرف لاشوں کے انبار نظر آنے لگے۔ مرہٹہ سپاہی میدان کے چاروں طرف بھاگے اور افغان سوار اُن کے تعاقب میں چلے۔ یہ حالت شام ہونے کے بعد شب میں بھی قائم رہی اور چوں کہ چاندنی رات تھی اِس لئے افغان سواروں نے مفرور مرہٹوں کا دس بارہ کوس تک پیچھا کیا اور سب کو قتل کر کے اُن کا سامان لُوٹ لیا۔

کئی ہزار مرہٹہ سپاہی بہ امید پناہ پانی پت کو واپس گئے اور بڑی دقّت سے خندق کو طے کر کے اور دمدمہ پر چڑھ کر حصار کے اندر داخل ہوئے۔ کچھ لوگوں کے ہاتھ پاؤں خندق میں کودنے کے وقت ٹوٹے اور جو لوگ حصار کے اندر پہنچ گئے تھے اُن کو بھی کوئی امن نہیں ملا بلکہ وہ رات بھر بھوکے پیاسے پڑے رہے اور افغانوں نے شب ہی میں قصبہ کے گرد پہرے لگا دیئے اور علی الصباح آ کر جسقدر بھی مرد عورتیں اور بچے حصار کے اندر ملے اُن سب کو گرفتار کر لیا۔ عورتوں اور بچّوں کو افغانوں کے پُرانے دستور کے موافق بطور کنیز و غلام اپنے ساتھ لے جانے کے لئے الگ رکھا اور اُنہیں کچھ کھانے کو دیا۔ کیوں کہ دو ہفتے سے مرہٹوں کے لشکر میں سامانِ رسد کی کمی تھی اور تیس بتیس گھنٹے سے اُنہیں مطلق غذا نہیں ملی تھی۔ مرد قیدیوں کے ساتھ افغانوں نے بظاہر بہت ظالمانہ مگر بہ باطن شاید ہمدردانہ سلوک کیا کہ انہیں غیر ملک میں ذلّت و مصیبت کی زندگی بسر کرنے کے لئے باقی رکھنے کے بجائے قیدِ ہستی ہی سے چھڑا دیا اور سب کو قتل کروڈالا۔

افغانوں نے قیدیوں کو کیوں قتل کیا؟

کپتان گرانٹ ڈف نے لکھا ہے کہ "شاید خوں خوار ترین جنگلی اقوام کو بھی مرہٹوں کی زار و نزار حالت دیکھ کر اُن پر کچھ ترس آتا۔ مگر افغانوں کو مطلق رحم نہیں آیا اور انھوں نے اپنی قوم اور بنی نوع انسان کے دامن پر بدنامی کا مستقل دھبّا اِس طریقے سے لگایا کہ دوسرے روز صبح کو وہ اُن بدنصیب اسیروں کو وہاں سے نکال کر لے گئے اور اپنے لشکر میں لے جا کر اُن کو تقسیم کر لیا۔ عورتوں اور بچّوں کو تو انھوں نے لونڈیوں اور غلاموں کے طور پر زندہ رہنے دیا لیکن مردوں کو قطار میں بندھوا کر کھڑا کیا اور اُن کے سر اُتار کر اپنے دل کو محظوظ کرتے رہے اور بعد میں انھوں نے ڈیروں کے آگے بطور نشاناتِ فتح کے اُن سروں کو اُوپر تلے رکھ کر انبار لگائے اور کلہ منار بنائے۔"

دیگر انگریز مؤرخوں نے بھی اِس معاملے پر اسی طریقے سے رائے زنی کی ہے اور بعض نے شاہ ابدالی کے ہندوستانی رفقاء کو بھی اِس میں شریک سمجھا ہے اور اِس سے مسلمانوں کی بے رحمی اور ہندو مسلمانوں کی عداوت باہمی کا نتیجہ نکالا ہے۔ حالاں کہ یہ سراسر غلط ہے۔ مرہٹہ قیدیوں میں سے کئی ہزار مردوں کو ضرور قتل کیا گیا لیکن نواب شجاع الدولہ تو درکنار جو آخر وقت تک مرہٹوں کے ساتھ مصالحت کئے جانے میں ساعی رہے، روہیلہ سردار یا نواب بنگش حتیٰ کہ نجیب الدولہ بھی جنھوں نے مرہٹوں کے ہاتھوں سے سخت اذیت اٹھائی تھی اور جن کے بیٹے اور پوتے کو مرہٹوں ہی نے تباہ و برباد کیا اِس عام خون ریزی میں شریک یا اُس پر رضامند نہیں تھے اور اگر اُن کا بس چلتا تو وہ ضرور اِن بدنصیبوں کی جانیں بچانے میں کوشش کرتے۔ جیسا کہ آگے چل کر دیگر حالات سے ظاہر ہوگا۔

رہے افغان۔ اُن کے اِس ہولناک فعل کی بابت کوئی معذرت پیش کرنے کی ہم کو ضرورت نہیں۔ کیوں کہ اوّل تو اُن کی جبلّت ہی ایسی ہے کہ قتل و خوں ریزی کو وہ ایک معمولی بات سمجھتے ہیں اور خصوصاً جس زمانے میں یہ واقعات رونما ہوئے اُسوقت ہندوستان تو کیا سارے مشرق اور مغرب کے اکثر ملکوں میں بھی انسانی جان کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔ پھر شاہِ ابدالی کے سپاہیوں کی نسبت اِس امر واقعہ کو فراموش نہ کرنا چاہئے کہ وہ ایک بیرونی حملہ آور کی فوج کے آدمی تھے جو اس ملک میں بالکل اجنبی تھے اور یہاں کے لوگوں کی زبان بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کو صرف مالِ غنیمت جمع کرنے کی فکر تھی اور

اپنی روزمرہ کی خوراک بھی اُن کو شاہ کے ہندوستانی رفقار کے علاقوں سے بہم پہنچتی تھی اور ان ہندوستانی رفیقوں کی نسبت ان کو یہ اعتماد نہیں تھا کہ وہ زیادہ عرصے تک ان کا ساتھ دیں گے پانی پت کے اردگرد کے دیہات کو پندرہ پندرہ کوس تک مرہٹوں نے خود تباہ کر دیا تھا۔ ایسی حالت میں وہ ان ہزار ہا قیدیوں کی خوراک کا کیا انتظام کرتے ؟ اور اُن کو ساتھ لئے پھرنے میں جو خطرہ متصوّر تھا اُس کو جنگی کارروائیوں کے دوران میں کس طرح اٹھاتے وہ معرکۂ پانی پت میں مرہٹوں کے شکست کھانے کو بھی ایک لطیفۂ غیبی سے تعبیر کرتے تھے اور اُن کو لڑائی کے دوسرے روز یہ خیال نہیں ہوسکتا تھا کہ کل کی لڑائی کے نتیجے نے مرہٹوں کی قوت پر ایک شدید ضرب لگا دی ہے۔ بلکہ پانی پت سے چالیس پینتالیس میل کے فاصلے پر دارالسلطنت دہلی میں مرہٹوں کا ایک سردار (راجہ بہادر) نارو شنکر فوج کی ایک جمعیت کے ساتھ موجود تھا اور دکن سے پیشوا کے ایک لشکر جرار کے ساتھ اپنے بھائی اور بیٹے کی کمک کے لئے آنے کی خود مرہٹوں کو امّید تھی۔ جس سے افغانوں کا معرکۂ پانی پت کے بعد اپنی شکستہ قوت کے ساتھ عہدہ برآ ہونا یقیناً دشوار ہوتا اور اس زمانے میں اسیران جنگ کی کسی بڑی تعداد کو قید رکھنے کا دستور بھی نہیں تھا بلکہ یا تو انہیں قتل کر ڈالا جاتا تھا یا مقتدر اشخاص کو بھاری فدیہ کی توقع پر یا بطور یرغمال رکھ کر اور دیگر آدمیوں سے ان کے اسلحہ وسامان چھین کر اور لڑائی میں شامل نہ ہونے کا قول لے کر حد پار اُتار دیا جاتا تھا۔ مگر مرہٹوں کا اصلی ملک پانی پت سے سینکڑوں کوس دُور تھا اور تھوڑے ہی فاصلے پر اُن کے دوست راجپوتھان میں موجود تھے اور مرہٹوں کی کمک آنے پر اِن رہاشدہ قیدیوں کو گھوڑے اور ہتھیار بہ آسانی حاصل ہوسکتے تھے۔ اِس لئے افغانوں نے اُن بدنصیب قیدیوں کو قتل کر دینا اپنی عافیت کے لئے ضروری سمجھا اور اگر مرہٹوں کو فتح نصیب ہوتی تو وہ بھی غالباً افغانوں کے ساتھ اِس سے کچھ بہتر سلوک نہ کرتے۔

افغانوں کو بھی مرہٹوں سے مذہبی عداوت نہیں تھی

ہزار ہا مجبور قیدیوں کا ایک دم قتل کر دیا جانا یقیناً ایک ہولناک و دردانگیز واقعہ تھا مگر اس میں افغانوں کی جبلّت کے سوا مذہبی عداوت یا قومی منافرت کا کوئی شائبہ بھی شامل نہیں تھا۔ چنانچہ کپتان گرانٹ ڈف نے اپنی تاریخ میں ایک بوڑھے برہمن کی روایت اِن الفاظ میں نقل کی ہے کہ " افغانوں نے اُن مرہٹہ قیدیوں کی قطاریں

بندھوائیں اور ہر بدنصیب کو تھوڑے سے بُھنے ہوئے چنے دیئے (کیوں کہ وہ دو شبانہ روز سے بھوکے تھے اور بہشتی اُن کے چلّوؤں میں پانی ڈالتے جاتے تھے۔ (یہ چنے کھانے اور پانی پینے کے بعد) پھر اُن کے سر قلم کر دیئے جاتے تھے۔ نارو بھگونت کُلکارنی مقام ارلانے جو قتل کی غرض سے لے جائے جانے والے اشخاص میں شامل تھا لیکن بچ جانے کا حال اس طرح بیان کیا کہ" وہ مرہٹہ فوج میں کارکن تھا اور افغان جو بھاؤ کے توپ خانے میں تھے اُن کی ایک جماعت کا حساب دکن سے روانگی کے وقت اُس کے ہاتھ میں تھا۔ جب مرہٹوں نے اُن لوگوں (افغانوں) کے ہم وطنوں پر حملہ کیا تو حسین خان نے جو ایک مشہور شخص تھا بھاؤ سے آکر کہا کہ جو آدمی اس کے ساتھ ہیں وہ اِس وقت لڑنے سے گھبراتے ہیں کیوں کہ روہیلوں اور ابدالیوں دونوں نے اُن کو یقین دلایا ہے کہ اگر وہ اپنے بادشاہ کے خلاف ہتھیار اٹھاتے پائے جائیں گے تو فوراً ہی قتل کر دیئے جائیں گے (فارسی بیان میں اس کا صاف تذکرہ ہے جو افغان مرہٹوں کی سروس میں تھے انہیں اُن کے ہم قوموں کی طرف سے پہلے کئی قسم کی ترغیبات دی گئیں اور جب اُن کا اثر نہ ہوا تو نہ صرف اُن کو بلکہ اُن کے بال بچوں اور اعزہ کو بھی جو افغانستان میں تھے قتل کر دیئے جانے کا خوف دلایا گیا۔ بعض لوگ اس دھمکی سے خوف زدہ ہو گئے مگر اکثر نے اِس کا کوئی اثر قبول نہیں کیا اور گاردی کے زیر حکم پانی پت کے میدان میں اپنی توپوں پر کام کرتے رہے اور جان دے کر اپنے آقا کے حق نمک سے ادا ہو گئے) حسین خان نے بھاؤ کی منت سماجت کی اور اپنا نام کٹوا لیا مگر سداشیو راؤ (بھاؤ) کو یقین دلایا کہ جب بھی اس کو اطمینان کے ساتھ موقعہ ملے گا وہ اپنے کام پر حاضر ہو جائے گا۔ اُس نے اُن کا نمک کھایا ہے اور اُسے بہت رنج ہے کہ اس وقت وہ اُن کی نوکری چھوڑنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ بعد میں حسین خان برابر بھاؤ کو چٹھیاں بھیجتا رہا جن سے وہ (روایت کا بیان کرنے والا برہمن) آگاہ تھا اُس روز جس بہشتی نے اُس (برہمن) کے چلّو میں پانی ڈالا وہ وہی تھا جو حسین خان کے یہاں کام کرتا تھا۔ وہ (بہشتی) فوراً ہی جمعدار (حسین خان) کے پاس دوڑا ہوا گیا اور کہا کہ" ہمارا باھمن قطار میں ہے اور ابھی قتل ہونے والا ہے۔" حسین خان آگے بڑھ آیا اور اُس نے اپنے ہم وطنوں سے اُن کی مادری زبان میں کچھ کہا۔ جس کو راوی نے یہ سمجھا کہ" میں اُس شخص کو اپنا غلام بنانا چاہتا ہوں۔" اتنا کہہ کر حسین خان نے اس (برہمن) کا ہاتھ پکڑا اور اُس کو گھسیٹتا ہوا اپنے ڈیرے کی طرف لے گیا جہاں وہ ایک روز مقیم رہا۔ اس کے بعد جمعدار نے

ایک مترجم کے ذریعے سے اس سے دریافت کیا کہ وہ اُس کے پاس رہنا پسند کرے گا یا دکن واپس جائے گا" اس پر راوی نے جواب دیا کہ وہ خوشی سے اُن کے پاس رہے گا"۔ جمعدار نے مترجم سے کہا کہ" اس سے کہو کہ وہ جھوٹ بولتا ہے"۔ اس کے تھوڑی دیر بعد حسین خاں نے اُس کو ایک طرف بلایا اور ہندوستانی زبان میں (جس کو وہ جب اُس کا جی چاہتا تھا تو اچھی طرح بول سکتا تھا) اس سے کہا کہ سواروں کی ایک جماعت جو اُس کے ایک دوست کے آدمی ہیں اُسکو لشکر سے بحفاظت لے جاکر بیس کوس پر چھوڑ آئے گی۔ اس فیّاض افغان نے اُسی وقت اُس کو پانچ طلائی مہریں بھی دیں اور کہا کہ وہ اِس کی احتیاط رکھّے کہ اُس کے محافظوں کو یہ نہ معلوم ہونے پائے کہ اس کے پاس روپیہ ہے۔ اس کے بعد وہ ایک دوسرے سے رخصت ہوگئے جب کچھ دُور تک گئے تو راوی کو جمعدار کے مشورے کا خیال آیا اور یہ سوچ کر کہ شاید اس کے محافظ اُس کی تلاشی لیں۔ اس نے مہروں کو اپنے منھ میں رکھ لیا اور اُس کے تھوڑی دیر بعد جب وہ سوار اپنے لشکر کی طرف مُڑے تو اس نے اپنے مال کو محفوظ خیال کیا لیکن ان میں سے ایک شخص نے جو دوسروں سے زیادہ چالاک تھا اُس کو اشرفیاں منھ میں رکھتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور جب اُس کے ساتھی کچھ دُور نکل گئے تو وہ اُس مال کو لینے کے لئے چلا تھوڑی دیر میں راوی نے جو جہاں تک اُس کے پاؤں یاری دیتے تھے بڑی تیزی کے ساتھ بھاگ رہا تھا اپنے پیچھے سے آواز سُنی کہ " او باممن" اور پیچھے مڑکر دیکھا تو ایک افغان جس کی آنکھیں بڑی بڑی اور ڈاڑھی بہت لمبی تھی اس کے تعاقب میں چلا آرہا تھا۔ راوی اُسے دیکھ کر سخت خوف زدہ ہوا۔ افغان نے ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں کہا۔" او باممن تیرے منھ میں کیا ہے؟" آخر افغان نے راوی کو وہ پانچوں اشرفیاں دینے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد افغان نے کہا " اَب چل دے" اور خود گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا اپنے ساتھیوں سے جا ملنے کے لئے واپس چلا گیا۔

اس مرہٹہ برہمن پر جو واردات گذری اُس سے عیاں ہے کہ افغانوں کا لُوٹ کے سوا کوئی مقصد نہیں تھا اور چوں کہ مرہٹوں کی کمک دکن سے آنے کا ہر وقت کھٹکا تھا اور دارالسلطنت دہلی ان کے قبضے میں تھا اس لئے افغان آیندہ جنگ کے خطرے کو مدّ نظر رکھ کر دشمن کے آدمیوں کی قوت گھٹانی چاہتے تھے اور مقتولین کا مال ومتاع اور ہتھیار بھی بآسانی ہاتھ آجاتے تھے۔ اگر مذہبی عداوت کا جذبہ افغانوں کے دلوں میں ہوتا تو حسین خان جمعدار توپ خانہ بھاؤ جو

خود افغان تھا اپنی جماعت کے سابق مصاحب کی جان نہ بچاتا اور اگر اس نے مروّت کی تھی تو دیگر افغان سوار جن کی زیر حفاظت حسین خان نے برہمن مذکور کو لشکرِ ابدالی سے باہر بھجوا دیا تھا راستے میں اُس "کافر" کو قتل کر دیتے۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بھاؤ کے غرور اور غلطیوں نے افغانوں کے دلوں میں مذہبی عداوت کے جذبات بھی پیدا کر دیئے تھے اور وہ کافروں کے قتل سے خود ثواب حاصل کرنے اور اپنے متوفی اعزّہ کو ثواب پہنچانے کی ڈینگیں مارتے تھے۔

ہندوستانی رفقائے ابدالی کا ہمدردانہ برتاؤ

شاہ ابدالی کے ہندوستانی رفقاء کا دامن مرہٹہ قیدیوں کے اِس قتلِ عام سے پاک ہے اور ہم وطنی و دوستی کے تعلقات کا اثر برابر واقعات سے ظاہر ہوتا ہے۔ روہیلہ سرداروں میں نجیب الدولہ کو سب سے زیادہ مرہٹوں کا خوف تھا اور اُن کے بیٹے ضابطہ خان کو مرہٹوں نے بعد میں جس طریقے پر تباہ کیا اُس کے لحاظ سے یہ خوف کچھ بے جا بھی نہیں تھا لیکن پانی پت کا میدان سر ہو جانے کے بعد نجیب الدولہ کی طرف سے بھی کسی عداوت کا اظہار نہیں ہوا۔ اگرچہ اُن کی غلطی سے دو ممتاز مرہٹہ سرداروں کی جانیں گئیں۔ شجاع الدولہ کھُلم کھُلا مرہٹوں کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کرتے رہے اور بقول کاشی رائے جن چھ سات ہزار مرہٹوں نے اُن کے کمپ میں پناہ لی تھی۔ اُن کو دُرّانیوں کی بے رحمی سے محفوظ رکھنے کے لئے نواب نے اپنے آدمیوں کے پہرے لگا دیئے تھے۔ اِن مرہٹوں کی خورونوش کا انتظام نواب نے اپنی طرف سے کیا اور بعد ازاں کپڑے اور کچھ خرچ دے کر ان کو رخصت کر دیا اور علی ابراہیم خان نے اپنی تاریخ جنگ مرہٹہ و شاہ ابدالی میں لکھا ہے کہ نواب شجاع الدولہ نے دارالخلافتہ (دہلی) میں پہنچنے کے بعد تیس ہزار دکھنی مردوں اور عورتوں کو جو دُرّانیوں کے ہاتھوں میں اسیر تھے اور شاہ دُرّانی کی معاودتِ وطن کے وقت قید سے چھوٹے تھے۔ اپنی حمایت و پناہ میں لے کر اور زادِ راہ دے کر اور کچھ فوج ان کے ہمراہ کر کے بھوپل نگر میں جو سورج مل جاٹ کے علاقے میں تھا پہنچوا دیا۔

مرہٹوں کا نقصان جان و مال

کاشی رائے لکھتا ہے کہ لڑائی ختم ہونے کے بعد تمام بڑے بڑے سرداروں نے شاہ ابدالی کو تہنیت و فتح کی نذریں پیش کیں اور شاہ میدانِ جنگ کا سرسری معائنہ کر کے جس میں کشتوں کے پُشتے

اور لاشوں کے انبار لگے ہوئے تھے اپنے خیمے کو واپس ہوگیا اور تمام دیگر افسران بھی اپنے اپنے ڈیروں میں چلے گئے اور ادنیٰ افسران اور یکہ سپاہیوں کو اپنی مرضی کے موافق لوٹ کھسوٹ جاری رکھنے کے لئے چھوڑ دیا۔ مرہٹوں کے لشکر میں صرف غلہ نہیں تھا اور آخر وقت میں روپیہ کا بھی توڑا ہوگیا تھا اور عورتوں کے زیورات اور ظروف گلوا کر روپے اشرفیاں بنوانی پڑی تھیں۔ لیکن اور سب اقسام کا سامان بافراط موجود تھا۔ بقول کاشی رائے ایک ایک افغان سوار آٹھ آٹھ دس دس اونٹ قیمتی سامان سے لدے ہوئے لاتا دیکھا جاتا تھا۔ گھوڑے بکریوں کے ریوڑ کی طرح ہانکے جا رہے تھے اور ہاتھیوں کی بھی بڑی تعداد پکڑی گئی۔ علی ابراہیم خان نے لکھا ہے کہ پانسو ہاتھی۔ پانچ ہزار گھوڑے۔ دو لاکھ بیل (مویشی) بہت سا قیمتی جواہر و زر نقد اور بے شمار اسلحہ و ظروف کثیر المقدار اسباب اور ہزارہا خیمے معہ سامان آرائش وغیرہ لشکر ابدالی کے ہاتھ آئے۔

ہر افغان سپاہی کے پاس اتنا مال تھا کہ وہ اس کو سنبھال نہیں سکتا تھا۔ مرہٹوں نے اوّل مرتبہ شمالی ہند کی جنگی کارروائیوں میں اپنی عورتوں کو ساتھ لیا تھا۔ کیوں کہ بھاؤ کو اپنے فتح پانے کا پورا یقین تھا۔ معرکۂ پانی پت کے بعد بیچاری عورتیں افغانوں کے ہاتھوں میں پڑیں اور معزز خاندانوں کی صرف چند عورتوں کا حال بعد میں سننے میں آسکا ورنہ وہ سب ایک دم غائب ہوگئیں۔ فارسی تاریخوں میں بھاؤ کے لشکر کے آدمیوں کی تعداد مبالغے کے ساتھ پانچ لاکھ سے دس لاکھ تک بیان کی گئی ہے اور اسی بنا پر مقتولین کا شمار بھی تین سے آٹھ لاکھ تک لگایا گیا ہے لیکن گرانٹ ڈف کے نزدیک تین لاکھ نفوس بمقام پانی پت لشکر بھاؤ میں موجود تھے۔ منجملہ ان کے جنگجویوں میں سے ½ کے قریب اپنی جان سلامت لیجا سکے اور بہیر و بنگاہ کے آدمیوں میں سے بھی چوتھائی سے زیادہ نہیں بچے۔ اس طرح قریباً دو لاکھ مرہٹے اور دکھنی میدان پانی پت میں قتل و ہلاک ہوئے شاہ ابدالی اور اُن کے ہندوستانی رفقا کی افواج نے بھی کافی نقصان اٹھایا اور اُن کے مقتولین کی تعداد بیس ہزار سے کم نہیں رہی مگر فتح کی خوشی نے اس نقصان پر کسی کو توجہ نہیں کرنے دی۔

مرہٹہ سردار جو لڑائی میں بچے

مرہٹوں کے سربرآوردہ سرداروں میں صرف تین اشخاص ملہار راؤ ہولکر۔ وٹھل شیدیو اور دتاجی گائیکواڑ کی جانیں معرکۂ پانی پت کے زخموں سے شفا پانے کے بعد محفوظ رہیں۔ انتا مکیسرا اور شمشیر بہادر بھی زخمی ہونیکے

باوجود میدان سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے مگر جن گانوؤں کو پہلے مرہٹوں نے لوٹا کھسوٹا تھا۔ ان کے دیہاتیوں کو اب ان شکست خوردہ لوگوں سے اپنے سابق نقصان کا بدلہ لینے کا موقعہ تھا۔ چنانچہ جو مرہٹے افغانوں کے ہاتھ سے بچ نکلے تھے ان میں سے سینکڑوں کو دیہاتیوں نے راستہ میں قتل کر کے اُن کا سامان و اسباب لوٹ لیا۔ سردار انتاجی منکیسر زمیندار فرخ نگر کے آدمیوں کے ہاتھوں مقتول ہوا۔ باجی راؤ پیشوا کا بیٹا شمشیر بہادر جو سخت زخمی تھا معہ تین چار آدمیوں کے سورج مل جاٹ کے قلعہ ڈیگر میں پہنچا۔ علی ابراہیم کی روایت کے بموجب پاربتی بائی زوجۂ بھاؤ بھی معہ اپنے چند محرموں کے اُسی کے ساتھ تھی۔ ڈیگر میں زوجۂ بھاؤ نے دو تین روز ٹھہر کر اپنے خاوند کی مراسم تعزیت ادا کیں اور بعد ازاں سورج مل نے معقول بدرقہ و محافظین کے ساتھ اُس کو دکن کی طرف رخصت کر دیا۔ شمشیر بہادر اپنے زخموں کی شدّت کے باعث ڈیگر میں ٹھہرنے پر مجبور ہوا اور بعد میں وہیں اُس کا انتقال ہو گیا۔ مرہٹہ روایات میں بھاؤ کی بیوہ پاربتی بائی اور وسواس راؤ کی بیوہ لکشمی بائی کو راجا نو بھنڈے کے گوالیار پہنچانے کا ذکر ہے۔ غالباً یہ دونوں خواتین اپنے گرامی قدر شوہروں کی طرح لڑائی کے بگڑنے پر پانی پت سے ایک ساتھ روانہ ہوئیں اور دکن پہنچنے تک ساتھ ہی رہیں۔ ملہار راؤ ہولکر پانی پت سے پہلے کرنال کی طرف گیا اور وہاں سے متھرا ہو کر بھرت پور میں پہنچا اور سورج مل کی میزبانی سے مستفید ہوا۔ دتاجی گائیکواڑ نے میدانِ پانی پت سے نکل کر پہلے دہلی کا رُخ کیا اور وہاں سے وہ راجہ نارو شنکر کے ساتھ بڑودہ اور پھر دکن پہنچا۔ وٹھل شیدیو کچھ روز بعد ملہار راؤ ہولکر کے ساتھ شامل ہو گیا اور پیشوا کا دل چوں کہ ان دونوں کی طرف سے صاف نہ تھا جیسا کہ سردار وٹھل شیدیو کے متذکرۂ صدر خط بنام رگھناتھ راؤ سے عیاں ہے۔ اِس لئے ایک عرصے کے بعد پونا میں گیا۔ مادھوجی سیندھیا اور نانا فرنویس بھی جو بعد میں اِس قدر مشہور ہوئے میدان پانی پت سے بمشکل اپنی جانیں بچا لے گئے۔

مادھوجی سیندھیا پر کیا گذری؟

مادھوجی سیندھیا اس ... کے ... حالات اپنے دوستوں سے خود بیان کیا کرتے تھے کہ وہ ایک اصیل گھوڑی پر سوار تھے جو پچاس ساٹھ کوس کا دم رکھتی تھی۔ جب وہ میدان سے ایک طرف کو نکل کر چلے تو متعدد افغان سواروں نے اُن کے قیمتی ساز و سامان کو دیکھ کر لوٹ کی امید میں ان کا تعاقب کیا لیکن ان کی گھوڑی نے اپنی تگ و تاز میں ان سب کے گھوڑوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہاں ایک طاقت ور اور

گراں ڈیل افغان کا گھوڑا بہت اعلیٰ درجے کا تھا وہ برابر ان کے پیچھے لگا رہا۔ انہوں نے اپنی گھوڑی کو بہت گرمایا اور دوڑایا مگر افغان سوار نے ان کا تعاقب نہ چھوڑا۔ اسی طرح وہ دونوں بہت دور نکل آئے۔ آخر ساٹھ کوس کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اُن کی گھوڑی تھک کر کھڑی ہوگئی۔ افغان کے گھوڑے میں ابھی دم باقی تھا۔ وہ فوراً ہی اُن کے سر پر آپہنچا اور انہیں اپنی جان کا خطرہ پیدا ہوا۔ گھوڑی چوں کہ بے کار ہوچکی تھی اس لئے وہ فنون سپہ گری کے استعمال پر مجبور تھے اور افغان جسمانی حیثیت سے اُن سے کہیں زیادہ طاقت ور تھا۔ اگر وہ قتل کرنا چاہتا تو بآسانی اُس میں کامیاب ہوجاتا مگر اُس کو صرف مال لوٹنے کا خیال تھا۔ چنان چہ اُس نے ان کے قریب آتے ہی ایک تیر اُن کے مارا جس سے ان کا گھٹنا ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد افغان نے ان کی پگڑی میں سے جیغہ۔ گلے میں سے مالا۔ اور زین پر سے دیگر قیمتی سامان لیا، خورجیوں کو ٹٹولا اور سب چیزوں کو اپنے گھوڑے پر رکھ کر اپنے لشکر کو واپس چلا گیا۔ ان کو گھٹنے کے ٹوٹنے سے بڑی تکلیف تھی مگر گھوڑی آگے چل نہیں سکتی تھی اور جنگل میں رات گذارنی مشکل تھی۔ اِس لئے انہوں نے گھوڑی کو آہستہ آہستہ بڑھایا۔ اتفاق سے ایک بستی قریب ہی مل گئی وہ بہ مشکل اس کے سرے تک پہنچ سکے اور وہاں گھٹنے کی تکلیف اور پیاس کی شدّت سے بے ہوش ہونے لگے ایک چھپّر سامنے تھا انہوں نے اُس کے دروازے پر پہنچکر پانی مانگا۔ وہاں سے ایک عورت پیالے میں پانی لئے ہوئے نکلی۔ اس نازک حالت میں ان کے لئے اس کی ذات وعقیدے کا خیال کرنا مشکل تھا۔ انہوں نے پانی پی لیا اور اس سے مدد چاہی۔ عورت نے ہمدردی کا اظہار کیا اور پھر ایک مرد کو بُلا کر اُس کی مدد سے ان کو گھوڑے سے اتارا اور چھپّر کے اندر لے جا کر لٹایا اور تین شبانہ روز پیہم ان کی تیمار داری و خدمت گزاری کی۔ تین روز کے بعد جب ان کو گھٹنے کی چوٹ سے ذرا افاقہ ہوا تو انہوں نے اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر چلنے کا قصد کیا۔ ان کے میزبانوں نے ان کو روکنا چاہا مگر ان کو ڈر لگا ہوا تھا کہ مبادا افغانوں کے لشکر کے لوگ ادھر نہ آئیں اور گھوڑی اور بقیّہ سامان چھین لیں۔ لہٰذا یہ نہ رُکے اور روانہ ہوگئے۔ روانگی کے وقت تک ان کو اپنے ہمدرد معاونوں کی بابت کچھ معلوم نہیں ہو سکا مگر اس بستی کے مقام اور راستہ کو انہوں نے یاد رکھّا اور کتنے ہی سال کے بعد جب اپنی جمعیت کے ساتھ ان کا ادھر کے علاقے میں گذر ہوا تو انہوں نے بستی میں جا کر اپنے میزبانوں کو تلاش کیا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ وہ مسلمان ہیں اور مفلوک الحال ہو کر اس بستی میں آرہے ہیں جس عورت نے اُن کی اُس وقت

خدمت کی تھی وہ موجود تھی اُس کو اِن کے شناخت کرنے میں دِقت ہوئی مگر انھوں نے اس کو فوراً پہچان لیا اور بعد میں اُس کو اور اُس کے بیٹے کو گوالیار میں لے جاکر بڑی عزت کے ساتھ رکھا اور ہمیشہ وہ خاندان ان کا موردِ عنایات رہا۔

اِس واقعہ سے عیاں ہے کہ لڑائی کی اسپرٹ دیہات میں نہیں پہنچی تھی اور ہندو مسلمانوں کے دل آپس میں بالکل صاف تھے۔

ہولکر پر الزام

وسواس کے مہلک زخم لگنے پر بھاؤ نے اس کو ہاتھی کے ہودے میں لٹا دیا تھا اور خود ہاتھی سے اُتر کر اور اپنے عربی گھوڑے پر سوار ہو کر بہادروں کی موت مرنے کے لئے اُس مقام پر چلا گیا تھا جہاں معرکۂ جنگ سب سے زیادہ خطرناک تھا۔ ایک روایت ہے کہ خود لڑائی کے شروع ہونے سے پہلے بھاؤ نے ملہار راؤ ہولکر کو ان "ہدایات" پر کاربند ہونے کا پیام بھیجا جو اسے دی جاچکی تھیں مگر نہ اُن ہدایات کا کہیں ذکر ہے نہ بھاؤ کا وہ پیام ہولکر کو پہنچنے کا واقعہ پایۂ ثبوت کو پہنچا ہے۔ البتہ لڑائی کے شاہدوں کا بیان ہے کہ بھاؤ کے گھوڑے پر چڑھ کر صفوفِ قتال میں داخل ہونے کے تھوڑی دیر بعد ہی ملہار راؤ ہولکر معہ اپنے چند رفقا کے میدان سے ایک طرف نکل گئے اور اُن کے بعد ہی دتّاجی گائیکواڑ بھی روانہ ہوگئے۔ ہولکر کے نکتہ چین مرہٹوں کے پاؤں میدان جنگ سے اکھڑنے کا ان ہی کو باعث قرار دیتے ہیں کیوں کہ اِس وقت تک مرہٹے بڑے جوش کے ساتھ لڑ رہے تھے اور افغانوں کی صفوں میں گھسے ہوئے تھے۔

بسواس راؤ کا حُسن

بہرحال بھاؤ کے اُتر کر جانے کے بعد ہی بسواس راؤ کا ہاتھی ... ہی میں دم نکل گیا۔ کنکیڈ کی روایت کے بموجب بھاؤ کی بیوی پاربتی بائی بھی اس وقت ہاتھی پر اس کے ساتھ موجود تھی اور وسواس راؤ کے جب مہلک زخم لگا تو بھاؤ ... کمال حسرت و اندوہ کے ساتھ پاربتی بائی سے کہا کہ وہ اپنے بھائی پیشوا کو اب منھ نہیں دکھا ... یہ روایت اگر درست تھی تو پاربتی بائی کا افغانوں کے ہاتھوں میں پڑ ... سے بچ رہنا بہت تعجب انگیز ہے۔ کیوں کہ فارسی تاریخوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ خواصی کا ہاتھی چوں کہ بہت بڑا اور خوب آراستہ و پیراستہ تھا اِس لئے برخوردار خان کی جمعیت کے افغان سپاہیوں نے جب اُس کو دیکھا تو وہ زیور و سامان کے لالچ میں اُس کے گرد ہوگئے۔ جو مرہٹہ سردار خواصی میں بیٹھا تھا اُس کو مرہٹوں نے مار گرایا یا ممکن ہے کہ وہ اپنے آقا کی ناموس پاربتی بائی کو اُس قیامت خیز ہنگامہ سے

نکال لے جانے کی غرض سے خاتون موصوف کو ساتھ لے کر ہاتھی سے اتر گیا ہو۔ اور افغان سپاہیوں نے فقط فیلبان کو لاش کا نگہبان پایا ہو۔ انہوں نے زیور وغیرہ کو تو لاش پر سے اتار لیا اور لاش کو جس سے سرداری کی شان عیاں تھی پالکی میں ڈال کر لے چلے۔ پالکی اتفاقیہ نواب شجاع الدولہ کے ڈیرے کے سامنے سے گذری۔ نواب نے افغانوں سے حال دریافت کیا اور جب اُن کو بسواس راؤ کی لاش دستیاب ہونے کا پتہ لگا تو نواب نے ان افغانوں کو دو ہزار روپے اُسی وقت بطور انعام دے کر لاش کو اپنے کیمپ میں ایک خیمے کے اندر رکھا۔ ان افغان سپاہیوں نے اپنے لشکر میں پہنچکر بسواس راؤ کی لاش کے ملنے اور شجاع الدولہ کے اُس کو لے لینا کا ذکر کیا۔ شدہ شدہ یہ خبر شاہ نے سُنی اور اپنے خاص آدمی نواب کے پاس بھیجکر لاش کو دیکھنے کے لئے منگایا۔ اُسوقت جملہ افغان سردار اور سپاہی لاش کو دیکھکر بے اختیار اُس کے حُسن وجمال اور تناسب اعضاء کی تعریف کرتے تھے۔

ایک افغان جو لاش کے معائنہ کے وقت موجود تھا اس کا بیان ہے کہ بسواس راؤ کے دونوں ہاتھ زانو تک پہنچتے تھے۔ چہرے کا رنگ مرنے پر بھی نہیں بدلا تھا بلکہ وہی شباب کی آب وتاب رکھتا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور کسی قدر کھلی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ آرام سے سو رہا ہے۔ ایک زخم تلوار کا گردن کے پیچھے دونوں کانوں کے درمیان آدھ اُنگل گہرا تھا اور تیر کا زخم بائیں طرف کی بھوں پر لگا تھا لیکن اِن زخموں کے لگنے سے اس کی پوشاک پر آگے کی طرف خون مطلق نہیں گرا تھا اور نہ اُن کے صدمے سے چہرا بگڑا تھا۔ ہر شخص عین عالمِ شباب میں اس کی موت پر متاسف تھا۔ افغانوں نے وسواس راؤ کی لاش پر شور مچایا کہ وہ اُسکو خشک کر کے اور مصالحہ بھر کر افغانستان پہنچائیں گے۔ شاہ ابدالی نے اُس وقت کچھ جواب نہیں دیا مگر لاش نواب شجاع الدولہ کو واپس نہیں بھجوائی بلکہ برخوردار خان کی جس کے آدمیوں نے لاش کو ہاتھی پر پایا تھا سپرد کر دی اور وہ برخوردار خان کے دیوان موتی لال کھتری کے ڈیرے کے متصل ایک خیمے میں رکھی گئی۔ نواب شجاع الدولہ کو جب یہ حال معلوم ہوا تو وہ سوار ہو کر شاہ ابدالی کے پاس گئے اور اُن سے کہا کہ آپ افغانستان سے ہماری امداد اور سرکشوں کی تادیب کیلئے تشریف لائے ہیں اور کچھ عرصے کے بعد واپس چلے جائیں گے۔ ہم اور سردارانِ روہیلہ اِس ملک میں مستقل طور سے سکونت پذیر ہیں اور باشندگانِ ملک سے ہمارا ہر وقت کا ساتھ ہے لہٰذا ہم کو اِس ملک کے رسم ورواج پر عمل کرنا پڑتا ہے۔ قواعد اخلاق بھی اِسی امر کے

مقتضی ہیں کہ کسی شخص سے خواہ کیسی ہی سخت دشمنی ہو وہ اُس کی زندگی کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے
اور بعد مرگ کوئی اثر خصومت کا باقی نہیں رہتا۔ اِس ملک کا دستور یہ ہے کہ مقتولینِ جنگ کی
لاشیں ان کے ورثاء کے حوالے کر دی جاتی ہیں تاکہ وہ اپنے مذہبی طریقے پر اُن کو اوّل منزل
پہنچائیں۔ دسواس راؤ کی لاش اگر ولایت لے جائی جائے گی تو ہماری سخت بدنامی ہوگی۔ اور
مرہٹوں سے ایک مستقل دشمنی قائم ہو جائے گی۔ لہٰذا اِس کی لاش کو ہندوؤں کی مذہبی مراسم
کے بموجب جلانے کا حکم دیجئے۔ دیگر سردارانِ ہندوستانی نے بھی شجاع الدولہ کے بیان کی
تائید کی اور شاہ نے برخوردار خان کو حکم بھیجا کہ وہ وسواس راؤ کی لاش نواب شجاع الدولہ کے
حوالے کر دیں۔ چنانچہ نواب نے اپنے وکیل کاشی رائے کی معرفت اُس لاش کو منگایا اور گنیش شنکر
پنڈت اور دیگر ہندو کارندوں کی وساطت سے پورے سامان کے ساتھ صندل کی لکڑیوں میں اُس کے
پھونکنے کا انتظام کر دیا۔

بھاؤ کی لاش کی دستیابی

بھاؤ کی لاش اب تک دستیاب نہ ہوئی تھی اور اُس کی مسلّمہ
شجاعت کے باعث سردارانِ روہیلہ کو اندیشہ تھا کہ بھاؤ
اگر میدانِ جنگ سے زندہ نکل گیا ہے تو وہ پانی پت کے آس پاس مرہٹوں کی منتشر قوت کو سمیٹ کر
پھر مقابلے کی تیاری کرے گا۔ نواب شجاع الدولہ کو بھاؤ کا انجام متحقق ہونے کا خیال تھا اِس لئے
انھوں نے گھوڑے پر سوار ہو کر اور گنیش راؤ پنڈت، شیشا دھر پنڈت، کاشی رائے اور دیگر اشخاص
کو جو بھاؤ کے گھر کے شناسا تھے اپنے ساتھ لے کر میدانِ جنگ کا گشت لگایا اور لاشوں کے انبار
میں ڈھونڈھنا شروع کیا۔ جس پر جسونت راؤ پنوار، سنبھاجی ماگھ، بنلاجی اور دیگر نامی سردارانِ
مرہٹہ کی لاشیں ملیں۔ اِن سبھوں نے اپنے سینوں پر تلواروں اور بھالوں کے زخم کھائے تھے۔
سنبھاجی ماگھ کا بدن تلواروں کے زخموں سے چور چور تھا۔ جن کی تعداد چالیس سے کم نہیں تھی مگر
بھاؤ کی لاش ہنوز دستیاب نہیں ہوئی حتیٰ کہ ایک مقام پر جہاں کئی نامور سرداروں اور خاصہ
رسالے کے افسران کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک لاش بلا سر کے نظر آئی۔ اُس کو اُلٹ پلٹ کر
دیکھا تو تین بیش بہا و آب دار موتی اُس کے نیچے سے نکلے اور پھر چند موتی اور بھی کپڑوں میں
دبے ہوئے پائے گئے۔ ان موتیوں کو مرہٹوں کے وکیل سندر پنڈت نے پہچانا کہ یہ اُس مالا کے
ہیں جو بھاؤ کے گلے میں پڑی تھی۔ اس کے بعد لاش کو بغور دیکھا گیا تو پاؤں میں ایک چھوٹا سا گول
اور پیٹھ میں لمبا نشان زخم کا پایا گیا۔ جس سے اِس لاش پر بھاؤ کی ہونے کا احتمال اور قوی ہوا

کیوں کہ دکن کی ایک لڑائی میں بھاؤ کے پانوں میں بندوق کی گولی لگی تھی اور مظفر خان توپ خانہ پیشواکے کمانیر نے جس کو بھاؤ نے موقوف کر دیا تھا۔ اپنے داماد حیدر خان کو بھاؤ کے مارنے پر آمادہ کیا تھا اور ایک شخص نے پونا کے قریب دربار کے موقعہ پر سردار موصوف کی پشت میں کٹار ماری تھی۔ لاش کے ہاتھوں اور گھٹنوں پر گھٹے بھی پڑے ہوئے تھے کیوں کہ بھاؤ علی الصباح بارہ سو دفعہ سورج دیوتا کو ڈنڈوت کیا کرتا تھا۔ نواب شجاع الدولہ نے لاش کے تمام ٹکڑوں کو مرتب کرایا مگر سر باوجود تلاش کے نہ مل سکا لہٰذا اسی حالت میں لاش کا کریاکرم ہندوؤں کے مراسم کے بموجب مرہٹوں کے ہاتھ سے کرایا گیا۔ اس کے بعد سردار برخوردار خان کی فوج کا ایک افغان سوار ملا جو اپنے ہاتھ میں کوئی چیز کپڑے میں لپٹی ہوئی لٹکائے تھا۔ اس کو جب لالچ دیا گیا تو اس نے کپڑے کو کھول کر ایک سر نواب شجاع الدولہ کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ یہ لاش جو خاک پر پڑی ہے، اس کا سر یہ ہے۔ جو میں نے اسی تن پر دیکھا تھا یہ ایک چالاک و بارعب جوان تھا اور بیش بہا مالائیں گلے میں ڈالے ہوئے تھا اس کا جسم اور گھوڑے کا ساز جواہر سے مرصع تھا اور بڑی جرأت و بیباکی کے ساتھ افغانوں پر حملے کر رہا تھا۔ جب اس کے گھوڑے کو بندوق کی گولیاں لگیں اور وہ چلنے سے عاجز ہو گیا تو یہ جوان اس پر سے اتر کر دوسرے گھوڑے پر سوار ہوا اور اسی طرح لڑتا رہا۔ پھر اس دوسرے گھوڑے کے بھی خستہ و بے کار ہونے پر ایک اصیل گھوڑی لی۔ اس اثنا میں یہ برابر چابک دستی سے بھالے اور تلوار مارتا تھا اور میدان نہیں چھوڑتا تھا۔ پھر اس کے دو زخم گولیوں اور نیزے کے کاری لگے اور گھوڑے کے زین پر بیٹھنے کی طاقت نہ رہی تو یہ زمین پر گرا۔ ہم پانچ افغان سواروں نے بہ طمع جواہر جو یہ پہنے ہوئے تھا اس کا تعاقب کیا اور چوں کہ یہ پیدل آہستہ آہستہ جا رہا تھا اس لئے ہم بہت جلد اس کے سر پر پہنچ گئے اور اس سے پوچھا کہ تو کون ہے؟ اور کس مرہٹہ لشکر کا سردار ہے۔ تو سچ بتادے اور ہم سے جان کا خوف نہ کر۔ ہم جہاں تو کہے گا تجھ کو پہنچا دیں گے۔ مگر اس نے ہمارے سوالات کا کچھ جواب نہیں دیا جس پر ہمارے ساتھ کے ایک سوار نے بگڑ کر اس کے نیزہ مارا۔ یہ جوان اگرچہ پیدل تھا لیکن اس نے افغان سوار کے نیزے کو پھرتی سے اپنے بھالے پر روکا اور اس کا نیزہ بیکار کر کے اس کو زخمی کیا۔ یہ دیکھ کر ہم نے اس کو مغلوب کرنے کا ارادہ کر لیا تاہم اس نے دو تین سواروں کو اس حالت میں بھی زخمی کر دیا۔ بعد ازاں زخموں کی کثرت سے چور ہو کر یہ زمین پر گرا۔ اس وقت میرے ساتھ کے ایک سوار نے گھوڑے سے اتر کر

اس کا سر کاٹ لیا اور اُس کے بدن پر جو جواہر تھا وہ اتار کر ہم نے آپس میں تقسیم کر لیا۔ سر کو وہ لئے جاتا تھا مگر میں نے اُس سے لے لیا۔

یہ حال سنکر نواب شجاع الدولہ نے اُس افغان سے سوال و جواب کیا تو ظاہر ہوا کہ سر درحقیقت اِسی نے کاٹا ہے اور یہ اُس کو چھپائے جا رہا تھا تاکہ زیور و جواہر کی بابت اُس سے کوئی پرسش نہ ہو۔ اِس سر کو نواب شجاع الدولہ نے اپنے مرہٹہ ساتھیوں کو دکھایا تو انہوں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا کہ دکھن کا نامور بہادر سردار (بھاؤ) یہی ہے۔ نواب شجاع الدولہ نے کچھ انعام کا وعدہ کر کے وہ سر اُس افغان سے لے لیا اور بعد ازاں اُن ہی برہمنوں کے ہاتھ سے ہندو مراسم کے موافق اُس کو اوّل منزل کرا دیا۔ جس مقام پر بھاؤ کی لاش ملی تھی وہاں ایک آم کا درخت تھا جو قریب ستر پچھتر سال بعد تک باقی تھا۔ اب گورنمنٹ نے اُس جگہ ایک یادگاری نشان بنوا دیا ہے۔ دیگر مرہٹہ سرداروں کی لاشیں بھی اسی طرح جلادی گئیں اور افغان مقتولین میں سپاہیوں کی لاشیں گڑھے کھود کر بعد یک جائی نماز کے دبادی گئیں اور افسروں کی الگ الگ قبریں بنائی گئیں اور نماز جنازہ بھی پڑھی گئی۔

مرہٹہ مقتولین کی لاشیں بھی کچھ گڑھوں میں دبائی یا مٹی سے چھپا دی گئیں۔ خاص کر وہ افغان سرداروں کے ڈیروں کے قریب پڑی ہوئی تھیں اور باقی لاشیں یوں ہی کھلے میدان میں پڑی ہوئی ہفتوں بعد تک طعمۂ زاغ و زغن ہوتی رہیں اور بیسیوں برس بعد تک مُردوں کی ہڈیاں کھیتوں میں ہل چلانے کے وقت نکلتی رہیں اور اب بھی گاہے گاہے برآمد ہوتی ہیں۔ قصبۂ پانی پت کے لڑکے میدانِ کارزار میں کھیلتے ہوئے اکثر سکّے اور دیگر اشیاء پاتے تھے اور قصبے کے چاروں سمتوں میں چالیس چالیس کوس تک مرہٹوں کے سامان کی دھات کی اشیاء لوگوں کو ملتی رہیں۔

کنکیڈ کی یہ روایت کہ امراؤ گر نے جو شجاع الدولہ کی فوج میں گوشائیوں اور ناگوں کے دستوں کا افسر تھا سوائے راؤ تنکوجی سیندھیا اور سنبھاجی واگھ اور جسونت راؤ کی لاشیں کریا کرم کے لئے تین لاکھ روپیہ دے کر افغان سے حاصل کیں درست نہیں ہے کیوں کہ مرہٹہ سرداروں کی لاشوں کو تلاش کرنے اور اوّل منزل پر پہنچانے میں کاشی راج برابر شریک رہا اور اگر امراؤ گر جو اس کا دوست و ہمعصر تھا اور دونوں ایک ہی جگہ

(نواب شجاع الدولہ کے ملازم تھے) روپیہ دے کر لاشوں کو حاصل کرتا تو وہ اپنے رسالے میں ضرور اس کا حوالہ دیتا۔

جنکوجی سیندھیا اور بابو پنڈت کا اتلافِ جان

بسواس راؤ کی لاش کے سلسلہ میں ایک اندوہناک واقعہ پیش آیا۔ جس کے باعث دو نامور و ممتاز مرہٹہ سرداران جنکوجی سیندھیا اور بابو پنڈت کی جانیں حسرت انگیز طریقے پر تلف ہوئیں۔ اس واقعے کی پوری کیفیت دیوان کاشی رائے معتمد نواب شجاع الدولہ نے اُس بیان میں لکھی ہے جو اُس نے اپنی زندگی کے آخری سالوں میں اپنے جانشینوں کی واقفیت کیلئے جنگِ سوم پانی پت کے متعلّق بزبانِ فارسی مرتّب کیا تھا اور جس کا دانا پور کے کرنیل جمیس براؤن نے انگریزی ترجمہ کر کے فروری ۱۷۹۱ء میں اُس کو چھپوایا تھا۔ کاشی رائے کی یہ کتاب اٹھارھویں صدی مسیحی کے آخری اور انیسویں صدی مسیحی کے ابتدائی سالوں میں بہت مشہور و مروّج تھی اور علی ابراہیم خان نے اپنی تاریخ جنگِ مرہٹہ و ابدالی لکھنے میں اس سے بڑی مدد لی۔ مگر اب عرصہ دراز سے کاشی رائے کی اصل فارسی کتاب بہت کمیاب بلکہ نایاب ہے۔ اور کرنل جمیس براؤن کا انگریزی ترجمہ ہی اس کی یادگار رہے جو انگلستان و ہندوستان میں دو تین دفعہ شائع ہو چکا ہے۔

کاشی رائے نے اپنی کتاب کو اگرچہ جنگ پانی پت کے کتنے ہی سال بعد قلمبند کیا مگر وہ اُس معرکے کی نسبت ایک نہایت مستند و با وثوق بیان سمجھا جاتا ہے۔ کیوں کہ کاشی رائے نے تمام واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے یا اُن کی صحیح اطلاع معتبر وسائل سے اُس کو ملی، اور اُس نے خود رسالۂ مذکور میں تحریر کیا ہے۔ کہ گو وہ اِن واقعات کو ایک عرصے کے بعد لکھ رہا ہے مگر حتّی الامکان اس نے کوئی ضروری امر فرو گذاشت نہیں کیا ہے۔ خصوصاً جنکوجی سیندھیا اور بابو پنڈت کی جانیں ضائع ہونے کی نسبت اُس کا بیان یقیناً درست و قابلِ اعتبار ہے۔ کیوں کہ وہ خود اِس معاملے میں ایک کارکن تھا۔

کاشی رائے کا بیان جنکوجی سیندھیا کے واقعے کی نسبت

کاشی رائے بسواس راؤ کی لاش کے متعلق افغان سپاہیوں کے مذکورۂ بالا مطالبہ اور ہندوستانی امرا کی اُس کو ہندو مذہب کی مراسم کے بموجب جلانے کی جدوجہد کا ذکر کر کے لکھتا ہے کہ یہ معاملہ کوئی دو روز تک زیر بحث رہا۔

نجیب الدولہ اور فی الحقیقت جملہ ہندوستانی رؤسا اِس درخواست میں شریک تھے (کہ بسواس راؤ کی لاش جلانے کے لئے ہندوؤں کے سپرد کردی جائے) میں بھی اسی وجہ سے میگھراج وکیل نجیب الدولہ کے ساتھ برخوردار خان اور اُن کے دیوان موتی لال کے ڈیروں پر بھیجا گیا۔

دوسری دفعہ میں تنہا گیا۔ اس وقت موتی لال نے مجھ سے دریافت کیا کہ میں صرف اسی کام (بسواس راؤ کی لاش حاصل کرنے) کے لئے آیا ہوں۔ یا کوئی اور کام اس کے علاوہ بھی اپنے سپرد لے سکتا ہوں، میں نے کہا کہ جس کام کو بھی وہ کہیں میں تا بہ مقدور اُس کے سر انجام دینے کو تیار ہوں۔ اِس پر وہ (موتی لال) چپکے سے مجھے اندر کے دو ڈیروں میں لے گیا۔ ایک ڈیرے میں میں نے راجہ بالو پنڈت بھاؤ کے وکیل کو پایا۔ جو زخمی تھا۔ اُس کے ساتھ میں کچھ دیر تک بات چیت کرتا رہا۔ اس کے بعد میں دوسرے ڈیرے میں گیا جہاں راؤ جنکوجی سیندھیا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بندوق کی گولی کا زخم تھا اور ہاتھ میں برچھی لگی تھی جس کو وہ رومال کی گلجن پٹی میں ڈالے ہوئے تھا اور کوئی تیئیس ۲۳ سال کی عمر کا مضبوط جوان تھا۔ وہ برہان پوری چیرہ نافرمانی رنگ کا سر پر باندھے اور گجراتی مشروع کا کھنّا پہنے تھا، مجھے دیکھکر اُس نے سر نیچا کر لیا میں نے یہ دیکھکر کہا کہ "آپ ایسا (اظہار ندامت) کیوں کرتے ہیں۔ انسان سے جس بہادری و جان نثاری کی امید ہوسکتی ہے وہ آپ نے کی، اور اِس لڑائی کے کارنامے ہمیشہ انسانوں کو یاد رہیں گے۔"

یہ سُن کر جنکوجی نے اپنا سر اٹھایا اور کہا کہ سچ ہے۔ تقدیر پر کسی شخص کا زور نہیں چل سکتا مشیتِ ایزدی میں دم مارنے کی جگہ نہیں ہے۔ کاش کہ میں میدانِ جنگ میں مارا جاتا، مگر میری قسمت میں یہ لکھا تھا کہ یہاں لایا جاؤں۔ اب یہ لوگ مجھ سے روپیہ مانگتے ہیں اور جو کچھ یہ طلب کرتے ہیں اس کا ادا کرنا میرے لئے کچھ مشکل بھی نہیں ہے۔ مگر اُس کو اس وقت یہاں حاصل کرنا ممکن نہیں۔ تم میرے باپ (جیاپا سیندھیا) کے دوست تھے اور ہمارے اور نواب (شجاع الدولہ) کے خاندان میں ہمیشہ مراسم اتحاد رہے اور میرے باپ نے ان کی بہت کچھ خدمت کی ہے۔ اگر نواب صاحب اپنی سرکار سے اس وقت میری رہائی کے لئے روپیہ دے دیں تو یہ ایک ایسا احسان ہوگا جس کو میں عمر بھر نہ بھولوں گا۔"

جنکوجی سے یہ سُنکر) میں نے ان کو اطمینان دلایا کہ نواب اِس موقع پر کوتاہی نہ کریں گے اور یہ معلوم کرنا چاہا کہ کتنا روپیہ درکار ہے، موتی لال نے کہا کہ سات لاکھ روپیہ مانگ رہے ہیں

میں نے جواب دیا کہ اتنا روپیہ تو اس وقت کوئی نہ دے سکے گا۔ البتہ مناسب رقم ہو تو نواب صاحب ضرور دے دیں گے۔ موتی لال نے کہا کہ شاید اس سے کم رقم پر معاملہ طے ہو جائے۔ میں فوراً نواب صاحب کی خدمت میں واپس آیا۔ اِس وقت نواب موصوف نجیب الدولہ کے ساتھ ایک مسند پر بیٹھے ہوئے ناچ دیکھ رہے تھے۔ میں نے اُن سے تمام وہ گفتگو بیان کی جو اُس کام (یعنی اس راؤ کی لاش کی ہندوؤں کو حوالگی) کی بابت ہوئی تھی جس کے لئے انہوں نے مجھے بھیجا تھا لیکن چوں کہ مجھے اس خصومت کا حال خوب معلوم تھا جو نجیب الدولہ کو جنکوجی کے گھرانے اور ذات سے تھی، اور یہ خیال تھا کہ نجیب الدولہ بہت ہوشیار ہے اور اُس نے جنکوجی کے زندہ ہی گرفتار ہونے کی کچھ سُن گن پائی ہوگی۔ اس واسطے میں نے جنکوجی کا احوال اس وقت نواب صاحب سے کہنا مناسب نہ سمجھا اور ڈیرے کے دوسرے حصّے میں چلا گیا۔ لیکن نجیب الدولہ نے مجھے غور سے دیکھا تھا اور بعد میں نواب (شجاع الدولہ) سے کہا کہ کاشی راج کے بشرے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اور کچھ بات بھی کہنا چاہتا ہے جس کو میرے سامنے نہیں کہہ سکتا۔ شجاع الدولہ نے جواب دیا کہ میرے اور آپ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے اور فوراً مجھے بُلایا اور گنگاجی کی قسم مجھے دلا کر کہا کہ نجیب الدولہ کے موجود نہ ہونے کی صورت میں جو کچھ میں کہتا وہ بیان کر دوں۔ اِس طرح مجبور ہو کر میں نے (جنکوجی اور بابو پنڈت کے برخوردار خان کے ڈیروں میں موجود ہونے اور اُن سے روپیہ طلب کئے جانے اور جنکوجی کے نواب صاحب سے مدد چاہنے کا) سب حال بیان کر دیا۔ نجیب الدولہ جو اپنے دل کی باتیں چھپانے اور ظاہر داری برتنے میں کمال رکھتا تھا۔ اُس کو سُن کر بظاہر بہت خوش ہوا اور کہنے لگا کہ اپنے دشمنوں سے مصیبت کے وقت نیک کرنا بہت مناسب ہے اور اِس سے مردوں کی نیک نامی ہمیشہ رہتی ہے۔ آپ جنکوجی کی رہائی کے لئے سعی کریں اور جو کچھ روپیہ طے ہوگا اُس کا نصف حصّہ میں دُوں گا۔ نجیب الدولہ کا یہی طریقہ تھا۔ مگر نواب سے رخصت ہونے کے بعد وہ سیدھا اشرف الوزراء کے ہاں گیا اور اُن کو تمام باتوں سے مطلع کر دیا۔

چُوں کہ ایک طرف نجیب الدولہ سیندھیا کے خاندان کو نیست و نابود کرنا چاہتا تھا اور دوسری جانب وزیر بھی برخوردار خان کا دشمن تھا جس کو وہ اُس کے خفیہ نامہ و پیام کا حال ظاہر کر کے نقصان پہنچانا چاہتا تھا۔ اِس لئے وہ اُسی وقت سوار ہو کر شاہ ابدالی کے

پاس گیا اور جنکوجی سیندھیا کا برخوردار خان کے ڈیرے میں ہونے کا حال اُن سے کہا۔ شاہ موصوف نے برخوردار خان کو بلایا اور جنکوجی کو چھپائے رکھنے کی بابت اُس سے دریافت کیا اس نے وزیر کو بیٹھے دیکھ کر صاف انکار کیا کہ مجھے اِس کا کچھ علم نہیں۔ اُس وقت وزیر نے مجھے شہادت دینے کیلئے بُلایا۔ لیکن میرے سب حال کہہ دینے کے بعد بھی برخوردار خان انکار ہی کرتا رہا جس پر شاہ نے اپنے نسقچیوں کو حکم دیا کہ جاکر برخوردار خان کے ڈیرے کی تلاشی لیں۔ اس طرح جب برخوردار خاں بالکل مجبور ہو گیا تو اس نے اپنے آدمیوں کو حکم بھیجا کہ شاہ کے نسقچیوں کے پہنچنے سے پہلے جنکوجی اور بابو پنڈت دونوں نظر بندوں کو ٹھکانے لگا کر ڈیروں کے اندر ہی دفن کر دیں برخوردار خاں کے ملازموں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور اس طرح ان دونوں بدنصیبوں کی جان گئی۔

نجیب الدولہ کا طریق عمل

کاشی رائے کے مندرجۂ بالا بیان سے نجیب الدولہ پر ان دونوں سرداروں کے اتلافِ جان کی پوری ذمہ داری عائد ہوتی ہے مگر کاشی رائے کا محض قیاس ہے جو خاندان سیندھیا کے ساتھ نجیب الدولہ کے جذبات خصومت کو مدِّنظر رکھکر قائم کیا گیا ہے اور ان جذبات کا ہونا اس تکلیف و پریشانی کو مدِنظر رکھتے ہوئے چنداں تعجب انگیز نہیں جو نجیب الدولہ کو شکرتال میں کئی مہینے برابر اُٹھانی پڑی جب کہ دتّاجی و جنکوجی سیندھیا نے اُس کا محاصرہ کر رکھّا تھا اور مرہٹے اُس کے علاقے کو بے رحمی سے تاراج کر رہے تھے۔ نجیب الدولہ نے اگر فی الحقیقت ذاتی دشمنی سے جیاپا سیندھیا کے نوجوان ہونہار فرزند جنکوجی کی جان پانی پت میں ضائع کرائی۔ تو قدرت نے اس کا بہت ہولناک انتقام نجیب الدولہ کی اولاد سے لے لیا جس کے بیٹے ضابطہ خاں کو مرہٹوں نے اِس طرح تباہ کیا کہ آج تک "سبل گڈھ" کے کھنڈر اُس واقعہ پر نوحہ کناں ہیں اور نجیب الدولہ کے پوتے غلام قادر خان کو بھی خاندان سیندھیا ہی کے ایک ممبر نے شاہ عالم پر ظلم و ستم کرنے پر شدید ترین عقوبت میں گرفتار کیا۔

مگر اس وقت کے حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ دوسرا قیاس کرنا بھی ممکن ہے کہ نجیب الدولہ جو شاہ ابدالی کو ہر طریقے پر خوش کرنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ شاہ موصوف نے اُس کو اُس کے دشمنوں کے خطرے سے بچایا تھا وہ جنکوجی کو قتل کرانے کے درپے نہ ہو بلکہ صرف اس کا اور بابو پنڈت کا زرفدیہ بجائے برخوردار خان کے جو اس معاملے کو پوشیدہ طور پر بالا بالا طے کر کے

خود فائدہ اٹھانا چاہتا تھا وزیر وشاہ کو دلانا چاہتا ہو، وزیر کو اس سے برخوردار خان کو زک دینے کا ایک موقعہ دستیاب ہوا اور برخوردار خان نے وزیر کی اندرونی خصومت سے خود کو محفوظ رکھنے کے لئے اُن دونوں سرداروں کو جلد سے جلد قیدِ حیات سے چھڑانا ضروری سمجھا۔ بہرحال نجیب الدولہ کی نیت خواہ بُری ہو یا بھلی۔ مگر جنکوجی سیندھیا جیسے بہادر نوجوان اور بابو پنڈت جیسے مدبّر کا اِس حسرت انگیز طریقے پر مارا جانا بہت دردناک تھا۔ اور شجاع الدولہ و نجیب الدولہ و دیگر سردارانِ روہیلہ اس کا ہمیشہ رنج و افسوس کے ساتھ ذکر کیا کرتے تھے۔

ابراہیم خان گاردی کا انتقال

مرہٹوں کا نامور افسر توپ خانہ ابراہیم خان گاردی میدانِ پانی پت میں سخت زخمی ہو گیا تھا مگر اُس کے بچ جانیکی اُمید تھی۔ وہ بحالتِ زخمداری نواب شجاع الدولہ کے کیمپ میں پہنچ گیا تھا اور نواب نے اُس کو پناہ دی تھی اور پوشیدہ طور سے اودھ میں بھیجنے کا انتظام کر رہے تھے۔ کیوں کہ نواب اس کی جنگی قابلیت کے معترف و مدّاح تھے اور اس کی تیار کردہ پلٹنوں نے میدانِ کارزار میں جو زبردست مہارتِ فنونِ حرب دکھائی تھی اُس کا اُن کے دل پر کافی اثر تھا۔ مگر افغانوں کو جب گاردی کے نواب شجاع الدولہ کے پاس ہونے کی خبر ملی تو چوں کہ اس کی پلٹنوں کے حملے سے ان کا بہت زیادہ نقصان ہوا تھا اور اُن کے بہت سے اعزّہ و اقارب میدانِ پانی پت میں مارے گئے تھے اِس لئے انہوں نے شاہ ابدالی کے پاس جاکر گاردی کو اپنے عزیزوں کے خون کے عوض قتل کئے جانے کا مطالبہ کیا۔

شاہ نے شجاع الدولہ سے پوچھا تو پہلے انہوں نے انکار کیا مگر قسم دیئے جانے پر مان لیا کہ وہ ان کے ہاں موجود ہے اور اُس کی شجاعت و نمک حلالی کی تعریف بھی کی۔ افغانوں نے اُس کی حوالگی پر زور دیا تو نواب نے کہا کہ جو شخص میری پناہ میں آیا ہے خواہ وہ دشمن ہو۔ مگر اُس کی حفاظت مجھ پر فرض ہے۔ افغانوں نے کہا کہ ہمارے ہزاروں بھائیوں کا خون اُس کی گردن پر ہے اور وہ کافروں کی طرف ہو کر شاہ اسلام سے لڑا۔ شجاع الدولہ نے اس کو تسلیم نہیں کیا اور فارسی تاریخوں میں لکھا ہے کہ افغانوں کے زیادہ شور مچانے پر نواب شجاع الدولہ اپنی سپر و شمشیر ہاتھ میں لے کر لڑائی کے ارادے سے کھڑے ہو گئے۔ اُسوقت اشرف الوزراء نے افغانوں کا ہجوم اور جوش دیکھ کر شجاع الدولہ کو الگ لیجا کر سمجھایا کہ

فی الحال گاردی کو ہمارے لشکر میں بھیج دیجئے۔ میں اُس کی حفاظتِ جان کا ذمّہ دار ہوں اور افغان سپاہیوں کو ٹھنڈا کرکے ایک ہفتے بعد اس کو تمہارے پاس واپس بھیج دوں گا اور اِس اثنار میں اس کا علاج برابر انہیں جرّاحوں سے کرایا جائے گا جن کو آپ نے مقرر کیا ہے۔ شجاع الدولہ نے وزیر سے گاردی کی حفاظتِ جان کا حلفیہ وعدہ لے کر اس کو اُن ... پاس بھجوا دیا۔ وہ اگرچہ اس وقت سخت زخمی تھا مگر اس حالت میں بھی اُس نے ... وزیر کے سوالوں کے مردانہ وار جوابات دیئے۔ اور جب کسی نے اُس کی حالت اسیری ... چڑانا چاہا تو گاردی نے کہا کہ "مشیت ایزدی سے انسان مجبور ہے۔ بھاؤ جیسا لاثانی دلاور میدانِ کارزار میں مارا گیا اور میری یہ حالت ہوئی مگر میں نے اپنے مالکوں کا حق نمک ادا کیا اور آیندہ جو کوئی مجھ سے خدمت لے گا اُس کے کام میں ایسی ہی جان فشانی کروں گا۔"

شاہ نے اس کو اشرف الوزرار کے سپرد کر دیا اور علاج کے لئے تاکید کی مگر ایک ہفتہ بعد جس روز شاہ ابدالی دار السلطنتہ دہلی میں داخل ہوئے۔ گاردی کا انتقال ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ افغانوں نے جرّاحوں سے مل کر اُس کے زخموں پر زہر آلود مرہم کے پھائے رکھوا دئیے تھے۔ گاردی شہر دہلی کے باہر قبرستان میں دفن کیا گیا۔ مگر اب اس کی قبر کا نشان نہیں ملتا۔

بھاؤ کا زبردست رسوخ واثر دوست دشمن دونوں کا اِس امر پر اتفاق ہے کہ مرہٹوں نے پانی پت میں کافی تہور وبسالت کا اظہار کیا۔ اور بالخصوص اُن کے سپہ سالار (بھاؤ) نے وہ جوان مردی وشجاعت دکھائی جو افغانوں سے بھی خراجِ تحسین وصول کئے بغیر نہیں رہی۔ بھاؤ کو ملہار راؤ ہولکر سے پہلے اپنی جان بچا کر میدان سے نکل جانے کا موقع تھا اور اگر وہ اس موقعے سے کام لیتا اور دہلی کا رُخ کرتا تو وہاں تیسرے چوتھے ہی روز راجہ نارو شنکر کی جمعیّت کی بنیادوں پر پانی پت کے بچے ہوئے آدمیوں کی ایک خاصی بڑی فوج تیار ہوسکتی اور جو کمک دکن سے چلی آرہی تھی اُس کے آملنے پر مرہٹوں کی قوت پھر شمالی ہند میں خاصی مضبوط ہو جاتی۔ مگر بسواس راؤ کو اپنے پہلو میں مہلک زخم کھا کر گرتے دیکھ کر بھاؤ دل شکستہ ومایوس ہوگیا اور اپنے نوجوان بھتیجے کی موت اور بڑے بڑے مرہٹہ سرداروں کی عورتوں اور بچوں کی افغانوں کے ہاتھوں میں گرفتاری

کے بعد اُسے دکن واپس جانے اور اپنے بھائی پیشوا کو منھ دکھانے کی ہمّت باقی نہیں رہی۔ اِس لئے اس نے میدانِ جنگ میں بہادروں کی موت مرنا پسند کیا اور اپنی زندگی کے آخری لمحات میں بھی پیدل وزخمی ہونے کے باوجود پانچ افغان سواروں کے مقابلے سے منھ نہیں پھیرا۔ بھاؤ کے لاشۂ بے سر کو خود پیشوا کے وکیل اور دیگر خیر خواہوں اور ملازموں نے شناخت کرلیا تھا۔ بعد میں سر بھی دستیاب ہوگیا تھا۔ مگر تن اور سر کے الگ الگ ملنے سے لاش کی اصلیت کے متعلق جو شبہ پیدا ہوگیا تھا اُس کے باعث بھاؤ کے میدانِ جنگ سے زندہ نکل جانے کی افواہیں شمالی ہند سے اُڑ کر دکن پہنچیں۔ اور پہلے تو صرف اس کے قریبی عزیزوں اور مدّاحوں نے ان ضعیف توقعات کو اپنے دل میں جگہ دی مگر بعد ازاں پونا کی مرکزی قوت میں جو اضمحلال و انتشار پیدا ہوا اس نے دیگر اشخاص کو بھی اُن افواہوں کے قبول کرنے پر مائل کر دیا اور جن دو شخصوں نے "بھاؤ" ہونے کا دعویٰ کیا۔ اُن میں سے ایک شخص کو بھاؤ کے سسرالی رشتہ داروں کی اِس قدر تائید حاصل ہوگئی کہ اس نے ایک مختصر جمعیت اپنے گرد فراہم کرنے میں کامیابی حاصل کرلی اور مرکزی حکومت کے ارکان کو اُس کے خلاف فوجی کارروائیاں کرنی پڑیں۔

اِس خانہ جنگی میں سینکڑوں جانوں کا نقصان ہوا اور چُوں کہ زوجۂ بھاؤ کے اِس شخص کے فریب میں آجانے سے اس کے جرم کی نوعیت بہت سنگین ہوگئی تھی۔ اِس لئے اس کو بہت سخت سزا دی گئی اور ہاتھی کے پائوں سے بندھوا کر سارے شہر میں اس کی لاش کی تشہیر کرائی گئی۔ دوسرے شخص کو چوں کہ چنداں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اِس لئے صرف قید کی سزا اُس کے لئے کافی سمجھی گئی اور اُس کی گرفتاری کا فرض بھی دوستوں نے ادا کیا۔

اِن واقعات سے عیاں ہے کہ بھاؤ کی مرہٹوں کے دل میں کتنی زیادہ وقعت و عزّت تھی اور اگر وہ پانی پت میں بحالتِ یاس و حرمان اپنی جان نہ گنواتا تو گو اُس زبردست شکست کی ہرگز تلافی نہیں کرسکتا تھا جو اُس کے لشکرِ عظیم کو پانی پت میں اٹھانی پڑی۔ تاہم اِس شکست کے مضرّت رساں اثرات میں ضرور کمی ہوجاتی اور پیشوا کے زوالِ اقتدار کی وہ کچھ روک تھام کرسکتا۔

معرکۂ پانی پت فنِ حرب کے پہلو سے | شاہ ابدالی پانی پت میں اپنے ہندوستانی

فیقوں سے کہا کرتا تھا کہ اُن کو اس کا پورا اختیار حاصل ہے کہ اگر چاہیں تو مرہٹوں سے صلح کرلیں اور صلح کی جو شرائط اپنے نزدیک مناسب سمجھیں۔ وہ قرار دادیں۔ وہ اُس کے لشکر میں اطمینان کے ساتھ پاؤں پھیلا کر سوئیں۔ کیوں کہ وہ اُن کی حفاظت کا ذمہ دار ہے اور اس کے افغانی سپاہی اُن کے پسینے کی جگہ اپنا خون گرانے کو تیار ہیں۔ لیکن اگر جنگ کی نوبت پہنچے گی تو ہندستانی سرداران کو اس کی رہ نمائی قبول کرنی پڑے گی اور اس میں کلام نہیں کہ اگرچہ روہیلہ سرداروں اور نواب احمد خان بنگش نے لڑائی میں ہر قسم کی جانفشانی و تن دہی سے کام لیا اور نواب شجاع الدولہ نے بھی جو ابتدا میں لڑائی سے الگ رہے تھے آخری نازک وقت میں اشرف الوزراء کو قیمتی مدد پہنچائی۔ لیکن تمام فوجی افسران جنہوں نے سوم جنگ پانی پت پر خالص فن حرب کے پہلو سے نظر ڈالی ہے اِس بارے میں ہم آہنگ ہیں کہ شاہ ابدالی نے باغپت کے گھاٹ پر جمنا کو عبور کرنے کے وقت سے لے کر پانی پت کے میدان کارزار میں مرہٹوں کے لشکرِ عظیم کو شکست فاش دینے کے وقت تک اِس پورے وقت میں اعلیٰ مہارت فن حرب کا ثبوت دیا اور دکنی سردار جس طریقہ حرب میں مشاق تھے اسی کو خود بڑی مستعدی اور ہوشیاری کے ساتھ برت کر اُن کی ہزیمت کا سامان بہم پہنچایا۔

بھاؤ نے پانی پت کے گرد خندق اور دمدمے تیار کر کے اور اُن پر زنجیرہ بند توپیں لگا کر اپنی حفاظت کا انتظام کیا تھا مگر بعد میں یہی حصار اُن کی کمزوری کا باعث ہوا اور مرہٹوں کا لشکر خود اپنی تیار کردہ لائن کے اندر محصور ہو گیا۔ مرہٹے فی الحقیقت سیواجی کے وقت سے "گوریلا وارفیر" یعنی قزاقی لڑائیوں یا اُردو کے سب سے بڑے شاعر حضرت میرؔ کے الفاظ میں جو انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری "ذکرِ میر" میں جنگ سوم پانی پت کا حوالہ دیتے ہوئے مرہٹوں کے طریقہ جنگ کی نسبت استعمال کئے ہیں "جنگِ گریز پائی" میں مشاق تھے اور کھلے میدان میں بڑی فوجوں کے ساتھ قوت آزمائی پر کبھی آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ سیواجی کی کامیابی کا راز یہی تھا کہ وہ اپنے سپاہیوں کو پہاڑوں اور جنگلوں میں متفرق طور پر پوشیدہ رکھتا تھا اور جب موقعہ دیکھتا تھا تو شہروں قصبوں یا شاہی قلعوں پر طوفانِ برق و باد کی سرعت سے یکایک ٹوٹ پڑتا تھا اور شہنشاہی افواج کی آمد سے پہلے لوٹ مار کر کے نکل جاتا تھا۔

شائستہ خان سپہ سالار افواج شہنشاہی پر شب کو خاص اُس کے محل میں حملہ کرنا۔

جس میں خان موصوف کا ایک بیٹا کام آیا اور خود اُس کو اپنی گردن شمشیر کے وار سے بچانے میں اپنے ہاتھ کی دو انگلیوں سے دست بردار ہونا پڑا سیواجی کا ایک خاص کارنامہ تھا اور اس کے جانشینوں نے بھی اُسی کا طریقہ جنگ اختیار کیا کہ مرہٹہ سوار ہلکے سامان کے ساتھ بھالوں اور تلواروں سے مُسلح تیز رفتار گھوڑوں پر چڑھ کر کوسوں کے دھاوے مارتے تھے اور جس علاقے میں پہنچتے تھے۔ اُس کو اپنی تاخت و تاراج سے بے چراغ کر دیتے تھے۔ دشمن کا رسالہ اگر ان کے ایک دستے کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاتا تھا تو دوسرا دستہ دائیں بائیں سے یکایک اُس پر آپڑتا تھا اور اپنے ساتھیوں کو چھڑانے کے ساتھ رسالے کا سامان بھی لوٹ لے جاتا تھا۔ بعد میں جب شاہی فرامین کی رُو سے بڑے بڑے علاقوں کی حکومت ان کو حاصل ہوئی تو انہیں بتدریج میدان داری بھی سیکھنی پڑی۔ مگر جنگِ پانی پت سب سے بڑی میدانی لڑائی تھی جو مرہٹوں کو اپنے دورِ اقتدار میں لڑنی پڑی۔

اگر بھاؤ اپنے خیر خواہ سورج مل جاٹ اور ملہار راؤ ہولکر کے مشورے کو رعونت کے ساتھ مسترد نہ کرتا اور شاہ ابدالی کے جمنا سے عبور کر لینے کے بعد بھی وہی قرادلی لڑائی کی طرح ڈالتا تو عجب نہیں کہ وہ شاہ ابدالی کے ہندوستانی رفیقوں کو شاہ کے لشکر سے اپنے علاقوں کی حفاظت کے لئے جانے اور مرہٹوں کے ساتھ مناسب شرائط پر صلح طے کر لینے پر مجبور کر دیتا اور شاہ ابدالی بھی سرہند تک جو ہندوستان کی سمت میں پنجاب کا آخری مقام ہے اپنا تسلط قائم کر کے اپنے وطن واپس چلا جاتا۔ مگر بھاؤ کو ابراہیم خان گاردی کی قواعد دان پلٹنوں اور توپ خانے پر بڑا بھروسہ تھا جن کو وہ دکن کی لڑائیوں میں مضبوط قلعوں کو بہ آسانی مسخر کرتے اور طاقتور فوجوں کو شکست دیتے دیکھ چکا تھا۔

حقیقت میں فوج کا یہ حصہ مرہٹوں کے لئے بالکل نیا تھا۔ اور بھاؤ کو اُس کی مجبوریوں اور کوتاہیوں پر غور کرنے کا ابھی موقعہ نہیں ملا تھا بلکہ دہلی اور کنجپورہ کے قلعوں کے دروازے گاردی کی توپوں کے چند فیروں کے بعد ہی کھُل جاتے دیکھ کر اُس کے حوصلے اور بڑھ گئے تھے۔ برخلاف ازیں شاہ ابدالی نے اپنی فراست سے یہ سمجھ لیا تھا کہ بھاری توپیں قلعوں کی تسخیر یا حفاظت میں تو کام آسکتی ہیں مگر رسالے کے ساتھ اُن کا

اتحادِ عمل زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا اس نے نقشۂ جنگ اِس قسم کا تجویز کیا کہ اُسے خود مرہٹوں کی لائن پر حملہ آور ہونے اور اپنی سپاہ کو گارڈی کی توپوں کی زد میں لانے کا موقعہ پیش نہ آئے بلکہ وہ مرہٹوں کو اپنے حصار سے نکل کر حملہ آور ہونے پر مجبور کرے۔ اِس صورت میں اُن کی زیادہ بھاری توپیں پیش قدمی کے وقت ان کا ساتھ نہ دے سکیں گی اور دوسری توپیں بھی دونوں طرف کے سواروں کی باہمی آویزش کے وقت بیکار ہو جائیں گی۔

چنانچہ شاہ موصوف کا یہ خیال بالکل درست نکلا اور گارڈی کی توپوں سے میدان کی دست بدست لڑائی میں کچھ زیادہ کام نہیں دیا۔ البتہ اُس کی پلٹنوں نے اپنی قواعددانی کی بدولت ابتدائی حملہ میں غلبہ حاصل کر لیا اور افغانوں کے آٹھ دس ہزار آدمیوں کو گرا کر اُن کی لائن توڑ دی اور افغان سپاہی ان کے مسلسل فیروں کی تاب نہ لا کر پیچھے ہٹنے اور بھاگنے لگے۔ لیکن چوں کہ اِس قواعدداں فوج کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تھی اِس لیے جب دشمنوں نے دوبارہ ہجوم کیا تو وہ چاروں طرف سے گھر گئیں اور توپیں ان کو مطلق مدد نہ پہنچا سکیں۔ کیوں کہ اگر اُن سے کام لیا جاتا تو اُن کی آتشباری پہلے خود ان پلٹنوں کا ستھراؤ کر دیتی۔ اِس اثنا میں گارڈی کے شدید مجروح ہونے کے باعث وہ اپنے ہوشیار قائد سے بھی محروم ہو گئیں کیوں کہ مرہٹہ سرداروں میں سے کوئی اِن قواعددان پلٹنوں کو اُن کے مقررہ طریقے کے موافق لڑانے کی قابلیت نہ رکھتا تھا۔

ایک انگریز جرنیل نے اپنے جنگ سوم پانی پت کے مشہور تبصرہ میں یہ بہت پتے کی بات کہی ہے کہ شاہ ابدالی کی جنگی چالیں فی الحقیقت مرہٹوں کو اُن کے مضبوط حصار ہی کے اندر بھوکا مار کر مغلوب کر چکی تھیں مگر مرہٹوں کے لیے اتنی بڑی جمعیت کے ساتھ ہتھیار ڈال دینا اور اجنبیوں کی اطاعت قبول کر لینا سخت دشوار اور اُس وقت کے طریقوں کے لحاظ سے قریباً محال تھا خصوصاً جب کہ انہیں افغانوں کی بے رحمی اور خوں خواری کا بھی علم تھا۔ لہٰذا جنگ کی بازی کے ہر جانے کا یقین رکھنے کے باوجود انہوں نے میدانِ جنگ میں بہادروں کی موت مرنا پسند کیا اور وہ اپنے حصار سے مہم کو سر کرنے کے لئے نہیں بلکہ مردوں کی طرح مرنے کے لئے باہر نکلے اور بہت جان

توڑ کر لڑے اور دشمنوں کی صفوں میں گھس گئے۔

بھاؤ کو چوں کہ حالات نے سخت پریشان و بے بس کر دیا تھا۔ اس لئے اس نے اُن معمولی احتیاطوں کو بھی جو اتنے بڑے معرکۂ کارزار کے لیئے لازمی تھیں استعمال نہیں کیا اور اپنی پوری قوت شروع ہی سے لڑائی میں لگا دی۔ برخلاف ازیں شاہ ابدالی نے ایک ہوشیار و آزمودہ کار جرنیل کی طرح اپنے خاص محافظ دستوں کو ریزرو میں رکھا اور شجاع الدولہ پر بھی صفوف زد و خورد میں داخل ہونے کے لئے زور نہیں دیا اور جب مرہٹوں کا زور کئی گھنٹے مسلسل شمشیر زنی و نیزہ بازی کے بعد گھٹنے لگا تو اس نے اپنے محافظ دستوں اور نواب کی فوج سے جو تازہ دم تھیں مرہٹوں پر جو خستہ ہو چکے تھے نہ صرف سامنے کے رُخ سے حملہ کر دیا بلکہ اپنی محافظ سپاہ کے ایک حصّے کو کسی قدر چکّر کھا کر مرہٹوں کے بازو پر گرنے کا بھی حکم دیا اور مرہٹوں کی صفوف اس دو طرفی مار سے بالکل اُلٹ گئیں اگر اِس وقت بھاؤ کے پاس بھی کوئی ایسا ہی ریزرو موجود ہوتا تو شاہ ابدالی کی یہ جنگی چال ایسی آسانی سے کامیاب نہ ہوسکتی اور کم از کم مرہٹوں کو ترتیب کے ساتھ میدان سے ہٹ آنے کا موقعہ مل جاتا۔ گو اپنے سامان و اسباب اور عورتوں کو جو حصار کے اندر تھیں وہ اِس حالت میں بھی افغانوں کے ہاتھ میں پڑنے سے نہیں بچا سکتے تھے۔ کیوں کہ حصار کے اندر واپس ہونا فاقوں سے مرنے کے مترادف تھا۔

بھاؤ کے لئے یہ کچھ مشکل نہیں تھا کہ وہ اپنی اور بسواس راؤ کی پائیگاہوں کی خاص افواج کو آخری یا مناسب وقت کی کوشش کے لئے ریزرو میں رکھتا لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے مرہٹے کسی باقاعدہ میدانی لڑائی کے لئے حصار سے نہیں نکلے تھے بلکہ ناکشی اور وبائی امراض سے ہلاک ہونے کے بجائے دشمنوں سے لڑکر مرجانا چاہتے تھے اُن سخت ناگوار حالات میں ان کے لئے کامیابی کی صرف ایک صورت تھی کہ وہ پہلا دم زبردست حملہ کر کے افغانوں کے پانوں میدان سے اکھیڑ دیتے مگر شاہ ابدالی اس سے ہوشیار تھا۔ اس طرح مرہٹوں کی مدد و شمشیر کا مقابلہ کرنے کے لئے بھی تیار تھا اور جاسوسوں کے ذریعے سے اپنے آپ کو مرہٹوں کی سپاہ کی حالت سے باخبر رکھتا تھا۔ چنانچہ اُس نے فن حرب کے مسلمہ اصول سے مرہٹوں کی طاقت و حملے کو

برداشت کیا۔ اور آخر میں اپنے ریزرو دستوں کو بڑی ہوشیاری اور چابک دستی کے ساتھ استعمال کر کے ان کو شکست دے دی بس نے اس وقت کے حالات کی وجہ سے ہزیمت کی صورت قبول کر لی۔

شاہ ابدالی بانیٔ آزاد افغانستان

شاہ ابدالی کا ایک طاقتور حکمران اور ہوشیار جرنیل ہونے کے علاوہ ہم قوم افغانوں پر ایک یہ احسان عظیم بھی ہے کہ اس نے اُن کو غیروں کی ماتحتی سے چھڑایا۔ اور اس آزاد افغانستان کی بنیاد رکھی۔ جو آج کل اپنے جوان بخت و جوان سال حکمران کی سرپرستی و رہنمائی میں اصلاح و ترقی کی شاہراہ پر بڑی تیزی کے ساتھ قدم بڑھا رہا ہے اور قرائن و آثار کو دیکھتے ہوئے عنقریب ایشیا کی ایک اہم طاقت بننے والا ہے۔ شاہِ ممدوح ایک باسطوت و جبروت حکمران کے بجائے ایک خوددار قومی لیڈر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو افغانستان کے تمام باشندوں کو بلاتفریق نسل و عقیدہ ایک طاقتور قوم بنا دینا چاہتے ہیں اور مشرق جو ڈیڑھ صدی سے مغربی سرمایہ داروں کے عالمگیر اقتدار کی ہوس کا تختۂ مشقِ ستم بنا ہوا ہے اُس کو قعرِ مذلت سے نکالنے کے لئے دیگر مشرقی اقوام کے ساتھ برادرانہ اتحاد پر عمل کرنا چاہتے ہیں جس میں ہندوستان کے بشمول محبانِ وطن بلکہ تمام ہمدردِ بنی نوع انسان کی نیک خواہشیں اُن کے شامل حال ہیں۔

تاریخ سے عیاں ہے کہ افغانستان زمانۂ قدیم سے مختلف قبائل کا مسکن تھا جو اپنے کوہستانی علاقوں میں آزادانہ زندگی بسر کرتے اور باہم دگر برسرِ پیکار رہتے تھے۔ اُن کی اِس آخرالذکر عادت سے ہمسایہ ملکوں کے حوصلہ مند اشخاص نے فائدہ اٹھایا اور اگر ہندوؤں کی قدیم افسانہ نما روایات کا جن کی آثار قدیمہ کے اکتشافات سے برابر تصدیق ہو رہی ہے لحاظ نہ کیا جائے تو بھی تاریخ کے زمانے کی مستند روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ افغانستان کا ملک دشوار گذار کوہستانی علاقوں پر مشتمل ہونے کے باوجود ہمیشہ اپنی ہمسایہ اقوام کی حرکت زیوں کا جولانگاہ بنا رہا اور غزنوی و غوری خاندانوں کے اقتدار کے مختصر درمیانی وقفہ کے سوا کوئی باقاعدہ مستقل حکومت اس میں اسوقت تک قائم نہیں ہوئی جب تک نادرشاہ کی وفات کے بعد ملک ایران کی خانہ جنگی اور

مغلیہ سلطنت ہندوستان کی کمزوری کے وقت میں جرنیل احمد خان ابدالی نے اپنے ہم قوم افغان سرداروں کی رضامندی و تائید سے تاج شاہی اپنے سر پر نہیں رکھا اور افغانستان میں ایک مستقل و مضبوط مرکزی حکومت کی بنیاد نہیں ڈالی۔ یہ بنیاد شاہ موصوف کے ہاتھ سے ایسے مبارک و مسعود وقت میں رکھی گئی کہ اگرچہ اُس کے بعد اندرونی حکومتِ افغانستان میں خاندان اور شخصیتوں دونوں کے انقلابات ہوئے اور شاہ ابدالی کے کمزور و غیر ہر دل عزیز پوتے کو انگریزی افواج نے ہندوستان سے ساتھ لے جا کر اپنی سنگینوں کے سایہ میں تختِ کابل پر بٹھایا لیکن شاہ ابدالی نے اپنی مسلسل شاندار فتوحات سے افغانوں کے تمام قبائل میں باہمی عداوت و خانہ جنگی کے باوجود حب وطن و حمایت آزادی کے ایسے طاقت ور جذبات پیدا کر دیئے تھے کہ شاہ شجاع کو اپنے انگریز حمایتیوں کے بھروسے پر زیادہ عرصے تک تختِ کابل پر متمکن رہنے کا موقعہ نہیں ملا اور تحریکِ آزادی کے قائد اعظم امیر دوست محمد خان کے ایک معرکہ میں فتح پانے کے بعد ہی اپنے آپ کو انگریزی وکیل وایجنٹ کے حوالے کر دینے اور کلکتہ میں لا کر رکھے جانے کے باوجود جہاں ان کا بڑا مشغلہ لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل کے ساتھ شطرنج کھیلنا تھا۔

ان کے نامور و شجیع فرزند اکبر خان نے افغانستان میں انگریزی فوج کو نہ صرف شکست دی بلکہ بالکل تہس نہس کر دیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی مسلمہ ہوسِ ملک گیری کے باوجود انگریزی حکومت کو اس امر پر مجبور کیا کہ وہ امیر دوست محمد خان کو کلکتہ سے کابل میں باقاعدہ مسندِ امارت پر بیٹھنے کے لئے واپس بھیجیں اور اُن سے عہد و پیمان کریں۔ اس کے بعد جب امیر دوست محمد خان کے پوتے امیر یعقوب خان نے اپنی کمزوری سے انگریزوں کو امور مملکت میں مداخلت کا موقعہ دیا۔ افغان ایک مرتبہ پھر حمایت آزادی کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اول جنگِ افغانستان کے بعض واقعات میجر کیوگناری انگریز ایجنٹ اور اُن کے رفقاء و عملہ کے قتل وغیرہ کی صورت میں پھر دہرائے گئے۔

اگرچہ انگریزی فوج نے لارڈ ابرٹس آف قندھار کی زیر قیادت اِس ناپسندیدہ کارروائی کا انتقام لیا اور غزنی کے شہر اور کابل کے مشہور قلعہ بالاحصار کو تباہ و

منہدم کر دیا۔ لیکن افغانستان پر مستقل قبضہ کرنے کی اس وقت بھی انگریزی حکومت کو ہمت نہیں ہوئی اور امیر یعقوب خان کو اپنی کمزوری اور اپنے ہم قوموں کے مقابلے میں غیروں کی پناہ ڈھونڈھنے کا خمیازہ اپنے تخت سے محرومی اور دہرہ دون کے مقام پر طویل نظر بندی کی صورت میں بھگتنا پڑا اور انگریزوں کے قومی خصائل میں بہادری و حبِّ وطن کی قدر دانی جس حد تک شامل ہے۔ اُس پر اِس واقعہ سے ایک روشنی پڑتی ہے کہ برٹش گورنمنٹ نے امیر یعقوب خان کے چھوٹے بھائی سردار ایوب خان مشہور فاتح میوند کے ساتھ باوجودیکہ وہ صرف ایک صوبہ (ہرات) کے گورنر تھے۔ اُن کے بڑے بھائی سے بہتر سلوک کیا۔ یعنی اُن کے ایران کی نظر بندی سے نکل آنے کے بعد اُن کو امیر یعقوب خان سے کئی گنا زیادہ وظیفہ بھی دیا گیا اور سرحد سے نسبتاً قریب لاہور میں کئی سو رفقاء و خدّام کے ساتھ مقیم ہونے کی اجازت دی گئی۔

افغانستان کی حکومت امیر دوست محمد خان کے دوسرے پوتے امیر عبدالرحمٰن خاںؒ مرحوم کو روسی ترکستان سے بلا کر سپرد کی گئی۔ جنہوں نے اپنی زبردست ڈپلومیسی سے انگریزوں اور روسیوں کے درمیان افغانستان کو بطور ایک "بفر اسٹیٹ" کے محفوظ رکھا اور فوجی قوت کو اُس وظیفہ کی مدد سے جو اُنہیں گورنمنٹ ہند سے ملتا تھا اور مضبوط کیا اور فوجی اسلحہ و سامان کے علاوہ بعض مصنوعات کے کارخانے بھی کابل میں قائم کئے۔ امیر عبدالرحمٰن خان مغفور گویا" افغانستانِ جدید" کے بانی تھے اور اُن کے اقبال مند و بیدار مغز جانشین .... اِس معاملہ فہم و دُور اندیش امیر کی قائم کردہ بنیادوں ہی پر دولتِ مستقلۂ افغانستان کی عظمت و قوت کا ایوان فلک فرسا تعمیر کر رہے ہیں اگر شاہ ابدالی مملکتِ افغانستان کی بنیاد نہ ڈالتا تو وہ ملک پہلے کی طرح برطانوی ہند و روسی ترکستان کے درمیان تقسیم ہو جاتا اور ہندوستان کو روسی حملے کا خطرہ کہیں زیادہ شدّت کے ساتھ ہر وقت لگا رہتا۔ جس کی روک تھام کی تدابیر میں اربوں روپے اور ہزارہا قیمتی جانوں کا نقصان ہوتا۔ لہٰذا شاہ ابدالی کے افغان سپاہیوں نے گو پانی پت کے میدان میں ہزارہا مرہٹوں کو قتل کیا مگر شاہ موصوف نے افغانستان میں ایک مستقل حکومت قائم کر کے ہندوستان کے شمال مغربی علاقوں کو ترکمانوں اور روسیوں کی پیہم تاخت و تاراج سے محفوظ کر دیا۔

ناردشنکر کا دہلی کو چھوڑ دینا | جنگ پانی پت کے نتیجے کی جب دہلی میں راجہ ناردشنکر کو

خبر پہنچی تو وہ بہت مضطرب ہوا اور چوں کہ دکن سے جلد کمک آنے کی اُسے کوئی امید نہیں رہی تھی اِس لئے وہ دار السلطنت کو چھوڑنے کی تیاریاں کرنے لگا۔ دہلی اس وقت مرہٹوں کی فوجی مہم کے لئے ایک مستقر کی حیثیت رکھتا تھا اور یہیں سے روپیہ و سامان رسد بھاؤ کے لشکر کو بھیجا جاتا تھا۔ اس وقت بھی غلہ و دیگر اشیاء کے وسیع ذخائر نارو شنکر کے پاس موجود تھے مگر جب اس کو معلوم ہوا کہ شاہ ابدالی نے دہلی کا رُخ کیا ہے تو وہ بالکل گھبرا گیا اور اگرچہ اپنی جمعیت سپاہ کے ساتھ وہ کچھ عرصے تک بہ آسانی شہر کی حفاظت کر سکتا تھا لیکن اس نے شاہ کی آمد سے قبل دہاں سے نکل جانے کو ترجیح دی۔

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ بھاؤ نے دہلی کو چھوڑنے سے قبل شاہزادہ جوان بخت عرف "جہان قدر" خلفِ اکبر شاہزادہ علی گوہر کو جنھوں نے بعد میں شاہ عالم ثانی کا لقب اختیار کیا اُن کے باپ کی نیابت میں تخت پر بٹھا دیا تھا اور شاہزادۂ موصوف اپنی دادی زینت محل زوجۂ شہنشاہ عالمگیر ثانی کی ہدایات پر عمل پیرا تھا جو ایک دانش مند و باہمت خاتون تھیں اور اپنے فرزند کے لئے تخت شہنشاہی کو محفوظ کرنا چاہتی تھیں۔ اور ایک طرف مرہٹوں کو گستاخ نہیں ہونے دینا چاہتی تھیں اور دوسری جانب شاہ ابدالی کے افغان سپاہیوں کی دست بُرد سے بھی دار السلطنت اور اُس کے باشندوں کو محفوظ رکھنا چاہتی تھیں۔ چنانچہ "مرأت آفتاب نما" میں لکھا ہے کہ "نواب زینت محل صاحبہ نے عنایت و مہربانی کی راہ سے اور حقوقِ بندگی قدیم پر نظر کرکے اگرچہ مرہٹوں سے کچھ حرکاتِ ناشائستہ بھی صادر ہوئی تھیں (یہ اشارہ ہے بھاؤ کے اسباب شہنشاہی و سامانِ مقابر پر دستِ تصرّف دراز کرنے کی طرف) اُن سے اغماض بَرت کر نارو شنکر کو شاہ ابدالی کی فوج کے پہنچنے کی آفت سے آگاہ فرمایا کہ مال و متاع اور نقدی میں سے جس قدر بھی ممکن ہو اپنے ساتھ لے کر وہاں سے ہٹ جائے۔

بہرحال بیگم صاحبہ کی حمایت کی بدولت وہ دار الخلافت سے نکل آیا مگر اوباشانِ شہر کے ہاتھوں اُس کا بہت سا مال تلف ہوا اور راؤ مذکور (نارو شنکر) نے روانگی کے وقت ۳ ½ لاکھ روپیہ نقد اور دکن کی اجناس ملازمانِ حضرت بیگم صاحبہ کی خدمت میں پیش کیں اور جو ذخائر کہ منتشر تھے اور جابجا رکھے ہوئے تھے ان کے اٹھانے کا بوجھ اضطرار اس کو وقت نہیں ملا۔ لہٰذا وہ بیگم صاحبہ کے ہاتھ آئے۔"

دیکھئے میدانِ پانی پت میں مرہٹوں نے اِس قدر زبردست شکست کھائی لیکن ان کا جو قائم مقام دہلی میں تھا اُس کو ولی عہد اور اُن کی دادی صاحبہ نے ایسے طریقے پر رخصت کیا جس طرح کوئی اپنے وفادار ملازم کی خطرے سے حفاظت کرتا ہے۔ نارو شنکر کے دہلی کو چھوڑ دینے سے مفرورینِ پانی پت کا کوئی ٹھکانہ باقی نہ رہا اور جو بدنصیب بھوکے پیاسے منزلیں طے کرتے وہاں پہنچے۔ انہیں جب دار السلطنت میں پناہ نہ مل سکی تو وہ سخت مایوس ہوئے اور دکن کی طویل و دشوار گذار راہ کا طے کرنا اُن کے لئے محال ہوگیا۔ چنانچہ سینکڑوں آدمی دہلی اور اُس کے گرد و نواح میں زندگی کے مصائب سے چھوٹ گئے اور ہزاروں آدمی دہلی سے متھرا پہنچکر علاقۂ بھرت پور میں داخل ہوئے اور سورج مل جاٹ کی مہربانی سے آذوقۂ حیات و زادِ راہ پاکر دکن چلے گئے۔

شاہ ابدالی کا داخلہ دار السلطنت میں

شاہ ابدالی پانی پت کی لڑائی جیتنے کے آٹھویں روز دار السلطنت دہلی میں داخل ہوئے۔ نواب زینت محل صاحبہ اور شاہزادۂ ولی عہد بہادر نے ان کا استقبال کرکے شہر کے شاہی محلات میں اُن اتارا اور ایک لاکھ روپیہ بطریقِ ضیافت شاہ کی خدمت میں اور پچاس ہزار اشرف الوزراء کی خدمت میں پیش کیا۔ کچھ عرصے بعد امیر الامراء عماد الملک نے جو سورج مل کے قلعے میں مقیم تھا۔ اپنے معتمد علیہ دیوان ناگرمل کو شاہ ابدالی کے پاس بھیج کر درخواست کی کہ اگر شہنشاہ دہلی کی وزارتِ عظمیٰ کا منصب شاہ اس کو دلاویں تو وہ ستّر لاکھ روپے کا زر و جواہر نذر کرنے کو تیار ہے۔ شاہ نے اِس کو قبول کیا اور اپنے معتمد علیہ یعقوب علی خان کو جس نے بھاؤ کے حملے سے ابتداء میں قلعہ دہلی کی حفاظت کی تھی دیوان ناگرمل کے ساتھ وصول نذرانہ کی غرض سے بھیجنا چاہا۔ مگر نواب زینت محل صاحبہ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے عماد الملک کے خلاف ایک دفترِ شکایت شاہ ابدالی کے سامنے کھولا اور احمد شاہ اور عالمگیر ثانی کے ساتھ اُس کی گستاخیاں اور مظالم یاد دلاکر کہا کہ ہم اُس بانیٔ فساد کو ہرگز وزیر نہیں بنا سکتے۔ شاہ نے بیگم صاحبہ و شاہزادۂ ولی عہد کو قدرے اطمینان دلایا مگر یعقوب علی خان کا عماد الملک کے پاس بھیجنا ملتوی نہیں کیا۔

عماد الملک نے ایک عرصے تک یعقوب علی خان کو لیت و لعل میں رکھا۔ آخر میں ظاہر

ہوگیا کہ عماد الملک خود مفلوک الحال اور دوسروں سے اعانت کا امیدوار ہے۔
اِس اثنا میں شاہ ابدالی اپنی سپاہ کے تقاضے سے مجبور ہوگئے اور اپنی ایسی عظیم الشان فتح سے کوئی اور فائدہ اٹھائے بغیر اپنے ملک کو واپس چلے گئے۔ البتہ پنجاب و سندھ کے دونوں صوبے معہ کشمیر اسوقت سے دہلی کے شہنشاہی اقتدار سے نکل گئے۔

جنگ پانی پت کے اثرات

جملہ مؤرخ اِس امر پر متفق الرائے ہیں کہ پانی پت کی شکستِ عظیم نے مرہٹوں کی قوتِ اقتدار پر ایک ایسی ضرب لگائی جس سے وہ پھر پنپ نہیں سکی اور شمالی ہند میں اُن کو مستقل اقتدار پیدا کرنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ نارو شنکر جو چھ سات ہزار مرہٹہ سواروں اور پیادوں کی جمعیت کے ساتھ دہلی پر قابض اور امور سلطنت پر حاوی تھا۔ جنگ پانی پت کے نتیجے کو سنکر کچھ ایسا خوف زدہ ہوا کہ دہلی کو چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کی اِس کارروائی سے مرہٹوں کو مزید نقصان پہنچا۔ کیوں کہ جنگِ پانی پت کے بہت سے مرہٹہ مفرورین نے دہلی کا رُخ کیا۔ اگر نارو شنکر وہاں موجود رہتا تو ان مفرورین کو سہارا ملتا اور نارو شنکر کے پاس جو مرہٹہ فوج اس وقت تھی اس کی قوت اِن مفرورین کی شمولیت سے بڑھ جاتی اور کم ازکم وہ دار السلطنت پر بہ آسانی اُس وقت تک قابض رہ سکتے تھے کہ پیشوا کی دکن سے بھیجی ہوئی کمک آجاتی۔ نارو شنکر کے دہلی کو چھوڑ دینے سے ان مفرورین کے پناہ کی کوئی جگہ باقی نہیں رہی اور ہزاروں آدمی دہلی سے مایوس واپس ہونے کے بعد راجستھان میں سر ٹکراتے پھرے۔

دہلی سے لے کر متھرا تک پانی پت کے فلاکت زدہ مرہٹہ مفرورین مہینوں پھرتے نظر آئے اور سورج مل جاٹ نے بعض روایات کے بموجب اپنا دس لاکھ روپیہ پانی پت کے مفرورین کو زادِ راہ دے کر دکن کی طرف روانہ کرنے میں خرچ کیا جس پر مرہٹے ہمیشہ اس کے احسان مند رہے۔ مگر اس زمانے کی ملکی سیاسیات کا عجیب رنگ تھا اور مرہٹوں نے لوٹ مار کو اپنا ایک مستقل پیشہ قرار دے لیا تھا۔ چناں چہ ملہار راؤ ہولکر اگرچہ پانی پت سے بھاگ کر خود متھرا و بھرت پور پہنچا اور سورج مل جاٹ کا مہمان رہا مگر تھوڑے عرصے بعد ہی اپنے محسن کے بیٹے اور جانشین جواہر مل کے قلعوں پر تاخت کرنے میں کچھ تامّل نہیں ہوا۔ چناں چہ "خزانۂ عامرہ" کی روایت کے بموجب نواح اکبر آباد (آگرہ) میں دھول پور

کے قریب عید کے روز ہولکر کا سولہ ہزار سواروں کی جمعیت کے ساتھ جواہر مل کی فوج سے مقابلہ ہوا اور تھوڑی سی لڑائی کے بعد ہولکر کی فوج روبفرار لائی۔ جواہر مل کی فوج قتل و غارت کرتی ہوئی اُس کے تعاقب میں چلی اور مفرورین کے ہاتھیوں گھوڑوں اور سازو سامان کو چھین کر ایک بڑی تعداد کو انھوں نے تلوار کے گھاٹ اُتارا۔ ہولکر کے آدمیوں نے قلعۂ دھول پور میں پناہ لی اور جواہر مل کی فوج والوں نے قلعۂ مذکور کا محاصرہ کیا۔ اور دس روز میں محصورین پر فتح پاکر پانچ سرداران فیل نشین کو دس ہزار آدمیوں سمیت قید کرلیا۔

ملہار راؤ ہولکر نے جب یہ خبر ہوش رُبا سنی تو اس کی ہمت ٹوٹ گئی اور وہ اُس علاقے سے بھاگا اور بقرعید سے ایک روز قبل جھانسی میں انتقال کرگیا۔ پیشوا بالاجی باجی راؤ کو پانی پت کی خبریں برابر ملتی تھیں اور آخری ایام میں بسواس راؤ نے اُس کو ایک خط اِس مضمون کا لکھا تھا کہ یہاں ہم لوگوں پر وقت تنگ ہے اور اگرچہ میرے مانند لڑکے آپ کو مل جائیں گے مگر بھاؤ کا سا دلاور بھائی نہیں ملے گا۔ لہٰذا آپ کو اُن کی امداد ضرور کرنی چاہیئے۔ اِن خبروں سے پیشوا پریشان ہوا اور پہلے وہ پونا سے احمد نگر آیا اور پھر دریائے گوداوری کے کناروں تک پہنچا۔ یہاں پہنچ کر مزید تشویش انگیز اخبار اس کے گوش زد ہوئے۔ اسی وقت میں جانوجی بھونسلے دس ہزار آدمیوں کی جمعیت کے ساتھ اس سے آکر ملا اور پیشوا کی فوج ہندوستان کی طرف بڑھی اور تین ہفتے بعد جب وہ نربدا کو عبور کررہا تھا تو ایک قاصد اس کے پاس پہنچا جس کو ساہوکاروں نے بھیجا تھا اور اُس نے نو دن میں پانی پت سے اورنگ آباد پہنچ کر جہاں پیشوا پہلے مقیم تھا چٹھی پیشوا کے لشکر میں پہنچا دینے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ قاصد پیشوا کے روبرو حاضر کیا گیا تو اُس نے اپنی چٹھی پیش کی۔ پیشوا نے اس کو اپنے ہاتھ سے کھولا تو یہ حال پڑھا کہ :-

"دو موتی گھُل گئے۔ ۲۷ اشرفیاں ضائع ہوگئیں اور چاندی اور تانبہ جس قدر ضائع ہوا اُس کی کوئی میزان نہیں لگائی جاسکتی۔"

اس زمانے میں مہاجن اور ساہوکار ملک کے واقعات پر نظر رکھتے تھے اور اپنی کاروباری اغراض کے لئے اہم واقعات کی جلد سے جلد اپنے گماشتوں اور بیوپاریوں کو اطلاع دیتے تھے اور اپنی چٹھیوں میں اکثر رموزِ عبارت استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ مذکورہ بالا چٹھی میں بھی

بظاہر مالِ تجارت کا ذکر تھا اور کوئی ناواقف شخص اُس سے کوئی معنی پیدا نہیں کر سکتا تھا مگر پیشوا نے اُس کا مطلب سمجھ لیا اور اپنے نامور بھائی سداشیو راؤ بھاؤ اور عزیز فرزند بسواس راؤ اور دیگر سرداروں اور فوج کی تباہی اُس کو معلوم ہو گئی۔ اس کے بعد ہی فوج کے کچھ لوگ بھی پہنچے اور انہوں نے اِس خبر کی تصدیق کی۔

ابتدائی مفرورین میں بابوراؤ پنڈت وکیل پیشوا کا جس کی جان جھنکوجی سیندھیا کے ساتھ ضائع ہوئی۔ بھتیجا بالاجی جنارد ھن تھا جو بعد میں نانا فرنویس کے لقب سے مرہٹہ حکومت کے ایک ممتاز افسر کی حیثیت سے تاریخ میں مشہور ہوا اس کی ماں ان افغانوں کے ہاتھ پڑ گئی۔ مگر بیوی بچ رہی اور بھاؤ اور بسواس راؤ کی بیواؤں کی طرح دکن پہنچ گئی۔

مہاراشٹر میں تہلکہ پانی پت کی شکست عظیم کا حال جب لوگوں کو معلوم ہوا تو سارے مہاراشٹر میں تہلکہ پڑ گیا۔ کیوں کہ کوئی ممتاز گھرانا ایسا نہیں تھا جس کے کچھ لوگ پانی پت کے میدان کارزار میں ضائع نہ ہوئے ہوں۔ اکثر بڑے گھرانوں کی عورتیں جو اپنے مردوں کے ساتھ گئی ہوئی تھیں ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئیں اور نربدا سے لے کر دریائے کرشنا تک پورے علاقے میں صفِ ماتم بچھ گئی۔

پیشوا کے قلب پر اِس واقعہ سے اس قدر صدمہ پہنچا کہ وہ اُسی وقت سے اُداس اور مضمحل ہو گیا اور اپنا ہندوستان کا عزم فسخ کر کے آہستہ آہستہ پُونا واپس چلا گیا جہاں چند ماہ کا زمانہ اُس نے بڑی اُداسی کے ساتھ گذارا۔ اس کے قویٰ میں اضمحلال پیدا ہو گیا اور آخر واقعۂ پانی پت کے چھ ماہ کے اندر وہ اپنے مستقر میں پاربتی کے مندر کے اندر انتقال کر گیا۔ جہاں وہ اپنی زندگی کے آخری ایّام گیان دھیان میں گذارتا تھا۔

مرہٹوں کا شیرازۂ قوّت بکھر گیا واقعۂ پانی پت کے وقت سے مرہٹوں کا عروج ختم ہونے لگا اور اُن کی قوت کا شیرازہ بکھر گیا گو جسونت راؤ ہولکر اور مادھوجی و دولت راؤ سیندھیا نے اِس کے بعد شمالی ہند کے علاقوں میں ترکتازی کی۔ اور اول الذکر شمال میں وسط پنجاب اور مشرق میں بنگال و

بہار تک پہنچا اور سیندھیا نے دارالسلطنت دہلی کے قریب کے علاقوں پر متصرف ہو کر ذاتِ شہنشاہی پر اپنا اثر قائم کیا اور پیشوا کے لئے "وکیل مطلق" کے موروثی عہدے کا جو سلطنت میں سب سے بڑا مقتدر منصب تھا اور اپنے لئے دیوان اور وزارت کا فرمان شاہِ عالم سے حاصل کیا۔ مگر یہ فی الحقیقت سیندھیا کی ذاتی فتوحات تھیں اور سارے مرہٹہ مورّخ اس پر متفق ہیں کہ مرہٹہ حکومت کی مرکزی قوت جو پیشوا کے ہاتھ میں تھی واقعۂ پانی پت کے بعد بڑے درجہ تک زائل ہو گئی تھی اور ماتحت سرداروں پر اس کا کوئی اثر باقی نہ رہا تھا۔ نانا فرنویس کا سا ہوشیار مدبّر اپنی حکمتِ عملی سے ایک عرصے تک پیشوا کی قوّت کو سنبھالے رہا مگر آخر میں وہ بھی مجبور ہو گیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی روز افزوں قوت نے اپنی حکمت عملی سے ان کو فرداً فرداً آہستہ آہستہ مغلوب کر لیا اور باجی راؤ خلفِ رگھوبا آخری پیشوا بھی سیندھیا۔ ہولکر۔ گائیکواڑ۔ پورندھر۔ بھونسلے وغیرہ سربرآوردہ ارکانِ حکومت کے انگریزوں سے مل جانے پر ہر طرف سے مجبور و لاچار ہو کر سر جان مالکم مشہور اینگلو انڈین افسر سے رجوع لایا جس سے اس کی پُرانی دوستی تھی۔ چنانچہ سر جان مالکم نے دوستی کو نباہا اور باوجودیکہ بعد میں اُس پر اعلیٰ حکامِ کمپنی کی طرف سے سخت اعتراضات ہوئے مگر اُس نے جو پیشوا سے وعدے کئے تھے اُن کو پورا کرایا اور آٹھ لاکھ روپے سالانہ کا وظیفہ خزانۂ کمپنی سے اُس کو دلایا جو کانپور میں وفات پانے تک اُس کو ملتا رہا۔

پیشوا کے بڑے بھائی امرت راؤ کو بھی جسے اُس کی ولادت سے قبل رگھوبا نے متبنّیٰ کر کے مثل اپنی اولاد کے پرورش کیا تھا اور تکوجی ہولکر نے پونا پر قابض ہو کر باجی راؤ کے بجائے اُس کو پیشوا بنا دیا تھا آٹھ لاکھ کا وظیفہ دیا جا چکا تھا۔ اس نے بنارس میں قیام اختیار کیا تھا۔ باجی راؤ کی جس وقت وفات ہوئی اُس وقت لارڈ ڈلہوزی برٹش انڈیا کے گورنر جنرل تھے جو اپنی ہندوستانی ریاستوں کو غصب کرنے کی منحوس پالیسی پر عمل کر رہے تھے لارڈ موصوف کی گورنمنٹ نے باجی راؤ کے پسر متبنّیٰ ڈھونڈو پنت عرف "نانا صاحب" کا اُس کے باپ کے وظیفہ میں کوئی حق تسلیم نہیں کیا۔ حالاں کہ لڑکوں کا متبنّیٰ کرنا ہندوؤں کا قدیم دستور ہے اور ان کے مذہبی احکام کی رُو سے پسرِ متبنّیٰ تمام صورتوں میں صُلبی فرزند کی برابر و مانند ہوتا ہے اور اپنے والدین کی مراسم

تعزیت ادا کرتا ہے۔ چنانچہ یہ حق بعد میں انگریزی حکومت نے تمام ریاستوں کے لئے تسلیم کیا اور اُس پر آج تک برابر عمل درآمد ہو رہا ہے۔

"نانا صاحب" کو اپنے باپ کا وظیفہ نہ ملنے پر سخت مایوسی ہوئی اور سارے ہندوستان میں عام طور پر انگریزی حکومت کا یہ فعل بد دیانتی اور معاہدے کی خلاف ورزی سے تعبیر کیا گیا۔ نانا صاحب اِس کانٹے کو اپنے دل میں لئے رہا اور تھوڑے عرصہ بعد ہی جب پُوربیہ سپاہ نے بظاہر چربی ملے ہوئے کارتوسوں کے باعث مگر فی الحقیقت دوسرے بہت گہرے اسباب کی بنا پر ایسٹ انڈیا کمپنی سے سرکشی اختیار کی تو نانا صاحب کو اِس امر کا جس کو وہ اپنے نزدیک بدعہدی سے تعبیر کرتا تھا بدلہ لینے کا موقعہ مل گیا۔ اور اس نے اپنے علاقے کی سرکش فوج کی سرپرستی اختیار کرکے اپنے آبائی مرتبے کو دوبارہ حاصل کرنا چاہا۔ جس کے سلسلے میں وہ ہولناک و درد انگیز واقعہ پیش آیا جو "خون ریزیِ کان پور" کے لقب سے مشہور ہے۔

تھوڑے عرصے کے لئے "نانا صاحب" کا اقتدار کان پور اور آس پاس کے علاقوں پر قائم ہوگیا اور اُس نے بُندیلکھنڈ اور وسطِ ہند کے سرکشوں سے اتحادِ عمل کرکے دکن تک پہنچنا چاہا مگر اپنے رفیقوں کی خود غرضی و ناتجربہ کاری و عمّال کمپنی کی ہوشیاری اور ہندوستانی والیانِ ریاست کی غدّاری کے باعث نانا صاحب کو بھی فتنۂ ۱۸۵۷ء کے دیگر لیڈروں کی طرح آخر میں ناکام رہنا اور اپنی جان چھپا کر بھاگنا پڑا۔ برسوں تک اُس کی تلاش جاری رہی اور کئی بے گناہ اشخاص اس کے دھوکے میں گرفتار کئے گئے۔ آخر میں معلوم ہوا کہ علاقۂ نیپال میں کسی مقام پر دامنِ کوہ نے اُس کا پردہ ڈھانک لیا۔

مرہٹہ اقتدار کی یادگار چند ریاستیں بڑودہ۔ گوالیار۔ اندور۔ دیواس۔ دتیا وغیرہ باقی ہیں اور کولھاپور کے مہاراجگان براہِ راست سیواجی کی نسل میں ہیں۔ ستارہ میں سیواجی کے خاندان کی بڑی شاخ حکمراں تھی جس کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی افواج نے عملی نظر بندی کی حالت سے جو پیشواؤں نے اُس پر عائد کر رکھی تھی چھڑایا۔ مگر بعد میں کمپنی مذکور نے ایک معمولی سے بہانہ پر ستارہ کے راج کو خود ضبط کرلیا۔ آخری راجۂ ستارہ کا ایک وفادار ملازم باوجود عُسرت اور طرح طرح کی مشکلات کے اپنے آقا کے

حقوق کی بحالی کے لئے کامل بتیس سال تک انگلستان میں مسلسل جدوجہد کرتا رہا اور اگرچہ اُسے کامیابی حاصل نہیں ہوئی مگر وفاداری اور استقلال کی ایک زبردست مثال اُسنے تاریخ کے صفحات پر ثبت کردی اور مسائلِ ہند پر انگلستان میں ایجی ٹیشن کرنے کی راہ بھی اپنے ہم وطنوں کو دکھائی۔

جنگ سوم پانی پت سے مغلیہ اقتدارِ شہنشاہی کو نقصان پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کے شکست پانے سے اگرچہ بظاہر مسلمانوں کی زوال پذیر قوت شمالی ہند میں کچھ عرصے کے لئے پھر بحال ہوگئی مگر غور کیا جائے تو اِس جنگ کے نتیجے سے بالواسطہ مغلیہ شہنشاہی اقتدار کو بھی سخت نقصان پہنچا۔ کیوں کہ قدیم اُمرائے سلطنت میں بعض مقتدر اشخاص نے شاہ ابدالی کے ساتھ جو ایک بیرونی حملہ آور سے زیادہ کوئی حیثیت نہ رکھتا تھا وفاداری برتنی ضروری سمجھی اور اسی نسبت سے دہلی کے تختِ شہنشاہی کے ساتھ اُن کی وفاداری گھٹتی گئی اور وہ مطلق العنان و خودرائے ہوتے گئے۔ یہ خرابی تو عہد محمد شاہ سے شروع ہوگئی تھی کہ ایک ہی عہدہ کے سلطنت اور صوبیداری و فوج داری کے دو دو تین تین عہدیدار دربار و ملک میں موجود ہوتے تھے اور اُن کے باہمی جوڑ توڑ اور کشمکش سے مرکزی حکومت کے اقتدار کو ضعف پہنچتا تھا۔

سلطنت کے دُور افتادہ صوبے مثلاً بنگال۔ بہار۔ اوڑیسہ۔ مالوہ و گجرات علاوہ پورے دکن کے عملی طور پر شہنشاہ کے ہاتھ سے نکل چکے تھے اور اپنی اندرونی کشمکش میں مبتلا تھے اب مرکزی حکومت کے قریب کے علاقوں پر بھی ایسے لوگوں کا قبضہ قائم ہوگیا جو اپنے کو شہنشاہِ دہلی کی ماتحتی سے قریباً آزاد سمجھتے تھے اور شاہ ابدالی سے اپنے علاقوں کی سند حاصل کر چکے تھے۔ افغان مرہٹوں سے کچھ کم لُوٹ کے حریص نہ تھے۔ اور اُن سے زیادہ ظالم و خون خوار تھے اور اپنی جنگی فتوحات کے زعم میں دہلی کی شہنشاہی کی اُن کے دلوں میں کوئی وقعت نہیں تھی۔ برخلاف ازیں مرہٹے مغلیہ شہنشاہی اقتدار کو برقرار رکھنا چاہتے تھے اور اُس کی آڑ میں اپنی حریصانہ اغراض پُوری کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ پونا کے باشندوں کو وہ جشنِ تہنیت عرصے تک یاد رہا جو سوم جنگ پانی پت کے قریباً تہائی صدی بعد اس وقت منایا گیا تھا جب کہ مادھوجی سیندھیا مغلیہ سلطنت کے سب سے

بڑے عہدے "وکالت مطلق" کا موروثی فرمان شاہ عالم ثانی سے پیشوا کے واسطے لے کر گیا تھا اور جس کے ساتھ ہی شہنشاہ موصوف نے سارے ہندوستان میں گاؤکشی موقوف کرنے کا فرمان بھی صادر کیا تھا اور خود سیندھیا کو وزیرِ اعظم کا عہدہ اور "فرزندِ عالی جاہ" کا خطاب دیا تھا۔

نانا فرنویس کی ایک اہم تحریر

اس واقعہ سے تیرہ چودہ سال پہلے جب رگھناتھ راؤ کی ہوسِ اقتدار نے اس کو انگریزوں کا آلۂ کار بنا دیا تھا تو اس وقت بھی مرہٹہ ارکانِ دولت اپنی ریاست کے قیام کے لئے دہلی کے تخت شہنشاہی کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ مرہٹہ حکومت کے سب سے بڑے کارکن نانا فرنویس نے رگھناتھ راؤ کی پیدا کردہ لڑائیوں کے آخری زمانے میں جب حکام ایسٹ انڈیا کمپنی مادھوراؤ سیندھیا سے خفیہ مفاہمت کرنے میں ساعی تھے ایک چٹھی سیندھیا کو لکھی تھی جو اس وقت تک بجنسہٖ محفوظ ہے۔ اس میں مرہٹوں کے اُس مدبرِ اعظم نے مادھوراؤ سیندھیا کو جتایا ہے کہ :-

"ہمیں ہرگز کمپنی کے علاقوں کو فتح کرنے کی خواہش نہیں تھی اور ہم نے کبھی اُن کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا، بلکہ خود انھوں نے ہمارے خلاف اعلانِ جنگ کیا اور پورے چھ سال تک ہم کو بھاری نقصانات پہنچاتے رہے۔ انھوں نے ہماری ریاست کے دو ارکان گائیکواڑ اور بھونسلے کو اپنی طرف توڑ کر ہماری حکومت کے ڈھانچے کو کمزور کرنے کی کوشش کی۔ اگر ہم ان کو ان کی مَن مانی کارروائیاں کرنے دیں گے تو ایک آفت و مصیبت اپنے اوپر لیں گے اور اپنے راج کو اُن کا ماتحت بنائیں گے۔ ہم ہرگز نہ اُن سے کسی رعایت کے خواستگار رہوں گے نہ خود کوئی رعایت کریں گے بلکہ نہایت ہوشیاری و احتیاط کے ساتھ اُن سے عہدنامہ کریں گے ہم کو نہ صرف اپنے نقصانات کی تلافی پر مصر ہونا چاہیئے بلکہ بڑے سیواجی کی فتوحات کرناٹک میں سے جن حصّوں پر اس وقت انگریز قابض ہیں اُن کو واپس لینے کی بھی کوشش کرنی چاہیئے۔ ہم اپنی اغراض کو انگریزوں کے ہاتھوں قربان کئے بغیر اپنے مقاصد کو دہلی میں ضرور حاصل کرلیں گے۔ اگر مرہٹے باہم متحد رہیں اور قوت کیساتھ کام کریں تو انگریز اپنا اقتدار کبھی دہلی میں قائم نہیں کر سکتے۔"

یہ خط غالباً اوائل ۱۷۸۲ء میں لکھا گیا تھا۔ بیچارے نانا فرنویس کو کیا خبر تھی کہ ہندوستانی رئیسوں کی یہ غفلت و عیش پسندی اور مرہٹہ سرداروں کی تنگ خیالی و خود غرضی کی بدولت انگریزوں کی قوت اس قدر بڑھ جائے گی کہ بیس سال کے بعد وہ دار السلطنتِ دہلی پر بھی متصرف ہو جائیں گے اور اندھا شہنشاہ اپنے نمک خوار ملازمین کی سازشوں اور شرارتوں سے تنگ آکر ایسٹ انڈیا کمپنی کی تائید و حمایت کو غنیمت سمجھنے لگے گا۔ مگر نانا فرنویس کی امیدیں مرہٹوں کے متحد رہنے اور قوت کے ساتھ کام کرنے پر مبنی تھیں اور یہ دونوں باتیں پوری نہیں ہو سکیں۔

حوصلہ مند مگر ناعاقبت اندیش رگھوبا نے اپنے ہم قوموں کو دبانے کے لئے اغیار سے مدد لے کر مرہٹوں کے اقتدار کی بنیادوں میں سرنگیں لگائیں اور اُس کے بیٹے نے حکومت کے شوق میں اُس دانش مند مدبر کو ناراض و دل شکستہ کر دیا جو اِن سُرنگوں کو پھٹنے سے روکے ہوئے تھا۔ جن لوگوں نے اِس کام میں اس کو مدد دی انھوں نے اپنی اغراض پوری کرنی چاہیں اور دوسری طرف امیر تیمور کے آخری جانشین اگرچہ نیک دل و رعایا پرور مگر انتہا درجہ کے کاہل و سادہ لوح تھے۔ جو خود اغراض اشخاص کے ہاتھوں میں کھیلتے رہے۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پُونا میں "وکیل مطلق" (پیشوا) کی مسند خالی ہونے کے چالیس برس کے اندر دہلی میں تختِ شہنشاہی بھی خالی ہو گیا ؎

گیا حُسن خوبانِ دل خواہ کا ہمیشہ رہے نام اللہ کا

پانی پت کی آخری خونیں غذا

انگریزی عملداری کے قیام کے سلسلے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی افواج کی جو گوروں سے زیادہ ہندوستانی سپاہیوں پر مشتمل تھیں ہندوستان کے رئیسوں سے جو لڑائیاں ہوئیں ان میں پانی پت کے خون آشام میدان کو اُس کی مرغوب خونیں غذا نہیں ملی۔ البتہ سکھوں کی لڑائیوں کے سلسلے میں انگریزی فوجیں اس میدان کے مختلف حصّوں سے گذرتی رہیں اور کرنال میں ایک عرصہ تک فوج کی مستقل چھاؤنی بھی رہی جس کی یادگار اس وقت تک "کرنال کے بوٹوں" کی شہرت سے قائم رہے۔

فتنۂ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے جب دہلی کو دوبارہ فتح کیا تو اِس خون آشام میدان کے ایک سرے پر "باؤلی کی سرائے" میں انگریزی فوج کی ایک چھوٹی سی لڑائی

"باغیوں" سے ہوئی اور دہلی سے نکل کر بھاگنے والوں کو علاقۂ ہٰذا کے دیہاتیوں نے لوٹا کھسوٹا اور قتل بھی کیا۔ اب قریباً ستر سال سے وہ علاقہ انگریزی حکومت کی بدولت مسلسل امن وامان کی برکات سے بہرہ ور رہا۔ جنھوں نے اہلِ ملک کے قوےٰ کو مضمحل کر دیا۔

اور جن گھرانوں کو تہائی صدی قبل تک اپنی دلیری وشجاعت اور فنونِ سپہ گری کی مہارت پر ناز تھا اُن کی موجودہ نسلیں استعمالِ اسلحہ تو درکنار جنگی اصطلاحات کو بھی فراموش کر چکی ہیں اور قلم کو تلوار سے زیادہ طاقتور سمجھتی ہیں جس کی ایک جنبش اُن کو اُن کی اُس آبائی وراثت سے محروم کر دیتی ہے جس کو اُن کے اسلاف نے اپنا خون بہا کر حاصل کیا تھا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار!

پانی پت کے خونین میدان کی لڑائیوں کے متعلق جدول سنین

(۱) مہابھارت (قدیم ہندوستان کی سب سے بڑی جنگ کوروؤں اور پانڈوؤں میں)۔	میدان کوروکشیتر پر	کئی ہزار سال قبل ولادت حضرت عیسیٰ
(۲) سلوکس یونانی جرنیل کی آمد۔	دوآبہ میں	..
(۳) رضیہ سلطانہ کی لڑائی امرائے دہلی سے	..	۱۲۳۹ء
(۴) نصرت خان بن فیروز شاہ تغلق اور شاہ محمود تغلق کی باہمی معرکہ آرائیاں	پانی پت وجھجھر وغیرہ	۱۳۹۵-۱۳۹۷ء
(۵) امیر تیمور صاحبقران کی پیش قدمی	دہلی پر	۱۳۹۸ء
(۶) "اول جنگ پانی پت" (مابین بابر وسلطان ابراہیم لودی)	میدان پانی پت پر	۱۵۲۶ء
(۷) "دوم جنگ پانی پت" (مابین اکبر اعظم وہیمو بقال)	"	۱۵۵۶ء
(۸) بندا بیراگی کے ماتحت سکھوں کی تاخت	سرہند پر	"
(۹) مغلیہ افسر سلطان قلی خان کے ہاتھوں سکھوں کی تادیب	پانی پت وسرہند پر	"
(۱۰) نادر شاہ کی چڑھائی اور فوج محمد شاہ سے لڑائی	میدان کرنال پر	۱۷۳۵ء
(۱۱) احمد شاہ ابدالی کی چڑھائی اور محمد شاہ سے لڑائی (مغل شہنشاہی کی آخری شاندار فتح)	سرہند پر	۱۷۴۸ء
(۱۲) عماد الملک وزیر کے بلانے سے مرہٹوں کی دار السلطنت پر آمد	قریب دہلی	۱۷۵۳ء
(۱۳) مرہٹوں کی سورج مل جاٹ پر چڑھائی	بھرت پور پر	"

(۱۴) مرہٹوں کی دارالسلطنت پر نجیب الدولہ کے خلاف یورش	دہلی پر	سنہ ۱۷۵۸ء
(۱۵) مرہٹوں کی یورش پنجاب پر پیش قدمی کے سلسلے میں	سرہند پر	سنہ ۱۷۵۸ء
(۱۶) احمد شاہ ابدالی کا سرہند کو مرہٹوں سے واپس لینا	″	سنہ ۱۷۶۰ء
(۱۷) شاہ ابدالی کا دتّا سیندھیا کی فوج کو تباہ کرنا	براؤں گھاٹ قریب دہلی	سنہ ۱۷۶۱ء
(۱۸) بھاؤ کی روانگی مہم ابدالی پر	پٹدور علاقہ اورنگ آباد دکن	۱۴ مارچ سنہ ۱۷۶۰ء
(۱۹) بھاؤ کا برہان پور پہنچنا	برہان پور	۴ اپریل سنہ ۱۷۶۰ء
(۲۰) بھاؤ کا دریائے نربدا پر پہنچنا	ہنڈیا پر	۱۰ اپریل سنہ ۱۷۶۰ء
(۲۱) بھاؤ کا داخلہ وسط ہند راجپوتانہ و بندیلکھنڈ میں	سیہور۔ بھوپال سرونج۔ اورچھا	۲۸ اپریل سنہ ۱۷۶۰ء
(۲۲) اہیروں کی سرکشی	مقام آرن پر	۱۴ مئی سنہ ۱۷۶۰ء
(۲۳) بھاؤ کا دریائے چمبل پر پہنچنا	..	۴ جون سنہ ۱۷۶۰ء
(۲۴) جنکوجی سیندھیا اور ملہار راؤ ہولکر کا معہ افواج بھاؤ کے لشکر سے آملنا	مکند تیرتھ پر	۶ جولائی سنہ ۱۷۶۰ء
(۲۵) بھاؤ کے لشکر کا جمنا پر پہنچنا	متھرا پر	۱۶ جولائی سنہ ۱۷۶۰ء
(۲۶) بھاؤ کے لشکر کا دارالسلطنت کے سامنے پہنچنا	دہلی	۳۰ جولائی سنہ ۱۷۶۰ء
(۲۷) دارالسلطنت میں بھاؤ کا داخلہ۔	″	یکم اگست سنہ ۱۷۶۰ء
(۲۸) بھاؤ کا شاہزادہ جواں بخت ولی عہد کو نیابتہً تختِ شہنشاہی پر بٹھانا۔	″	۱۱ اکتوبر سنہ ۱۷۶۰ء
(۲۹) بھاؤ کا کنجپورہ کو چھین لینا	کنجپورہ ضلع کرنال	۱۵ اکتوبر سنہ ۱۷۶۰ء
(۳۰) شاہ ابدالی کا جمنا کو عبور کرنا	باغپت ضلع میرٹھ پر	۲۵ اکتوبر سنہ ۱۷۶۰ء
(۳۱) بھاؤ کا کنجپورہ سے کوچ	گنور ضلع کرنال پر	۲۸ اکتوبر سنہ ۱۷۶۰ء
(۳۲) بھاؤ کی گنور سے آمد	پانی پت پر	یکم نومبر سنہ ۱۷۶۰ء
(۳۳) مرہٹوں کی شاہ ابدالی کے لشکر سے مڈبھیڑ۔	″	۲ نومبر سنہ ۱۷۶۰ء
(۳۴) جنکوجی سیندھیا کا نجیب الدولہ پر حملہ	″	۲۳ نومبر سنہ ۱۷۶۰ء

(۳۵) مرہٹوں اور افغانوں کی دوسری لڑائی	پانی پت پر	۷ر دسمبر ۱۷۶۰ء
(۳۶) مرہٹوں اور افغانوں کی تیسری لڑائی	"	۲۲ر دسمبر ۱۷۶۰ء
(۳۷) معرکۂ عظیم مابین لشکران مرہٹہ و افغان	"	۱۴ر جنوری ۱۷۶۱ء
(۳۸) نارو شنکر کا دارالسلطنت کو چھوڑ دینا	دہلی پر	۱۹ر جنوری ۱۷۶۱ء
(۳۹) شاہ ابدالی کا داخلہ دارالسلطنت میں	"	۲۰ر جنوری ۱۷۶۱ء
(۴۰) شاہ ابدالی عازم افغانستان	"	۲۲ر مارچ ۱۷۶۱ء

منقول از "زمانہ" کانپور بابتہ مارچ و اپریل ۱۹۲۹ء
ایڈیٹر منشی دیا نرائن نگم آنجہانی

گویا (جہان آبادی)

(از جناب ڈاکٹر عبدالغفور صاحب بسمل)
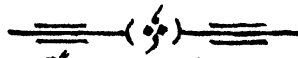
جناب سید ضامن حسین نقوی گویاؔ کے اجداد تقریباً تین سو سال قصبہ جہان آباد ضلع پیلی بھیت میں آباد رہے۔ آپ جنوری ۱۸۹۲ء میں سٹ پورہ ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے جہاں آپ کے والد سید مشرف حسین پولس آفیسر تھے۔ شاعری کا مذاق طبیعت میں خلقی اور فطری ہے۔ ابتدائے شباب سے شعر کہنے لگے۔ کئی سال تک ہندوستان کے مشہور نکتہ سنج شاعر حافظ پیلی بھیتی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں خداداد ذہانت وطباعی سے ایسا ملکہ پیدا ہوگیا کہ اپنے تمام معصروں سے بازی لے گئے۔ گویاؔ کی پہلی تصنیف "فغانِ صبح ومسا" ہے جو کہ ۱۳۳۸ھ (یا ۱۹۱۹ء) میں پایہ تکمیل کو پہنچی جناب حافظ پیلی بھیتی نے قطعہ تاریخ لکھا جس میں گویاؔ کے کردار اور نقش ونگار پر نہایت ہی مختصر لیکن جامع الفاظ میں روشنی ڈالی گئی ہے ؎

اِس کا مصنف ہے گویاؔ — خوش رُو۔ خوش خُو۔ خوش مذہب
مخبر سال ہے یہ مصرع — معتکف۔ صوفی مشرب

۱۳ ۵ ۳۸

اس وقت تک گویاؔ صاحب تیرہ تصنیفات کے مالک ہیں جن میں سے پانچ نثر میں ہیں اور باقی نظم میں — "فلسفۂ نفس" کے عنوان سے آپ نے حقائقِ نفس پر نثر میں ایک معرکتہ الآرار کتاب لکھی ہے جسے ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد نے اپنے مطبوعات میں شامل کرلیا ہے۔ ماہرینِ نفسیات کا خیال ہے کہ اُردو زبان میں اِس موضوع پر یہ پہلی تصنیف ہے۔

کسی مصوّرِ نفسیات کا اپنے خیالات کی ترجمانی کے لئے شعروسخن کا ذریعہ اختیار کرنے سے کیا مقصد ہے؟ اِس کا جواب خود گویاؔ کے الفاظ میں سُنئے:۔

"کسی ترجمانِ فطرت و مصوّرِ نفسیات کا کام منظرِ عام کی حجاب چشم و نظر صورتوں کی نقاشی کرنا ہرگز نہیں۔ البتہ دنیائے نقش و نگار کے پیچیدہ حجابوں کو اٹھا کر دلوں کو اُس جمالِ منتہا سے متعارف کرانا ہے جس سے متعارف ہونے کی تڑپ ہر بیدار زندگی میں پائی جاتی ہے۔ مگر بیدار زندگیاں اپنی رسائی کے لئے کسی واسطۂ درمیانی کی طالب ہوتی ہیں۔ وہی "واسطۂ درمیانی" ادب جمیل و نقاشی نفسیات ہے۔"

(دیباچۂ دورِ نو)

مذہب گویاؔ فقۂ حنفی کے پیرو ہیں۔ سیّد ہیں۔ "نقوی" ہیں، اور حضرت غالبؔ کی طرح ولائے اہلِ بیت اطہار کو اپنا وسیلۂ نجات سمجھتے ہیں۔ آپ نے اہلِ بیت اطہار کی شان میں جو نظمیں لکھی ہیں اُن میں جذباتِ عقیدت و محبت کی کثرت و فراوانی ہے لیکن آپ بے روح رسم و رواج کے قائل نہیں ہیں۔ چنانچہ آپ نے تعزئے اور عزاداری پر جو اشعار تحریر فرمائے ہیں اُن سے آپ کی قلبی کیفیات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے ؎

حقیقتوں سے جو رسم و رواج خالی ہوں — نظر زمانہ میں کیوں آئے کچھ مآل اُن کا
عمل سے دے نہیں سکتے جو زندگی کا ثبوت — کوئی زمانہ میں کرتا نہیں خیال اُن کا
حیات کا وہ سبق لیں گے کب شہیدوں سے — سوال کرتا ہے خود اُن سے خاص حال اُن کا

حذر اے ملتِ خوابیدہ خواب کی حد ہے
بس اب تباہئ خانہ خراب کی حد ہے (فتوحات)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ گویاؔ کے دماغ پر "نقویت" کے جذبات حد سے زیادہ طاری ہیں۔ میں یہاں ایک رباعی پیش کرتا ہوں جس میں گویاؔ نے اپنے مذہبی مسلک کو واضح الفاظ میں بیان فرمایا ہے ؎

مُسلم کا ہے بس دینِ حقیقی اسلام — شاہد مرا گویاؔ ہے خدا کا پیغام!
ہوں معتقدِ مذہبِ فطرت دل سے — خود ساختہ راہوں کو مرا جھک کے سلام

گویاؔ کا عقیدہ ہے کہ صداقت ہر جگہ قابلِ قدر ہے۔ وہ کسی خاص مذہب و ملت کے لئے

وقف نہیں۔ اِس کے ثبوت میں مندرجہ ذیل نظم کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں جو کہ گویاؔ نے جناب کرشن اور ارجن" کے زیرِ عنوان سپردِ قلم فرمائی ہے :-

کرشن جی ارجن سے فرماتے ہیں

سمجھ ارجن سے ہستی جاودانی — فقط فانی ہے رنگ زندگانی
شعاعوں کے ہزاروں پیرہن ہیں — حجاباتِ رخِ جلوہ فگن ہیں
بدلتے ہیں حجابِ مادّیت — ہیں موتیں انقلابِ مادّیت
جہاں میں جب کبھی وہ دور آئے — غلام انسان۔ انساں کو بنائے
سکھائے جب غلامی بُت پرستی — زمانہ جب بھلائے حق پرستی

ہمیشہ اہلِ حق تلوار اٹھائیں
سرِ باطل پہ خنجر آزمائیں (فیضان)

شاعرانہ کردار جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے الفاظ میں گویاؔ کوئی پیشہ ور غزل گو نہیں ہیں۔ نہ تو آپ نے کبھی اپنے ضمیر کو کسی صلہ یا ستائش کی آرزو میں فروخت کیا اور نہ کسی سرمایہ دار کی تعریف میں قصیدے لکھے اور نہ کسی نظم کمپنی کے آستانہ پر دستک دی۔ آپ نے ایک شعر میں اپنے مشرب کی اِس طرح وضاحت کی ہے ؎

بادہ بو غیر کے قدموں پہ جھکائے — مشربِ عشق میں مطلق ہے حرام

گویاؔ کا شاعری سے کیا مقصد ہے ؟ اِس پر آپ نے مندرجہ ذیل اشعار میں کافی روشنی ڈالی ہے ؎

میں ہوں اور قافلۂ حال کا دردِ مبہم — یادِ اسلاف ہے اور حسرتِ دلگیر مری
شمعِ منزل جو ترے سینہ میں روشن ہو جائے — میں یہ سمجھوں کہ منور ہوئی تقدیر مری

شعر کی کیا تعریف ہے ؟ شاعرِ کامل کسے کہتے ہیں ؟ اور شاعر پر کب وجدانی کیفیات طاری ہوتی ہیں۔ یہ سب باتیں آپ گویاؔ کے الفاظ میں سنئے ؎

شعر کیا شئے ہے اِک نوائے راز
حاصلِ کائنات سوز و ساز (شعرالحکم)

نالۂ نے کو شعر کہتے ہیں — دل ہی کی شے کو شعر کہتے ہیں
شعرِ کامل ہے روح کی آواز — پھونک ہی ڈالتا ہے پردۂ ساز
دردِ مقصود اِس کی منزل ہے — شعر درا صل ہر طرح دل ہے
مختصر یہ پیامِ راز ہے شعر — رہبرِ خلق سوز و ساز ہے شعر
جو ہو ایسے پیام کا حامل
اُس کو کہتے ہیں شاعرِ کامل (فیضان)

برق چمکی، گرجے بادل، کوک اٹھیں کوئلیں — فطرتِ شاعر کو پھر اِک وجد سا آنے لگا
اپنی ہستی پھر نظر آتی نہیں چاروں طرف
دل کی دنیا پر مسلسل پھر کوئی چھانے لگا

سیاسی اور سماجی رجحانات

ہر شاعر کے خیالات زمانہ کے سیاسی اور سماجی رجحانات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں

اگر شاعر کا تعلق حقائق و معارف کی ترجمانی سے ہے تو وہ انسانی ذہن کی نشو و نما میں بہت کچھ مدد دے سکتا ہے اور اِس کے لئے اُسے بصیرت۔ تاثر اور قوتِ بیان سے کام لینے کی ضرورت پڑے گی اور اگر ایک سخنور اپنے زمانہ کے سیاسی۔ معاشی اور سماجی رجحانات سے علیحدہ ہو کر غور و فکر کا خوگر ہو گیا ہے تو اُس کے "شہ پاروں" کے لئے بھی اِس کائنات میں کوئی جگہ نہیں ہے اور اُس کا تمام کلام ایک جسم ہے بے روح اور ایک نغمہ ہے بے کیف، اِس موضوع پر گویا کے حقیقت افروز جذبات ملاحظہ فرمائیے ؎

کعبہ نہ اگر دل ہو تو ہستی بُت ہے — انسان کی ہر رفعت و پستی بُت ہے
یہ سچ ہے مگر ہستی کے بُت خانہ میں — سب سے بڑی سرمایہ پرستی بُت ہے

غلام آدمی۔ آدمی کا جہان ہے — جہاں میں وہی ملک ہندوستان ہے

ظلم و ظلمت کی انتہا ہو جب — کیوں قیامت نہ بے نقاب آئے
(طلوعِ سحر)

فخرِ غلامی

بڑا فخر ہے خاکِ پائے صنم ہیں — قدم بوس کہتے ہیں افلاک ہم ہیں
بہ ظاہر غلاموں کو دیکھو تو حیف — بڑے کرّ و فر ہیں بڑی شان و شوکت

(طلوعِ سحر)

لیا کرتی ہیں تو ہیں کام جن سے صورِ محشر کا — وہ نالے تا ملب آتے نہیں ہیں لائے جاتے ہیں

(طلوعِ سحر)

زندگی اور جہاد ایک حقیقت کے ہیں نام — روح کی موت ہے بس عیش کے گہواروں میں

(طلوعِ سحر)

علیؓ ولی ہی کے ہاتھوں میں ذوالفقار بھی تھی — جہاد لازمی ہے مسلکِ حجازی میں

(دورِ نو)

مثنوی اور رباعی گویاؔ نے متعدد مثنویاں لکھی ہیں جن میں مجازی جذبات کے بجائے عشقِ حقیقی کا ایک سمندر موجیں مار رہا ہے۔ آپ نے پرانے راستوں سے ہٹ کر ایک جدید شاہراہ پر چلنے کی کوشش کی ہے جو بہت حد تک کامیاب کہی جا سکتی ہے۔ مثنوی کے علاوہ رباعی گوئی میں بھی گویاؔ کو ایک امتیازی درجہ حاصل ہے۔ افسوس ہے کہ اُردو زبان میں اب تک کسی شاعر نے عمرِ خیام کی طرح صرف رباعی کو اپنا مستقل موضوعِ شاعری قرار نہیں دیا۔ اُردو میں جناب امجدؔ حیدر آبادی کو بہترین رباعی گو کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ جناب مولانا وحید الدین سلیم رح کے الفاظ میں "امجدؔ کی رباعیوں میں وہی بجلی کوندتی نظر آتی ہے جو اہلِ بصیرت کے لئے ہوشربا ہے۔" میرے خیال میں جناب امجدؔ کے بعد اُردو زبان کے رباعی گو شاعروں میں اگر کسی شاعر کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ گویاؔ کا نام ہو سکتا ہے۔ گویاؔ کی رباعیاں حکیمانہ مضامین اور مسائلِ اخلاق سے لبریز ہیں۔ گویاؔ کی رباعیاں واعظ کے صرف پند و نصائح نہیں ہیں بلکہ ایک پیامِ عمل ہیں، چند رباعیاں ملاحظہ فرمائیے ؎

طوفان گھٹاؤں کے سمٹ جاتے ہیں — دل برق کی اِک ضرب سے پھٹ جاتے ہیں
اللہ غنی۔ زلزلۂ ضربِ حیات — طبقے بھی پہاڑوں کے اُلٹ جاتے ہیں

کردار سے پہچان مقامِ ایمان　　ایمانِ حقیقی سے مقامِ انسان
تو دام میں تزویر کے پھنسنا نہ کہیں　　سبزے کی طرح ہوتی ہے کائی نادان

پیدا ہو۔ بڑھو۔ کھاؤ پیو　　کیا منزلِ ہستی ہے یہی ! بادہ کشو
یہ محشرِ عالم ہے بس اتنے کے لئے　　کس کھیل تماشے میں ہو آنکھیں کھولو

غزل گوئی گویا ایک غزل گو کی حیثیت سے بھی بہت حد تک ایک کامیاب شاعر ہیں سب سے زیادہ قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ آپ نے اپنے مذاقِ سخن کو عامیانہ جذبات سے پاک رکھنے کی کوشش کی ہے۔ نہ تو آپ کے یہاں المیہ شاعری (ٹریجیڈی) کی فراوانی ہے اور نہ طربیہ شاعری (کمیڈی) کی کثرت ہے۔ بلکہ آپ کی شاعری حزن و مسرت کا ایک مجموعہ ہے۔ آپ نے خیالات کی بلندی کے ساتھ ساتھ نفسیاتی پہلو کو کسی جگہ نظر انداز نہیں کیا ہے ؏

"ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"

اِس مصرعہ میں علامہ اقبالؒ نے جس دنیا کی طرف اشارہ کیا ہے گویاؔ اُسی دنیا کے خیالی مشاہدات کو نظم کرنا اپنا کمالِ شاعری سمجھتے ہیں۔ گویاؔ کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔ ایسے اشعار صرف وہی لوگ کہہ سکتے ہیں جن کے دل و دماغ دونوں بیدار ہوں ؎

ہیں کچھ پیام کے معنی پیام کے بھی سوا　　غمِ نظر ہے سکوت و کلام کے بھی سوا
ہیں جس کے کیف سے لبریز اشکبار آنکھیں　　تجلیاں ہیں وہ مینا و جام کے بھی سوا
یہ کائنات نہیں آپ اپنا خود حاصل　　کچھ اہتمام ہے اِس اہتمام کے بھی سوا

محیطِ آب میں خود بن گیا کنول کا پھول　　غموں میں عشق عجب شادماں ہے کیا کہنا

اقتضائے فطرتِ انساں ہے حشر و انقلاب　　بخش کر آزاد دل عالم کو زنداں کر دیا

تعمیر کا جو کام بساطِ خزاں سے لے ——— بڑھ کر چمن میں اُس سے کوئی دیدہ ور نہیں

اشارے خدا جانے کیا ہو رہے ہیں ——— نگاہوں میں سجدے ادا ہو رہے ہیں

گویاؔ کا کلام ہندوستان کے مختلف اخبارات و رسائل میں چھپ چکا ہے. زیادہ تر حصّہ رسالہ ہمایوں (لاہور) میں شائع ہوا ہے۔ رسالہ محرمِ پیلی بھیت کو بھی کچھ نظمیں شائع کرنے کا فخر حاصل ہو چکا ہے۔

گویاؔ کا کلام قریب قریب تمام اصنافِ سخن میں موجود ہے۔ حمد۔ نعت ۔منقبت۔ مثنوی غزل۔ قطعہ۔ رباعی وغیرہ سب کچھ کہا ہے اور ہر صنف میں آپ کا کلام قادرالکلامی کا ایک نادر نمونہ ہے۔ آورد کے ساتھ ساتھ سلاست۔ روانی شگفتگی۔ ندرتِ خیال۔ جدت مضامین اور رفعتِ تخیل آپ کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔ میرا منشا یہ نہیں ہے کہ گویاؔ کا کلام تمام عیوب و نقائص سے پاک ہے۔ میری رائے میں اگر گویاؔ کے کلام میں کوئی لغزش ہو بھی تو وہ قابلِ توجہ نہیں ہے ؎

نہیں عیب کچھ اُن میں گر ہو بھی حسرت
تو ہم لوگ ہیں صرف آگاہِ خوبی (حسرت موہانی)

حقیقی شاعری صرف الفاظ کی بندش، استعارات اور تشبیہات کے گورکھ دھندے کا نام نہیں ہے بلکہ در اصل اُن جذبات کی مصوّری کا نام ہے جو ——"روح کو گرما دیں اور قلب کو تڑپا دیں"——— اور یہ خصوصیات گویاؔ کے کلام میں پورے طور پر موجود ہیں۔

افلاطون کا اعتقاد تھا کہ "ادبیات میں بلند خیالی اور حُسنِ بیان کا تعلق مصنف کے ذاتی اخلاق کی بلندی سے ہے"——— اگر اِس معیار پر گویاؔ کے کلام کو جانچا جائے تو آپ کو ایک شعر بھی ایسا نہ مل سکے گا جو کہ مصنف کی پست خیالی اور کمزوری اخلاق پر دلالت کرتا ہو۔

یہاں میں چند اشعار پیش کرتا ہوں۔ جن سے گویاؔ کے جذبات کی رفعت اور خیالات کی گہرائی کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ سب اشعار "دورِ نو" سے لئے گئے ہیں ؎

نظر آتی نہیں تعمیر کی کوئی جہاں صورت ۔۔۔ وہاں سجدے ہی رکھتے ہیں نئی بنیاد یں امکاں کی

سکوتِ شب میں مضرابِ نفس سے کام لے کوئی ۔۔۔ ہزاروں محو نغمے ہیں ابھی تارِ رگِ جاں میں

دل کی بیداریاں خوابیدہ نظر کیا جانیں ۔۔۔ شبِ ظلمات کے بدمست سحر کیا جانیں

تعینِ مہ و پروین و اشک و شبنم کیا ۔۔۔ تو مسکرا سرِ عنواں مرے فسانوں میں

ستاروں کا بکھرنا ہی قیامت کی نشانی ہے ۔۔۔ تسلسل توڑ کر خود ہی ستارے ٹوٹ جاتے ہیں

عکاسیٔ تبسّمِ رنگیں خیالِ خام ۔۔۔ تاحشر موجِ گریہ اگر گل فشاں رہے

گزرا کوئی ضرور ہے راہِ سرِ نیاز سے ۔۔۔ سجدوں میں نور آ گئے حُسنِ خرامِ راز سے

گویاؔ کی مختلف تصانیف سے کچھ اشعار بطور اقتباس کے یہاں پیش کئے جا رہے ہیں اِن سے لطف حاصل کیجئے ؎

فغانِ صبح و مسا

یہ ایک منظوم قومی مناجات گویاؔ کی اوّلین کاوشِ فکر کا نتیجہ ہے۔ الفاظ نہایت سادہ ہیں۔ جذبات معصومانہ ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

بن کے پکھیرو صبح و مسا ۔۔۔ پڑھتے ہیں تیرا کلما

تیری ہی سب کایا ہے ۔۔۔ تیری ہی سب مایا ہے

یا اللہ یا من موہن ۔۔۔ ہے تیرا سب تن من دھن

من میں ایسی آگ لگے ۔۔۔ جس سے یہ ہر دم سُلگے

اللہ اپنی رحمت سے ۔۔۔ ہم کو فتح و نصرت دے

دینِ نبی کو رونق دے　　چمکا دے سب دینوں سے

مثنوی اسرارِ ہستی

اُردو زبان میں پہلی فلسفیانہ مثنوی ہے "مسئلہ خودی پر ایک جامع مقالہ ہے"
(ہمایوں ۔ لاہور ۔ ۱۹۲۳ء)

(چند اشعار)

یہ پھول پتّے، مہکنے والے　　یہ بیل بوٹے طرح طرح کے!
کھلائے کس نے اُگائے کس نے　　دکھائے کس نے سُنگھائے کس نے؟

یہ چھوٹی چڑیاں چہکنے والی　　وہ ننھی کلیاں، مہکنے والی
چہک رہی ہیں مہک رہی ہیں　　پھُدک رہی ہیں چٹک رہی ہیں

شہود کیا ہے۔ مشاہدہ کیا　　کہ خود ہی شاہد ہے جلوہ آرا

جمیل جن کو سمجھ رہے ہو　　تم اپنا دل جن کو دے چکے ہو
فقط وہ تصویرِ آئینہ ہیں　　فقط وہ تنویرِ آئینہ ہیں

زبانِ تبسم سمجھ میں نہ آتی　　ادائیں ہوئیں ترجمانِ تبسم

صہبائے راز

یہ ایک مختصر مثنوی ہے ۔ دسمبر ۱۹۳۴ء میں شائع کرائی گئی ہے ۔

(چند اشعار)

خود مے میں فنا ہے موج مے کی　　ہستی ہی نہیں ہے اور شے کی

میخانہ بدوش ہر نظر ہے　　ساقی کے جمال کا اثر ہے

ایک ایک نظر ہزار جلوے　　میخانہ طرب بہار جلوے

اِس بزمِ جہاں کا ذرّہ ذرّہ　　اِس کون و مکاں کا ذرّہ ذرّہ
ایک ایک ورق ہے معرفت کا　　ایک ایک سبق ہے معرفت کا
عرفاں کے لئے کھُلا ہو سینہ　　عالم ہے بہر نظر سفینہ

میخانہ میں آکے گھر بنا لے　　مغموم حوادثِ زمانہ
جتنا ہو بلند ذوقِ سجدہ　　اُتنا ہے بلند آستانہ

شعر الحکم

گویاؔ کے ابتدائی کلام کا مجموعہ ہے اور دو زبانوں میں منقسم ہے۔ باب اوّل غزلوں اور رباعیوں کا مجموعہ ہے اور باب دوم نعت و مناقب کا مجموعہ ہے۔

(باب اوّل کے چند اشعار)

آنسوؤں میں سینکڑوں اسرار ہیں　　بہہ رہا ہے ایک دریا راز کا

ایک بڑھتے حوصلے کے ساتھ ساتھ　　دائرہ بڑھتا گیا امکان کا

زندگی معلوم ہوتی ہے مسلسل انقلاب　　سلسلہ دیکھیں کہاں پہنچائے اِس زنجیر کا

یہ دورِ زندگی تو مبتدا ہے　　خبر اس کی نہیں اے بے خبر کیا

اہلِ دل کرتے ہیں منزل کی تلاش　　اور منزل کرتی ہے دل کی تلاش

ڈوبنے والے پھر اُبھرتے ہیں　　ڈوب کر حسرتوں میں ساحل کی

طلوعِ سحر

۱۹۴۳ء میں طبع کرائی گئی۔ ۳۶-۱۹۴۳ء تک کلام کا مجموعہ ہے۔

(چند اشعار)

فطرتِ پردہ پوش کو دیکھو شرم آجاتی ہے گناہ کے بعد

لفظوں سے آنسوؤں کے بنالے عبارتیں گویا یہی زباں ہے فقط ترجمانِ دل

نقوشِ تعین کبھی تو مٹیں گے جبیں گھس رہا ہوں غمِ بندگی میں

بہار کے سے کچھ آثار پائے جاتے ہیں سحر سے زخمِ جگر مسکرائے جاتے ہیں

تیرے چہرے کی طرف دیکھ کے ہنس دیتا ہوں جب سمجھتا ہے کوئی بے سروساماں مجھ کو

یہ تیرے آنسو بتاتے ہیں خود تجھے گویاؔ ہے میکدہ ترے دل میں چھپا ہوا کوئی

دَورِ نو

ماہِ رمضان المبارک ۱۹۴۴ء کے الہامات کا مجموعہ ہے۔ اِس میں گویاؔ کا بہترین کلام ہے اور آپ کے تمام اشعار "شہ پارے" ہیں۔ راقم الحروف نے اِس تبصرہ میں زیادہ تر اشعار "دورِ نو" سے لئے ہیں۔

فتوحات

جون ۱۹۴۵ء کے پندرہ دن کے تلاطمِ جذبات کے نتائج ہیں۔

(چند اشعار)

ملی ہیں اوّل و آخر کی سرحدیں مجھ میں یہ درمیاں سے مری داستاں ہے کیا کہنا

خود بخود جب فرض کر سکتا نہیں اپنا وجود
کس طرح مانوں کہ ہیں قائم جہاں تیرے بغیر

حدودِ جام و مینا سے ہے تھوڑا میکدہ آگے
بڑھا تو اپنی ہستی سے قدم میکش ذرا آگے

لے لئے رحمت نے دامن میں یہ کہہ کر اشکِ رد
کیا سمندر اپنے قطروں میں سما سکتا نہیں؟

فیضان

ساقیٔ ازل کی فیاضی سے تین ماہ کے عرصہ میں ۲۴ ستمبر ۱۹۴۵ء کو یہ مجموعۂ کلام ترتیب دیا گیا ہے۔ اِس کتاب کے مطالعہ کے لئے شرط یہ ہے کہ آپ چاندنی رات میں ستاروں کے جھرمٹ کے نیچے صحنِ گلستاں میں بیٹھے ہوں۔

میں نے گویاؔ کے کلام پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے اور شعر و سخن کے تشنہ لب حضرات کی پیاس بجھانے کے لئے یہ چند قطرے ایک بحرِ بیکراں سے لے لئے ہیں ؎

فسانہ دل کا ہے شاید شفق کی سُرخی میں
جبینِ صبح کی پڑھنا پڑی شکن مجھ کو (دورِ نو)

میری دُعا ہے کہ گویاؔ کا کلام موجودہ اور آیندہ نسلوں کے لئے ایک نشانِ راہ کا کام دے۔

بسمل

شفائی میڈیکل ہال پیلی بھیت۔
۲۹-جنوری ۴۸ء

۷۵

چند گھنٹے

مولانا طفیل احمد صاحب مرحوم کے ساتھ

(از سیّد الطاف علی بریلوی)

۵ اگست ۱۹۳۱ء —— آج صبح ایک تکلیف دہ سفر کا خاتمہ ہوا۔ واقعہ اِس طور پر ہے کہ ۶ جولائی ۱۹۳۱ء کو دوبارہ ایل ایل۔بی کے امتحان میں ناکامیابی کا نتیجہ آیا تو مجھ پر یہ دُھن سوار ہوگئی کہ میں بریلی میں رہ کر اِس امتحان کو پاس نہیں کر سکتا۔ صدہا قسم کے قومی کام نیز مکان کی پریشانیاں اطمینان و دلجمعی کے ساتھ قانون پڑھنے کا ہرگز موقع نہ دیں گی۔ چنانچہ میں نے اپنے اِس خیال کا اظہار اپنے احباب اور اعزّا میں عام طور پر کرنا شروع کر دیا۔ لوگوں کی صلاح یہ ہوئی کہ مجھے لکھنؤ جانا چاہیئے۔ جہاں ایل ایل۔بی کا بہت عمدہ نتیجہ رہتا ہے۔ ذاتی طور پر میں لکھنؤ کے علاوہ علی گڑھ کو بھی پسند کرتا تھا۔ کیوں کہ وہاں ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۰ء تک رہ چکا تھا مگر احباب و اعزّا نے لکھنؤ ہی کیلئے اصرار کیا اور لکھنؤ ہی جانا طے بھی ہوا۔

یکم اگست کو یونیورسٹی کھلنے والی تھی۔ والد صاحب اور ماسٹر احمد شاہ خاں صاحب میرے بریلی سے باہر جانے کے مخالف تھے۔ والد صاحب یہ فرماتے تھے کہ تم نے گزشتہ سالوں میں کسی ایک سال بھی معمولی محنت نہیں کی ہے کم از کم ایک مرتبہ محنت کر کے امتحان دو پھر بھی اگر خدانخواستہ ناکامیابی ہو تو باہر کا خیال کرنا چاہیئے۔ دوسرے اُنہیں میری جدائی پسند نہ تھی۔ حالات تبدیل ہو گئے تھے اور ہم لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کی ہر وقت ضرورت تھی۔ والد صاحب 'شاہد' اور 'ساجد' کا بھی ذکر کرتے تھے کہ بچے تمہاری عدم موجودگی میں بہت پریشان ہوں گے۔ نیز بلا سبب اچھا خاصہ آباد گھر صرف تمہارے باہر چلے جانے سے برباد سا ہو جائے گا۔

مذکورہ بالا امور کو دن رات سوچتا رہا اور قریب قریب روز ہی والد صاحب اور دوسرے لوگوں کے خیالات سنتا رہا تاکہ صحیح فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔ بالآخر ۲؍اگست کی شام کو لکھنؤ کی روانگی ہو ہی گئی۔

۲؍اگست کی دوپہر سے سارا گھر لوٹ پوٹ تھا۔ سب گھر والے جمع تھے اور ہر شخص کو میرے جانے کا شدید صدمہ تھا۔ سہ پہر سے والد صاحب بھی سامانِ سفر کی تیاری میں مدد دینے کو میرے پاس آ گئے۔ شاہد کو بھی باوجود نو عمری میرا جانا بہت شاق تھا۔ اور ہر پانچ منٹ بعد یہ سوال ہوتا تھا کہ "چچا کہاں جا رہے ہو؟" ـــ میں جواب دیتا کہ "میاں لکھنؤ جا رہا ہوں"ـــ اس پر ارشاد ہوتا "ہم بھی جائیں گے"۔ یا کسی وقت بھاگ کر آتے اور چمٹ کر کہتے ـــ "کیا ہمیں اکیلا چھوڑ جاؤ گے"۔ میں نے اطمینان دلایا کہ ـــ "نہیں تمھیں بھی لے چلیں گے"۔ اس پر اِن حضرت نے بھی اپنی تیاری شروع کر دی اور پانچ بجے تانگہ آیا تو 'شاہد' بھی بیٹھ گئے۔ خیال کیا کہ اسٹیشن سے لوٹا دوں گا۔ مگر وہ کب لوٹنے والے تھے مجبوراً 'متھرا' تک ساتھ لے گیا اور وہاں جب وہ سو گئے تو اُنہیں محمد امین صاحب کے سپرد کر کے میں لکھنؤ چلا گیا۔

مکان جس وقت تانگہ میں بیٹھ رہا تھا تو سامنے دروازہ میں گھر کی تمام چھوٹی بڑی عورتیں کھڑی ہوئی تھیں۔ 'بھائی میاں' مرحوم کے بچے "مصطفےٰ علی مرتضائی اور مصطفائی" خاص طور پر بہت اداس تھے۔ تانگہ کے قریب والد صاحب کھڑے تھے اور اُس وقت اُن کی صورت دیکھی نہ جاتی تھی۔ آنکھیں سُرخ تھیں اور گہری گہری سانسیں لے رہے تھے۔ تانگہ چلا تو بہ جبر مسکراہٹ سے 'خدا حافظ' کہا۔ والد صاحب کی یہ کیفیت میرے لئے ناقابلِ برداشت تکلیف کا باعث ہوئی۔ دل بھر آیا اور جی چاہا کہ خوب پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔ اُسی وقت میں نے نہایت گہرے قلبی تاثرات کے ساتھ یہ مضبوط ارادہ کیا کہ امسال خوب محنت کروں گا اور اپنے غم نصیب والد کو آیندہ اِس قسم کی تکلیف کا موقع نہ دوں گا۔

*

۳؍اگست کی صبح کو لکھنؤ پہونچا۔ یہ خوب صورت شہر مجھے ہمیشہ سے بہت پسند ہے۔ لیکن اب کے نہ معلوم مجھے کیا ہو گیا تھا کہ اس میں کوئی دل بھانے والی چیز نظر نہ آئی۔

خیال ہوا کہ صبح کا وقت ہے جب دن چڑھنے پر بازار وغیرہ کھلیں گے اور آدمیوں کی چہل پہل ہوگی تو لکھنؤ پھر لکھنؤ معلوم ہونے لگے گا۔

اپنے عزیز دوست مسعود الحسن صاحب ایم۔ اے کے مکان پر قیام کیا۔ اُن کے بڑے بھائی محمود الحسن صاحب بی اے ایل ایل بی بڑی مہربانی اور محبت سے پیش آئے لیکن چوں کہ اُن سے تکلّف کے تعلقات تھے اِس وجہ سے غریب الوطنی اور تنہائی کا احساس ہونے لگا۔ محمود صاحب کو اُس دن کچہری میں بھی بہت کام تھے اِس لئے انھوں نے دو بجے تک یونیورسٹی داخلہ کی غرض سے ساتھ چل سکنے کے لئے فرمایا۔ اِس عرصہ میں مولوی ظفر الملک صاحب اور مولوی انیس احمد صاحب عباسی ایڈیٹر روزنامہ "حقیقت" سے ملنے کے لئے چلا گیا۔ راستہ میں شوکت تھانوی صاحب سے بھی سلام دُعا ہوئی اور اُن سے میں نے ملاقات کرنے کا وعدہ کیا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر ندوہ گیا۔ مولوی مسعود عالم صاحب ایڈیٹر عربی رسالہ "الضّیاء" اور عبدالمجید صاحب چینی سے ملاقات ہوئی۔ مسعود عالم صاحب بڑی عزّت و احترام کے ساتھ پیش آئے۔ جمعہ کا روز تھا ندوہ کی نئی مسجد میں نماز جمعہ ادا کی۔ اِس مسجد کی جب رسم افتتاح ہوئی تھی تو میں موجود تھا۔ آج اُس دن کی سی رونق کہاں۔ تھوڑے سے نمازی تھے اِس لئے وہاں بھی دل نہ لگا۔

بعد نماز محمود صاحب کے ساتھ یونیورسٹی گیا۔ پہلے رجسٹرار کے سامنے پیشی ہوئی اور داخلہ کے فارم پر یہ لکھنے کی ضرورت ہوئی کہ کئے مرتبہ اِس سے قبل امتحان میں شریک ہو چکا ہوں، مجھے اِس بات کے بتانے یا لکھنے سے کہ میں دو بار فیل ہو چکا ہوں سخت شرمندگی ہوئی۔ فوراً دل برداشتہ ہو کر آفس سے نکل آیا۔ سارا جسم پسینے پسینے تھا اور میں بدحواس اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔ محمود صاحب کو زیادہ فرصت نہ تھی اور جب میں اکیلا رہ گیا تو میں نے اپنی موجودہ حالت پر غور کیا اور اندازہ لگایا کہ یہ سب خمیازہ کام نہ کرنے کا ہے۔ اگر کام کر لیا جاتا تو کاہے کو دربدر کی ٹھوکریں کھانی پڑتیں۔ نہ بچّوں اور والد سے جدائی اختیار کرنی پڑتی۔ اب بھی یہ ممکن ہے کہ گزشتہ را صلوٰۃ آیندہ را احتیاط کے اصول پر ایمان داری کے ساتھ عمل پیرا ہو لیا جائے۔

اِن خیالات سے دل میں مضبوطی پیدا ہوئی اور سوچا کہ جب محنت اور کام ہی

کرنا ہے تو بریلی میں رہ کر بھی امتحان پاس کیا جا سکتا ہے۔ اب ایک ایک کرکے بچّوں، بیوی اور والد صاحب کی حسرت زدہ صورتیں آنکھوں کے سامنے پھرنے لگیں۔ دل خون کے آنسو رونے لگا۔ طبیعت میں زبردست ہیجان پیدا ہوا کہ پر لگ جائیں اور میں اُڑکر مکان پہنچ جاؤں، والد صاحب کے قدموں پر سر رکھ دوں کہ میری حماقتوں کو معاف کر دیجئے میں گوشہ گیر ہوا جاتا ہوں اور جب تک امتحان نہ پاس کر لوں گا کسی غیر ضروری کام میں مطلق حصّہ نہ لوں گا۔ اب میں نے یونیورسٹی کی طرف سے منھ پھیر لیا اور تانگہ کرکے اپنی قیام گاہ کو چل دیا۔ دریائے گومتی۔ چھتر منزل۔ قیصر باغ ایک سے ایک اچھے مناظر اور عمارتیں نظر پڑیں مگر سب میں ایک قسم کی ویرانی اور اجنبیت کی فضا دکھائی دی۔ سارا لکھنؤ ایک اُجاڑ بستی تھی اور اُس کے مقابلہ میں اپنے شہر بریلی کی آبادی و رونق کی خیالی تصویر آنکھوں میں پھر رہی تھی۔

امین آباد پہونچ کر تانگہ سے اُترا۔ سوچا کہ محمود صاحب گھر نہ ہوں گے۔ گاڑی کے چھوٹنے میں دیر ہے۔ اِس عرصہ میں کہاں جاؤں۔ صدیق بک ڈپو گیا۔ میری کتاب 'حیاتِ حافظ رحمت خاں' کی اُس کے مالک صدیق حسن صاحب نے قدر دانی کی ہے سلام دعا کے بعد کتاب کی باتیں ہونے لگیں۔ میں نے کہا کوئی کام بتائیے جس سے نفع ہو۔ آج کل خالی ہوں۔ انہوں نے جواب دیا کیا کام بتاؤں۔ اِس زمانے میں کتاب کو کوئی دو کوڑی کو نہیں پوچھتا، تاہم سوچ کر لکھوں گا۔ اس کے بعد انہیں کہیں جانا تھا مجھے باقاعدہ رخصت کئے بغیر اُٹھ کھڑے ہوئے اور منھ پھیر کر چل دیئے میں نے خیال کیا کہ یہ پبلشر لوگ کتنے بے نیاز اور خوش حال ہیں۔ محنت ہم مصنف کریں اور مزا ان کو آتا ہے۔

محمود صاحب کے مکان پر آنے اور ریل کے وقت میں اب بھی دیر تھی اِس لئے قریب ہی شوکت تھانوی صاحب ایڈیٹر سرپنچ کے درِ دولت پر گیا۔ آج پہلی مرتبہ نسیم انہونوی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ہر دو اصحاب بڑی محبّت سے ملے۔ 'حیاتِ حافظ رحمت خاں' کی دیر تک دونوں صاحب تعریف کرتے رہے۔ شوکت صاحب نے رسالہ 'شباب' میں نسیم صاحب کا لکھا ہوا ریویو بھی دکھایا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ :-

"مدت العمر میں "تاریخ اسپین" اور "حیاتِ حافظ رحمت خاں" سے بہتر انہوں نے
کوئی تاریخ نہیں دیکھی "

شوکت صاحب ایک ہوشیار و کامیاب ادیب ہیں - میں نے اُن سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا اور مشورہ کیا کہ مجھے لکھنؤ رہنا چاہیئے یا بریلی چلا جانا چاہیئے - انہوں نے فرمایا کہ آپ فوراً بریلی چلے جائیں، میرے بھی جب سے بچے ہو گئے ہیں دو روز اطمینان سے باہر نہیں رہا جاتا - ہر وقت فکر لگی رہتی ہے، آپ فکرمند رہیں گے اور اِس طرح جس اطمینان و سکون کی تلاش میں آپ یہاں آئے ہیں وہ نصیب نہیں ہو سکتا -

شوکت صاحب نے میری دل کی بات کہی اور میں واپسی بریلی کے ارادہ میں پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گیا - شوکت صاحب کے مکان سے قیام گاہ آیا - محمود صاحب بھی آ گئے تھے - چائے پی - اُس کے بعد چوں کہ گاڑی کے وقت میں صرف ایک گھنٹہ باقی رہ گیا تھا اِس لئے اُن سے ڈرتے ڈرتے اپنے ارادہ کا اظہار کیا وہ چونک پڑے اور پہلی گاڑی چھڑوا کر رات کے ۹ بجے تک طرح طرح سے سمجھاتے رہے - اِس عرصہ میں یونیورسٹی کے بورڈنگوں میں بھی لے گئے - وہاں کے لوگوں سے ملایا - غرض سب ہی کچھ کیا جس سے کسی دوسرے آدمی کا دل ضرور پسیج جاتا مگر مجھ پر چونکہ واپسی کا پورا جنون سوار ہو گیا تھا اِس لئے میں نے نہ مانا اور سواری منگا کر اسٹیشن پہونچ گیا اور ۱۰ بج کر ۲۰ منٹ کی گاڑی سے بریلی روانہ ہو گیا - ریل میں بیٹھتے ہی یہ معلوم ہوا کہ کوئی بہت بڑا بوجھ تھا جو سینہ سے ہٹ گیا اور میں پورے اطمینان خاطر سے بستر بچھا کر لیٹ گیا - اتنے میں کسی اسٹیشن سے بارش شروع ہو گئی - دماغ کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لگی - دن بھر کا تھکا ہوا تو تھا ہی - سکون پاتے ہی سو گیا - کٹرہ کے اسٹیشن پر صبح کے چار بجے آنکھ کھلی -

※

آنکھ کھلی تو اب رنگِ طبیعت از سرِ نو دگر گوں تھا - بریلی قریب آ رہی تھی - سارے شہر میں میرے لکھنؤ جانے کی شہرت ہو چکی تھی - اب واپس آؤں گا تو کیسی جگ ہنسائی ہو گی اور لوگوں کو میری بزدلی اور پھوئیا پن پر کیسا افسوس ہو گا - نہیں - مجھے لکھنؤ سے نہ آنا چاہیئے تھا، کچھ دنوں میں ضرور وہاں دل لگ جاتا - ابتدا میں زیادہ پریشانی

اِس وجہ سے ہوئی کہ نئی جگہ تھی اور عرصہ کے بعد وطن چھوڑنے کا اتفاق ہوا تھا۔ مگر اب کیا لکھنؤ پھر واپس جاؤں۔ نہیں اس کی کیا ضرورت ہے۔ بریلی اسٹیشن پر اِس وقت علی گڑھ کی گاڑی تیار کھڑی ہوگی۔ علی گڑھ میں چار سال رہ چکا ہوں، وہاں کی سرزمین میرا دوسرا وطن ہے۔ ہر شخص مجھے جانتا ہے، خوب دل لگے گا اور بڑے اطمینان کی زندگی بسر ہوگی۔

بریلی اپنے عزیز وطن کے اسٹیشن پر پہونچا اور فوراً علی گڑھ کا ٹکٹ لے کر علی گڑھ کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ مجھے اپنے اِس اقدام سے بے حد مسرت ہوئی اور میں نے خیال کیا کہ واقعی اب میں صحیح راستہ پر جا رہا ہوں۔ میں نے ریل ہی میں غسل کیا۔ چندوسی اسٹیشن پر ناشتہ کیا اور بڑے اطمینان سے اپنی سیٹ پر لیٹ گیا۔

ساڑھے دس بجے علی گڑھ پہونچا۔ اپنے دوست مسٹر محمود احمد بہاری ایم اے۔ ایل ایل بی لکچرر شعبۂ فلاسفی کے کمرہ پر قیام کیا اور پورے جوش و خروش کے ساتھ یونیورسٹی میں داخلہ کی رسومات پوری کرنے کے لئے چل پڑا۔ پہلے مولوی طفیل احمد صاحب قبلہ سے ملا۔ مولانا صاحب نے اُس خصوصی محبت کی بنا پر جو انہیں مجھ سے ہے میرا خیر مقدم کیا۔ لیکن میری وجہ حاضری پر کسی خاص خوشی کا اظہار نہ فرمایا۔ مولانا صاحب سے مل کر پروفیسر حبیب صاحب سے ملنے گیا۔ کیوں کہ میں علی گڑھ اِس ارادہ سے گیا تھا کہ تاریخ کے ایم اے میں داخلہ کراؤں گا اور ایل ایل بی کا پرائیویٹ امتحان دوں گا۔ کیوں کہ ایک مرتبہ میں علی گڑھ میں بھی فیل ہو چکا تھا۔

حبیب صاحب نہ کلاس میں ملے اور نہ ساڑھے بارہ بجے تک انتظار کے باوجود اپنے بنگلہ پر۔ اب پھر طبیعت پر کوفت شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ سہ پہر تک وہی لکھنؤ والا وحشت و گھبراہٹ کا جنون سر پر سوار ہو گیا اور سوچنے لگا کہ کیا علی گڑھ رہنے سے والدصاحب اور بچوں سے علیحدگی نہ ہوگی۔ اب علی گڑھ میں وہ پُرانی دلچسپیاں بھی نظر نہیں آتیں۔ تمام نئے لوگ ہیں، ان کے ساتھ کیسے زندگی بسر ہوگی۔ اکیلا کمرہ دیر ہو جانے کی وجہ سے نہیں مل سکتا۔ کسی دو طالب علموں کے رہنے والے کمرہ میں جگہ ملے گی، نہ معلوم ساتھی کس قسم کا ہوگا پڑھائی کے لئے یک سوئی اور تنہائی کی ضرورت ہے۔ وہ یہاں ناممکن ہے۔ اس سے تو بریلی میں میرے مکان کا وہ کمرہ جس میں میں رہتا ہوں اچھا ہے۔ وہاں اگر میں نہ چاہوں تو

میرے پاس کون آسکتا ہے۔ یہاں اگر میں کسی کو نہ بلاؤں گا تو میرے ساتھی کے ملنے والے تو آئیں گے۔ اب طبیعت کی وہ جوانی باقی نہیں ہے کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کر دیا جائے۔ ضرور بالضرور سخت روحانی تکلیف ہوگی۔ آخر اس میں کیا قباحت ہے کہ جس طرح یہاں رہنا چاہوں اسی طرح اپنے مکان پر رہوں۔ جہاں نہ زیادہ مصارف ہوں گے اور نہ بچوں اور والد صاحب سے علیٰحدگی ہوگی۔

※

مذکورۂ بالا امور دماغ میں اچھی طرح چھاگئے اور اب جوں جوں غور کرتا ہوں علی گڑھ آنا بھی حماقت معلوم ہونے لگا! اور ارادہ کیا کہ ابھی کچھ نہیں گیا ہے فوراً واپس ہو جانا چاہیے۔ اچھا ہوا کہ علی گڑھ کی بھی حسرت نکل گئی۔ آئندہ بریلی میں کسی دوسری جگہ جانے کا خیال نہ آیا کرے گا۔

پانچ بجے گاڑی چھوٹتی تھی۔ چار بجے اپنے میزبان محمود صاحب سے اس ارادے کا اظہار کیا اور وہ بھی لکھنؤ والے محمود صاحب کی طرح چونک پڑے اور سر سے پیر تک مجھے دیکھ کر ترحم آمیز نگاہوں سے یہ اندازہ کرنے لگے کہ میرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا جس کا اظہار صبح سے اس وقت تک تو نہیں ہوا مگر اب ہو رہا ہے۔ مجھے پکڑ کر بٹھا لیا اور لگے طرح طرح سے سمجھانے۔ برعکس اس کے میری نگاہ گھڑی پر تھی۔ بہ مشکل وہ تانگہ منگانے پر راضی ہوئے۔ سامان کا ڈھیر تھا بڑی بھاگ دوڑ کر کے اسٹیشن پہونچا تو بدقسمتی سے گاڑی چھوٹ گئی۔ اپنی مختصر سی زندگی میں بارہا سفر کا اتفاق ہوا اور بہت دفعہ گاڑیاں چھوٹ گئیں لیکن جیسا اس گاڑی کے چھوٹنے کا صدمہ ہوا ایسا کبھی نہ ہوا۔ گاڑی مل جاتی تو کس قدر جلد منزلِ مقصود پر پہونچ جاتا۔ رات کو اطمینان سے گھر سوتا۔ دو راتیں تکلیف اٹھاتے ہو گئی تھیں۔ صبح سے پھر اصلی زندگی شروع ہو جاتی۔

تانگہ پر اسباب لدا ہوا ہے اور میں ان خیالات میں غرق ہوں۔ تانگے والے نے کہا "حضور بورڈنگ واپس پہونچا دوں"۔ بورڈنگ کا نام سنتے ہی اور ہوش اُڑ گئے سارے بورڈنگ والے دیکھ کر کہیں گے۔ یہ کون دیوانہ ہے جس کا آج دن بھر اسباب مارا مارا پھر رہا ہے۔ وہ لوگ وجہ دریافت کریں گے اور میری بے وقوفیوں پر خوب

تالیاں بجیں گی۔ محمود صاحب بڑے سمجھ دار اور فلسفی ہیں مجھے دل کھول کر سمجھائیں گے اور ایسا گرفتار کریں گے کہ پھر بریلی جانا نصیب نہ ہوگا۔

*

معاً مولوی طفیل احمد صاحب قبلہ کا خیال آیا کہ دوسری گاڑی تک جو آٹھ گھنٹے بعد ملے گی۔ اُن کے ساتھ قیام کروں۔ میرے ارادے کی تبدیلی کو وہ بھی پوچھیں گے مگر اُن کے سامنے اپنا دل کھول کر دکھانے میں زیادہ شرمندگی اٹھانی نہ پڑے گی۔ سچے ہمدرد ہیں میری دماغی الجھنوں پر بجائے غصّہ کرنے کے صحیح رہ نمائی کریں گے۔ عمر رسیدہ بزرگ ہیں۔ خود بھی ممکن ہے اِس قسم کی کیفیاتِ دماغی سے اپنی زندگی میں گزر چکے ہوں۔

اسٹیشن سے "مولانا" کی قیام گاہ ولایت منزل لوٹ کر آیا۔ اُن کے کمرے میں سامان رکھوایا۔ مولانا صاحب کہیں تشریف لے گئے تھے۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ میں آئے۔ اِس عرصہ میں میں خواجہ حسن نظامی صاحب کے اخبار "منادی" کے پرچے اور اخبار "سرگزشت" پڑھتا رہا۔ سر میں سخت گرانی اور آنکھوں کے حلقوں میں درد تھا۔ اخبار پر نظر تھی مگر کچھ بھی ذہن نشین نہ ہو رہا تھا۔ یُوں بھی خواجہ حسن نظامی صاحب کی تحریر کے بین السطور میں مجھے دنیا سازی نظر آیا کرتی ہے آج خصوصیت سے بہت تکلیف ہوئی۔ سلطنت مغلیہ کے آخری چراغ "بہادر شاہ ظفر کے حالاتِ مقدمہ" ضرور پُر اثر تھے۔ اور میرا خیال ہے کہ اِس ضمن میں حسن نظامی صاحب نے جو لٹریچر ملک کے سامنے پیش کیا ہے وہ اُن کا ایک قابلِ قدر کام ہے۔ میرا بھی ارادہ ہے کہ جب کبھی حالات سازگار ہوں گے۔ حضرت بہادر شاہ ظفر کی سوانح عمری" مرتب کروں گا اور یہ سوانح عمری سچے حالات پر مشتمل ہوگی۔

ساڑھے چھ بجے مولانا صاحب تشریف لے آئے۔ اُن کو دیکھ کر قلب و جسم میں ہمیشہ ایک تازہ روح پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ سارے ملک میں اُن سے زیادہ میرے دل میں کسی کی قدر و منزلت نہیں۔ کسی حال میں ہوں سچّی اور حقیقی محبت سے لبریز مسکراہٹ سے میرا خیر مقدم کیا کرتے ہیں اور اُن کے اِس عمل سے میری ساری فکریں اور تکلیفیں دُور ہو جایا کرتی ہیں۔

مولانا صاحب بہ یک نظر میری موجودہ کیفیت دماغی کو سمجھ گئے اور کپڑے اُتار کر مجھ سے انتہا درجہ محبت و ہمدردی کی باتیں کرنے لگے۔ میں نے اپنے قیام علی گڑھ کے

ارادے کی تبدیلی اور اچانک بریلی چلے جانے کے خیال کو بلا پس و پیش اُن سے بیان کیا اور انہوں نے فرمایا کہ تمہارا یہ اقدام مجھے بہت پسند آیا اور مسرت ہوئی۔ مولانا صاحب سے میں دل کھول کر باتیں کیا کرتا ہوں اور اپنے گناہوں اور غلطیوں کا بھی بے کم و کاست اظہار کرکے اُن سے رہ نمائی کا طالب ہوا کرتا ہوں۔ مجھے اپنی غلطیاں اور گناہ مولانا صاحب کے سامنے بیان کرنے میں ایسی ہی روحانی خوشی ہوتی ہے جیسی کہ عیسائیوں کو پادری کے سامنے کنفیشن (اقرارِ گناہ) کرکے۔ مولانا صاحب اُن کو خوب غور و خوض سے سنتے ہیں اور ہر ایک تکلیف کا علاج تجویز فرما دیتے ہیں۔ رات کے نو بجے تک مولانا صاحب نے اپنی پُر از حقائق و معارف گفتگو کو جاری رکھا۔ ہر لفظ جو اُن کی زبان سے ادا ہوتا تھا میری بیمار و ضعیف روح کو فرحت و تازگی بخشتا تھا۔ کاش جس طرح "باسول"۔ "ڈاکٹر جانسن" کی تمام گفتگو کو لکھ لیا کرتا تھا۔ میں بھی مولوی طفیل احمد صاحب کے اقوال کو آبِ زر سے لکھ لیا کرتا۔

اِس موقع پر مولانا صاحب کی پند و نصائح کا خلاصہ یہ تھا کہ :-

" وکالت کا امتحان پاس کرنا اِس وقت میرا اوّلین فرض ہے اور جب تک میں امتحان پاس نہ کرلوں، ہر ایک دوسرے بڑے سے بڑے نفع آور کام کی طرف توجہ نہ کروں "

" وکالت کا امتحان پاس کرلینے کے بعد میں آزاد ہوں گا کہ وکالت نہ کروں اور کوئی دوسرا پیشہ اختیار کرلوں۔ مگر اِس ڈگری کو ضرور حاصل کرلوں۔ اِس سے "سوشل اسٹیٹس" میں اضافہ ہوگا۔ نیز کسی دوسرے کام میں ناکامیابی کی صورت میں مجھے یہ موقع حاصل رہیگا کہ اس پر بھروسہ کرکے اُسے اختیار کرسکوں "

" وکالت کا امتحان پاس کرنے کی چوں کہ والد صاحب کی دلی تمنا اور آرزو ہے۔ اِس لئے اِس کام کو فرض اور "ڈیوٹی" سمجھ کر انجام دُوں "

" اپنے والد کے جذبات کا بہت زیادہ احترام کروں، کیوں کہ وہ غیر معمولی بڑے کیرکٹر اور سمجھ کے انسان ہیں "

(مولانا صاحب نے فرمایا کہ تمہارے والد صاحب جیسے چہرے کا انسان میں نے نہیں دیکھا اور گو وہ لکڑی کی تجارت کرتے ہیں مگر بہت بڑے کام مثل کسی ضلع کی امارت

و ریاست کے اہل ہیں " والد صاحب کے متعلق اسی قسم کی رائے کا اظہار اس سے قبل منشی عظیم الشان خاں صاحب ماہر السنۂ مشرقیہ بھی فرما چکے ہیں) ۔

مولانا صاحب نے فرمایا کہ " میں فرسٹ ڈویژن میں امتحان پاس کرنے کا منصوبہ بناؤں اور یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے بشرطیکہ دل لگا کر مضمون میں دلچسپی پیدا کر لی جائے " " مجھے بریلی کالج ہی سے امتحان دینا چاہیئے اور وہیں سے کامیابی حاصل کرنے میں عزّت ہے " ۔

" مجھے تمام قومی کام دو سال کے لئے یک لخت ترک کر دینے چاہئیں ۔ نیز ایسے مشاغل سے بھی کنارہ کشی کر لینی چاہیئے جو قانون پڑھنے میں میری توجّہ کو ہٹائیں " ۔

" مجھے قوم و ملک سے پہلے اپنی ذات کی خدمت کرنی چاہیئے اور حسب ذیل مسلّمہ لائحۂ عمل پر کاربند ہونا چاہیئے " ۔

(۱) اوّل درجہ پر اپنی جسمانی صحت کو بڑھانا چاہیئے ۔

(۲) دوسرے درجہ پر حصولِ معاش کی فکر کرنی چاہیئے جس سے جسم کی خدمت ہو سکے ۔

(۳) تیسرے درجہ پر اپنے اہل و عیال اور اہل خاندان کی خدمت کرنی چاہیئے ۔

(۴) چوتھے درجہ پر اگر پہلے تین فرائض سے فراغت حاصل ہو تو ملکی و قومی خدمت کے کاموں میں حصّہ لینا چاہیئے ۔

(۵) پانچویں درجہ پر تفریحی مشاغل میں حصّہ لینا چاہیئے " ۔

میں نے قومی خدمت کو چوتھا درجہ دینے پر اعتراض کیا اور عرض کیا کہ جب ہر چہار جانب عام تباہی پھیلی ہو اور ملک و ملّت نازک دور سے گزر رہے ہوں تو انسان کا فرض ہوتا ہے کہ وہ ملّی و ملکی خدمت کو اپنا فرض اوّلیں بنائے ۔

اس پر مولانا صاحب نے فرمایا " ابھی وہ نازک دور نہیں ہے ۔ نہ کوئی قومی جنگ ہو رہی ہے اور نہ مذہبی جہاد ۔ بغیر ان دو صورتوں کے پیش آنے کے تم اپنے ذاتی فرائض کو فراموش نہیں کر سکتے ۔ دوسرے زیادہ سے زیادہ اہلیتِ کار اپنے میں پیدا کر کے انسان کو میدانِ عمل میں آنا چاہیئے ۔ تاکہ پھر قدم پیچھے نہ ہٹے اور ثبات و استقلال کے ساتھ کام کیا جا سکے " ۔

مولانا صاحب سے مذکورۂ بالا طرز پر ۹ بجے تک سلسلۂ کلام جاری رہا ۔ اس کے بعد

میر ولایت حسین صاحب سپرنٹنڈنٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس تشریف لائے۔ مولانا صاحب ان سے مخاطب ہوئے اور مجھ پر نیند کا غلبہ طاری ہوگیا۔ مولانا صاحب نے اپنا پلنگ چھوڑ دیا۔ اور میں انتہا درجہ سکونِ قلب کے ساتھ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر سو گیا۔

رات کے بارہ بجے مولانا صاحب نے مجھے جگایا کہ تانگہ آگیا۔ اپنی ڈیوٹی پر جاؤ۔"

۵ راگست کی صبح کو میں بریلی پہونچ گیا۔ سب گھر والوں کو میری واپسی کی عام طور پر خوشی ہوئی اور میں نے بھی یہ محسوس کیا کہ گویا دو سال کی جیل سے چھوٹ کر گھر آیا ہوں۔"
والد صاحب کو تو ایسی مسرت ہوئی جیسی کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام سے مل کر ہوئی ہو گی۔ (میری ڈائری)

مطبوعات سنہ پریس بجنور، اور دوسری اہم کتابیں

باغی ہندستان — انقلاب ۱۸۵۷ء کے تاریخی واقعات، علامہ فضل حق خیر آبادی اور دوسرے اساطین سلسلۂ خیر آباد کی سوانح حیات، مولفہ مولانا عبدالشاہد خاں شروانی۔
قیمت مجلد ۵ر

کاروانِ خیال — امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد اور نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن خان شروانی کا مجموعۂ مکاتیب مع مقدمہ از مولانا محمد عبدالشاہد خاں شروانی۔
قیمت مجلد ۴ر

گیتا اور قرآن — اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں، پنڈت سندر لال سیکریٹری ہندستانی کلچر سوسائٹی الہ آباد کی بہترین کتاب۔ قیمت مجلد ۲ر

سیر الاحناف	عورت اور قرآن	باغِ صحت حصہ اول	حصہ دوم	حصہ سوم	حصہ چہارم
۸ر	۸ر	۸ر	۸ر	۸ر	۱۲ر

مجرباتِ یادگار	عورت کا جوہر	ہندستانی جاسوس	کلیاتِ نظم علامہ شبلی
۸ر	۳ر	۴ر	۵ر

ادارۂ علمیہ، محمد علی روڈ، اوپر کوٹ علی گڑھ سے طلب فرمائیے

نظم خیر مقدم[۱] نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی

از علامہ کیفی چریاکوٹی

بزم مینے، آسماں آید ہمی	وندراں، مہ ضوفشاں آید ہمی
نیک تا بد، بخت یونیورسٹی	یعنی اسمٰعیل خاں آید ہمی
از خدا ہیں، از پئے کشتی قوم	ناخدائے مہرباں آید ہمی
بحر و طوفاں موج اندر موج بود	کشتیٔ ما برکراں آید ہمی
باز نا ید سوئے موج بیکراں	برکراں لنگر کناں آید ہمی
قوم کاندر یاس دل افگار بود	وعدۂ حق بے گماں آید ہمی
آستیں اندر کفِ مایوس بود	از کرم دامن فشاں آید ہمی
آں، دعائے دل ز شوقِ بے قرار	از لبِ پیر و جواں آید ہمی
باز بکشاید درِ علم و ہنر	فاتحِ نصرت نشاں آید ہمی
بود پیکر، آں مگر بے روح بود	سوئے پیکر شکلِ جاں آید ہمی
کشتِ ما بے آب وہم بے تاب بود	ابر وہم گوہر چکاں آید ہمی
تشنگی لب بہ جاں آوردہ بود	رحمتِ حق بے گماں آید ہمی
شیوۂ حق ناشناساں را بگو	رہنمائے گمرہاں آید ہمی
پیش گوئی سلیماں زندہ باد	از نہاں اندر میاں آید ہمی
نورِ چشم و دیدۂ اسحٰق خاں	یعنی فخر دودماں آید ہمی
آنچہ شد در طالعِ قوم عزیز	باز سوئے ما ہماں آید ہمی
ایّد اللہ بنصرہٖ را شنو	بر زبانم ہر زماں آید ہمی
سوئے بزم دیدۂ نظارگی	شمعِ نور دل کشاں آید ہمی
آمدہ آں قدردانِ علم و فن	ہر نفس ایں بر زباں آید ہمی
آمدہ شمعِ شبستانِ ہمم	چوں نہ پروانہ دواں آید ہمی

مژدہ اے یاراں بہر بزمِ شما
کیفی معجز سلاں آید ہمی

۱؎ بوزن وقافیہ نظم ....

خاص مصنف کے ہے

مسلم یونیورسٹی

لٹن لائبریری کے اُردو مخطوطات

(از جناب مولوی عبد الشاہد خاں صاحب شروانی)

لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اپنے عربی، فارسی اور اُردو قلمی نوادر کی وجہ سے بڑی اہمیت کی مالک اور دُور ونزدیک مشہور ہے۔ مولوی سبحان اللہ خاں گورکھپوری، مولوی عبد السلام خاں، مولوی محمد عثمان الہ آبادی (والد ماجد شاہ محمد سلیمان مرحوم سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی) اور حضرتِ احسن مارہروی وغیرہم کے کتاب خانے بھی یہیں آ گئے ہیں، ان میں بھی قلمی نادرات کی کمی نہیں۔ سیّد بشیر الدین صاحب لائبریرین کے زیر نگرانی جناب مولوی عبد الشاہد خاں صاحب شروانی مولف الثورة الہندیہ (باغی ہندوستان) واور نٹیلسٹ لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے سب سے پہلے لائبریری کے اپنے اُردو مخطوطات پیش کئے ہیں۔ اس کے بعد دوسرے متعلقہ کتب خانوں کے "اُردو مخطوطات" ہدیۂ ناظرین ہوتے رہیں گے۔ یہ سلسلہ پسند کیا گیا تو عربی و فارسی مخطوطات بھی ملاحظہ میں لائے جا سکیں گے۔ مندرجہ ذیل کتب میں سے اکثر مطبوعہ ہیں، اِسی لئے کسی خصوصیت کے بغیر مختصر تذکرہ ہی سے کام لیا گیا ہے۔

سیّد الطاف علی بریلوی

ادبِ منظومات

شمارہ	نام کتاب	نام مصنّف	کیفیت
۱	برکھا رت اور مناظرۂ رحم و انصاف	شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی	حالی کی بلند پایہ نظمیں ہیں، خوش خط لکھی ہوئی اور چھوٹی تقطیع ہے۔

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۲	بیاض	شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی	مختلف شعراء کے اُردو، فارسی کلام کا مجموعہ ہے، خط بھی مختلف ہیں۔ دو چار مقام پر "بقلم رام نرائن" تحریر ہے۔
۳	پوتھی رامائن	״	عہدِ شاہ عالم بادشاہ عرف عالی گوہر، میں ۶ جمادی الآخری سنہ ۴۳ھ کو جین سکھ نے نقل ختم کی ہے۔ چند اجزاء لالہ خوب لال نے بھی لکھے ہیں۔ خط اوسط پختہ، کاغذ وصل شدہ صفحات ۲۰۲۔ سنہ ۴۳ھ کے آگے چہل و چہارم بھی لکھا ہے جس کا سبب یہ کہ سنہ ۴۴ھ سالِ اختتام ہے۔
۴	دیوان آتش	خواجہ حیدر علی آتش	خط معمولی، کاغذ وصل شدہ۔ ناقص الآخر ہے، سنہ ۱۲۵۵ھ میں سید امید علی واسطی نے بمقام اٹاوہ منشی عبد الحکیم صاحب کی فرمائش پر نقل کیا ہے۔ آتش کا انتقال سنہ ۱۲۶۳ھ میں ہوا ہے اس کے یہ معنی ہوئے کہ ان کی زندگی میں ہی لکھا گیا ہے۔
۵	دیوان حشم	حشم	۸۳ صفحات ہیں، خط صاف معمولی، سنہ ۱۲۵۶ھ کا لکھا ہوا ہے بعض اشعار سے معلوم ہوا کہ دوبار طبع ہو چکا ہے آخر میں دو فارسی کی غزلیں بھی درج ہیں۔
۶	دیوانِ ذکی	شیخ مہدی علی خاں ذکی مرادآبادی	۲۴ جمادی الآخری سنہ ۱۲۶۴ھ کو شروع کر کے ۲۵ رجب ۱۲۶۴ھ کو ایک ماہ کے اندر، نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ کے نسخہ کتاب خانے سے حسین فدا بہ تحسین نے نقل کیا ہے۔ خط معمولی پختہ ۲۶۲ صفحات۔ زبان شستہ ہے۔ ایک صدی پہلے کی زبان تقریباً موجودہ مروجہ زبان ہی معلوم ہوتی ہے۔
۷	دیوانِ سودا	مرزا محمد رفیع سودا	خط پختہ معمولی، کاغذ وصل شدہ، سرورق پر محمد حمید اللہ کے دستخط اور ۱۳ر سنہ ۳۶ء تاریخ پڑی ہے۔
۸	ریاض المصطفیٰ	محمد تفضل حسین خاں میرٹھی	مرتب نے سنہ ۱۲۷۷ھ میں شعراء قدیم و جدید کا نعتیہ کلام، ردیف وار جمع کر کے کتابی شکل دی ہے۔ معروف و غیر معروف

<table>
<tr><th>ارہ</th><th>نام کتاب</th><th>نام مصنّف</th><th>کیفیت</th></tr>
<tr><td></td><td></td><td></td><td>سب ہی قسم کے شعر انظر آتے ہیں۔ قصائد و غزلیات وغیرہا مختلف
اصناف سخن کو بالترتیب جمع کیا گیا ہے اور ہر ایک ردیف و قافیہ
کے مختلف شعراء کے کلام کو ایک ہی جگہ رکھا ہے۔ اس میں شک
نہیں گلدستۂ عجیب بہار دکھا رہا ہے۔ مرتب کا حسنِ مذاق
اور والہانہ نعتی و شوق قابلِ داد ہے۔ "ریاض المصطفیٰ" ۱۲۷۷ھ
تاریخی نام ہے۔</td></tr>
<tr><td></td><td>قصۂ یوسف زلیخا</td><td>مولوی راحت</td><td>مضمون نام سے ظاہر ہے۔ تقطیع خرد۔ صاف خط۔ ۸۸ صفحات
۱۲۵۶ھ میں شیخ حسین بخش نے کتابت کی ہے۔ اس مثنوی کی زبان
تقریباً موجودہ مروجہ زبان ہی معلوم ہوتی ہے۔</td></tr>
<tr><td>۱۰</td><td>کلیاتِ سودا</td><td>مرزا محمد رفیع سودا</td><td>لمبی تقطیع کے ۵۲۴ صفحات ہیں۔ خط معمولی ہے۔</td></tr>
<tr><td>۱۱</td><td>کلیاتِ مومن</td><td>حکیم مومن خاں</td><td>خط پاکیزہ۔ اکثر کاغذ وصل شدہ۔ غزلیات، مثنویات وغیرہا پر
مشتمل ہے۔ خاتمہ پر "غرہ محرم الحرام ۲۵ سنہ جلوسی از خامۂ خط
بندہ جیون لال کایستھ بوقت شام بانجام رسید" تحریر ہے۔
غالباً یہ اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں لکھا گیا ہے۔ اکبر شاہ ۳۲ سال تک
تخت نشین رہے ۱۸۳۷ء / ۱۲۵۳ھ میں وفات پائی۔ اس حساب سے
۲۵ سنِ جلوسی مطابق ۱۸۳۴ء / ۱۲۴۹ھ ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ
ہوا کہ شاعر کے زمانے ہی میں لکھا گیا ہے۔ مومن کا انتقال ۱۸۵۲ء / ۱۲۶۸ھ
میں یعنی قمری حساب سے ۵۳ سال کی عمر میں کوٹھے سے گر کر ہوا۔
۱۲۱۵ھ میں پیدائش ہوئی تھی۔ بہادر شاہ ظفر کی مدتِ حکومت
کل بیس سال ہے اس لئے ۲۵ سنہ جلوسی کا سوال وہاں
پیدا ہی نہیں ہوتا۔ مومن کی عمر اس وقت ۳۵ سال کی
ہوتی ہے۔ مومن خاں کی ذہانت و طبّاعی اور علامہ</td></tr>
</table>

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
،			فضل حق خیرآبادی، مرزا غالب، مفتی صدرالدین خاں آزردہ اور امام بخش صہبائی وغیرہم جیسے اکابر و افاضل کی ہم نشینی وصحبت نے اس عمر سے بہت پہلے ہی صاحب کلیات و دیوان بنا دیا تھا۔ اس لحاظ سے یہ نسخہ کافی اہمیت رکھتا ہے۔
۱۲	مثنوی میر حسن	میر غلام حسن حسن	لالہ مان سنگھ کی پیش کش کے لئے فقیر راج سنگھ نے ۲۱ شعبان ۱۲۰۶ھ مطابق ۳۳ سنہ جلوس شاہ عالم بادشاہ غازی، نقل کی ہے۔ خط صاف اوسط پختہ۔
۱۳	مثنوی نل دمن	رائے بھگونت رائے کاکوروی	۲۳ فروری ۱۸۵۶ء کی لکھی ہوئی ہے۔ ۱۳۲ صفحات۔ خط معمولی پختہ، زبان غنیمت۔

تفسیر

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۱۴	تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علیٰ ملۃ الاسلام	سر سید احمد خاں	کتاب کے مباحث نام سے ظاہر ہیں، سید صاحب ہی کے قلم کا لکھا ہوا ہے۔ یہ کتاب کا حصہ سوم ہے۔ ۱۱۴ صفحات پر مشتمل ہے۔
۱۵	ترقیم فی قصۃ اصحاب الکہف والرقیم	"	واقعہ سے متعلق مرتب کتاب ہے، ۹۰ صفحات پر مشتمل ہے عربی، اردو دونوں عبارتیں خوش خط ہیں۔ آخر میں مسٹر ایس بارنگ گولڈ ایم اے کی کتاب "کیوریس متھس آف دی مڈل ایجز" کا ترجمہ بھی شامل ہے ۱۸۹۰ء سن کتابت ہے۔
۱۶	تفسیر وہابیہ (جلد دوم)	..	سورۂ اعراف سے سورۂ کہف تک کی تفسیر ہے خط جلی معمولی، کاتب و مصنف و سن کتابت سب غائب۔ بہت پرانی اردو زبان استعمال کی گئی ہے۔ "تمہاری" کی جگہ "تمہاریاں"۔ "وہ" کی جگہ "او"۔ "تمکو" کی جگہ "تمکون" "چیزوں" کی جگہ "چیزان" اور اسی قسم کے دوسرے صدہا

کیفیت	نام مصنف	نام کتاب	شمارہ
الفاظ مستعمل ہوئے ہیں۔ مختصر تفسیر ہے بلکہ ترجمہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ سرورق پر "مالک این تفسیر وہابیہ میر نظام الدین علی خاں است" تحریر ہے۔			
سرسید مرحوم کی تفسیر القرآن پر نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں سے مراسلات کا مجموعہ ہے۔ نواب صاحب کے اعتراضات و شبہات کے جوابات دینے کی کوشش کی ہے۔ خط صاف ہے۔ آخر میں شکستہ خط میں بعض انہیں خطوط کی نقل ہے۔ رسالہ کے آخر میں دعار وندار کے لغوی معنی اور ان کے ترادف پر قرآنی آیات سے استشہاد کیا گیا ہے۔ دعار کی حقیقت پر حدیث سے استدلال کیا ہے۔ آخر میں تقریباً تمام قرآنی دعائیں نقل کر دی ہیں۔ رسم الخط سید صاحب کا نہیں معلوم ہوتا۔ البتہ دستخط کہیں کہیں موصوف ہی کے معلوم ہوتے ہیں۔	سرسید احمد خاں	رسالہ تحریر فی اصول التفسیر و رسالہ الدعار والندار	۱۷
اصحاب کہف سے متعلق مسودہ ہے۔ اس میں اصحاب کہف کی تعداد، کہف و رقیم کے معنی اور اس سے مراد، نام بادشاہِ عہد ان کا مذہب اور دوسری ضروری معلومات جمع کی گئی ہیں۔ آخر میں اسی سے متعلق بعض تفاسیر اور کتب سیر کی عبارتیں درج ہیں۔	"	قصۂ اصحابِ کہف	۱۸
سرسید مرحوم نے تفسیر قرآن کے سلسلہ میں واقعۂ معراج سے متعلق آیات و احادیث اور روایات کو جمع کیا ہے۔	"	یادداشت متعلق تفسیر معراج	۱۹

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت

فقہ

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۲۰	تحفۃ الاکرام فی جواز المواکلۃ منہ الکتابی فی دین الاسلام	مولوی اکرام رسول میدنی پوری ایسٹرا اسسٹنٹ کلکٹر بھدرک	یہود و نصاریٰ کے ساتھ کھانا پینا مذہبی طور پر جائز ثابت کیا ہے، ۴۳ صفحات ہیں، کافی بدخط ہے۔

کلام

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۲۱	بقائے روح اور بعث و نشر (ترجمہ گرانٹ الن)	”	مضمون نام سے ظاہر ہے۔ ۲۰ صفحہ کا رسالہ ہے۔ خط صاف پختہ ہے، خلاصہ یہ ہے کہ حشر جسد سب سے پرانی صورت ہے اور بقائے روح کا اعتقاد بعد میں پیدا ہوا ہے۔
۲۲	رسالۂ ہو الموجود	سر سید احمد خاں	خدا کی علّیت اور اس کے صفات پر فلسفیانہ انداز میں بحث کی ہے ۲۰ صفحات کا رسالہ ہے۔

تصوّف

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۲۳	ہادیٔ الناظرین ترجمہ آداب الصالحین	مولوی محمد قطب الدین	حضرت شاہ عبدالحق محدّث دہلوی المتوفی ۱۰۵۲ھ کی کتاب آداب الصالحین کا ترجمہ ہے۔ پرانی زبان مستعمل ہے۔ یہ کتاب آداب طعام، نکاح، صحبت، حق اسلام و قرابت، گوشہ نشینی، سفر، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور دوسرے امور پر مشتمل ہے۔ مترجم نے کہیں کہیں ف لکھ کر فائدے بھی بڑھائے ہیں۔ آخر میں شاہ صاحبؒ کے لوحِ مزار کے کتبہ کا ترجمہ بھی درج کر دیا ہے۔ خط شکستہ مگر صاف ہے۔

تعلیم

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۲۴	آرٹکل	سر سید احمد خاں	اِس مضمون میں مسلمانوں کا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے بعد

کیفیت	نام مصنف	نام کتاب	شمارہ
گورنمنٹ کا وفادار بننا اور بنا رہنا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس کو باغیوں کی جماعت بتلایا ہے۔ مساوی حقوق طلبی کے سوال پر کانگریس کے صدر کے نام حاجی محمد اسمٰعیل خاں کے خط کا تذکرہ بھی ہے کہ کونسلوں، میونسپلٹیوں اور لوکل بورڈوں میں ہندو اور مسلمان بہ تعداد مساوی منتخب کئے جائیں۔ ۱۲ صفحات کا رسالہ ہے۔			
اجلاس پنجم محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ الہ آباد میں "کم عمر مسلمان بچوں کی تعلیم" پر ان مضمون لکھا مطلوب ہوا تھا انعام دو سو روپیہ رکھا گیا تھا اور اس کے لئے ۱۷ اکتوبر ۱۸۹۱ء کو سید احمد خاں سیکریٹری کانفرنس کی طرف سے اشتہار بھی شائع ہوا تھا۔ اسی پر عصمت اللہ صاحب نے ۱۳۶ صفحات کی کتاب مرتب کرکے سیکریٹری صاحب کے پاس اپنے خط مورخہ ۲۹ جون ۱۸۹۲ء کے ساتھ بھیجی (یہ خط بھی چسپاں ہے) مقرر کردہ کمیٹی نے اُس کو پڑھ کر حسب مقصد نہ پاتے ہوئے محنت کا لحاظ کرکے دو سو کے بجائے پچاس روپیہ کے انعام کی سفارش کی ہے۔ آخر میں ارکان کمیٹی (کرامت حسین، ذکاء اللہ محمد بشیر الدین ایڈیٹر نجم الاخبار) کی آراء درج ہیں۔ آخر الذکر نے ایک مستقل و مبسوط تنقید کر ڈالی ہے۔	مفتی عصمت اللہ میرٹھ	کم عمر مسلمان بچوں کی تعلیم	۲۵
نواب محسن الملک نے الہ آباد کے اجلاس پنجم میں "تعلیم مسلمانان" پر لیکچر دیا تھا۔ اس میں مسلمانوں کے تنزل کے پانچ اسباب بتائے تھے (۱) سلطنت جمہوری کا نہ ہونا (۲) مذہب میں اختلاف پیدا ہو جانا (۳) مسلمانوں میں آزادی کا نہ ہونا۔ (۴) تعلیم کی کمی (۵) مذہب میں غلطیوں کا بڑھ جانا۔	عبد السلام	نواب محسن الملک کے لیکچر "تعلیم مسلمانان" پر تنقید	۲۶

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
			ساتھ ہی مسلمانوں کی ترقی میں مذہب کو سدِّ راہ بتایا تھا۔ اسپر عبدالسلام صاحب نے فاضلانہ تنقید کی ہے۔ اپنے ایک خط کے ساتھ جو آخر میں چسپاں ہے۔ سیّد صاحب کے پاس اناؤسی یہ مضمون بھیجا، پانچوں اسباب پر تنقید کرتے ہوئے ہر جگہ مذہب کا بول بالا رکھا ہے۔ ایک بات بڑے مزے کی لکھی ہے "اہلِ یورپ کا استاد علم ہے مگر اہلِ اسلام کا استاد مذہب ہے"۔ یہ رسالہ لمبی تقطیع پر ۷ صفحات کا ہے۔ خط صاف ہے۔

سیر و سوانح

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۲۷	سلطان عبدالقادر [illegible]	..	امیر عبدالقادر المتوفی ۱۸۸۸ء کی سوانح حیات ہے۔ ۳۶ صفحات ہیں۔
۲۸	سیرۃ فریدیہ	سرسیّد احمد خاں	سرسیّد مرحوم نے اپنے نانا نواب دبیرالدولہ امین الملک خواجہ فریدالدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ وزیر اکبر شاہ ثانی کے حالاتِ زندگی ۶۵ صفحات میں لکھے ہیں۔

موسیقی

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۲۹	کتاب در فن موسیقی	..	۵۱۲ صفحات، کاغذ وصل شدہ، خط پختہ معمولی ناقص الاول، محررہ ۴ جمادی الاولیٰ ۲۳ سنہ عہد محمد شاہ بادشاہ، ہندی زبان میں ۲۸۹۶ راگ اور گیت ہیں۔

تاریخ

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۳۰	انتخاب حالات	..	نہایت خوشخط صفحات ۲۶۱ سید اوصاف علی مشہور خوشنویس

شمارہ	نام کتاب	نام مصنّف	کیفیت
	نجیب الدولہ	..	علی گڑھ نے لٹن لائبریری کے لئے نقل کی ہے۔ ۲۲ مارچ ۱۹۴۳ء خاتمہ پر درج ہے، اس تاریخ کا مسودہ جس کی یہ نقل ہے لائبریری میں موجود ہے۔ نہایت بوسیدہ حالت میں ہے، حاشیہ پر کاغذ گل گیا ہے۔ خط شکستہ اور خراب ہے۔ لہ
۳۱	تاریخ دلیر جنگی	احمد علی خاں	۳۸۹ صفحات پر مشتمل ۱۲۶۴ھ میں تالیف ہوئی ہے۔ خط صاف اور اوسط درجہ کا ہے۔ اس میں ریاست شاہ نور کے ناظمان کی دولت و حکومت اور فرماں روائی و شجاعت کا تذکرہ ہے۔ نواب دلیر خاں بہادر دلیر جنگ کی فرمائش پر لکھی گئی ہے۔
۳۲	تحفۃ الملوک (ترجمہ تاریخ فرشتہ)	حیدر علی سہسوانی	مسٹر ڈینزل ابٹسن قائم مقام ڈائرکٹر ممالک پنجاب کی ہدایت پر حیدر علی سہسوانی صاحب "سلطان التواریخ" نے تاریخ فرشتہ کے پہلے اور دوسرے مقالے کو جن میں سلاطین لاہور و دہلی کے مفصل حالات ہیں، ترجمہ کیا ہے دو باب اور چند فصلوں میں منقسم کرکے تحفۃ الملوک اس کا نام رکھا۔ آخر میں ۹ صفحات از ۶۶۱ تا ۶۶۹ نورالدین جہانگیر سے لے کر سراج الدین بہادر شاہ ظفر آخری تاجدار مغلیہ کے حالات سیر المتاخرین اور دوسری کتب تواریخ سے مترجم نے بڑھا دیئے ہیں، صفحات ۶۶۹۔ خط اوسط پختہ۔ نام کاتب اور سن کتابت درج نہیں۔
۳۳	ترجمہ کتاب تواریخ فارس (جلد چہارم)	..	رولن صاحب کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ ناقص الآخر ہے۔ تیرہ سال کی سرگزشت درج ہے۔ یونان وغیرہ کا جنگی تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔

لہ یہ "نجیب التواریخ" مولفہ مرزا نصیر محمد خاں بحالات خاندان نواب نجیب الدولہ ہے۔ (مدیر)

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۳۴	تواریخ ہندی	..	۲۹۹ صفحات پر مشتمل، بخط اوسط صاف، مصنف اور کاتب کا نام درج نہیں۔ سنہ ۱۲۹۷ھ کی لکھی ہوئی ہے۔ حالات حضرت آدم و سرور کائنات علیہما السلام بھی درج ہیں۔ ہندستان کے صوبوں کا تفصیلی ذکر، سلاطین دکن کا تذکرہ بھی ہے۔ انگریزوں کے تسلطِ دکن کا بھی کچھ حال ہے۔
۳۵	سرسید کی کتابِ یادداشت	سرسید احمد خاں	سرسید نے تصانیف کی سہولت کے لئے یادداشتیں مختلف کتابوں سے جمع کی ہیں۔ تاریخ طبری، ترجمہ فارسی، الدرۃ المکللہ، صراط المستقیم، شرح سفر السعادۃ، العقود اللؤلؤیہ، کے اقتباسات نظر پڑے۔ شروع میں از حضرت آدم تا سرکارِ دوعالم علیہما السلام شجرہ درج ہے، ۴۰ واسطے درمیان میں ہیں۔ صرف آٹھ ورق میں اردو، فارسی، عربی عبارتیں ہیں۔ باقی پوری کتاب میں انگریزی نوٹس ہیں۔ مسٹر ظفر عمر نے ۲۳ دسمبر ۱۹۳۹ء کو لائبریری کے لئے عنایت فرمائی۔
۳۶	کاغذات متعلق سرکشی ہائے ہندوستان	..	یہ مئی و جون ۱۸۵۷ء کے انقلاب ہندوستان کا روزنامچہ ہے جو ہر دو ایوان ہائے پارلیمنٹ میں حسب الحکم ملکہ وکٹوریہ پیش کیا گیا تھا۔ اس میں حکام کی رپورٹیں، وزیر ہند وغیرہ کی ہدایتیں۔ ہندوستانیوں کی وفاداری کی درخواستیں سب ہی کچھ تفصیل سے درج ہیں۔ آخر میں ۶۴ باشندگان کلکتہ کے دستخطوں سے ایک عرضی درج ہے جس میں وفاداری کا یقین دلایا گیا ہے، ان میں زمیندار، عہدیدار، مدرس و مولوی اور کلکتہ کے قاضی القضاۃ مولوی فضل الرحمن قاضی صدر کلکتہ اور مولوی عبدالباری

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
			قاہرہ، کلکتہ کے نام بھی نظر آئے۔ بخط صاف جلی۔ ۲۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔
۳۷	کتاب تاریخ	..	چوتھی صدی ہجری کے قرطبہ، اندلس وغیرہا کے حالات ہیں۔ ۳۲۰ھ سے ۳۷۹ھ تک حالات درج ہیں۔ خلیفہ تنذ مراللہ کا جگہ جگہ ذکر خیر ہے۔ کاتب و مصنف و سن کتابت کا پتہ نہیں ناقص الاول والآخر ہے۔
۳۸	گوجا کی بیرونی اور اندرونی تاریخ	..	عیسائی مذہب اور تہذیب و تمدن سے بحث کی گئی ہے۔ آخر میں ناقص ہے۔
۳۹	مسودہ ترجمہ قدیم تاریخ یونان	..	رولن صاحب کی قدیم زمانہ کی تاریخ کا ترجمہ ہے، ۱۴۴ صفحات کی ناقص الآخر کتاب ہے۔ مضمون نام سے ظاہر ہے تقریباً ہر صفحے پر بیاضیں ہیں یعنی جگہ چھوٹی ہوئی ہے۔
۴۰	مالگزاری صوبجات عہد اکبر، جہانگیر، شاہجہان عالمگیر، محمد شاد	..	مغلیہ عہد کی مال گزاری صوبہ وار درج ہے۔ ۲۴ صفحات ہیں۔
۴۱	مسلمانوں کے عہد حکومت میں حقیقتوں کی نوعیت، قانون ہندستان کے بموجب (باب دوم)	..	مصنف کا نام درج نہیں، خط شکست اور ناقابل ہے۔ ۴۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ حکومت، والیٔ ملک، زمیندار، اور کاشتکار، ان میں سے زمین کا اصلی مالک کون ہے۔ اس پر بحث کی گئی ہے۔ مغل بادشاہوں کا ہر دور میں تعامل بھی دکھایا گیا ہے۔ فقہ حنفی کی رو سے کاشتکار کو مالک قرار دیا ہے زمیندار صرف ایک واسطہ بیان کیا گیا ہے جسے ہر وقت درمیان سے ہٹایا جا سکتا ہے۔ کاشتکار کو حکومت بھی خاص وجوہ کے بغیر بے دخل نہیں کرا سکتی ہے۔

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۴۲	مبیضۂ اسباب سرکشی ہندستان	سرسید احمد خاں	انقلاب ۱۸۵۷ء کے پانچ اسباب بیان کئے ہیں :- (۱) غلط فہمیٔ رعایا (۲) اجرائے ناروا احکام و قوانین۔ (۳) حالاتِ رعایا سے ناواقفیت گورنمنٹ (۴) ترک امور ضروریہ (۵) بدانتظامیٔ فوج۔ اِس رسالہ میں ہندستانیوں کو خطاوار بتاتے ہوئے کسی منظم سازش سے انکار کیا ہے مسلمانوں کو گورنمنٹ کا مستامن بتاکر شرکتِ ہنگامہ میں قصوروار اور گنہگار مذہب ہونا ثابت کیا ہے۔ یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ ۱۸۵۵ء میں کلکتہ سے پادری جان ای ایڈمنڈ نے تمام سرکاری ہندستانی عہدیداروں کے نام گشتی چٹھی بھیجی تھی کہ "برٹش راج میں تمام ہندستان میں ایک عملداری ہوگئی ہے، تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہوگئی۔ ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمد و رفت ایک ہوگئی۔ مذہب بھی ایک چاہیے اِس لئے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ۔" صفحات ۱۰۳، خوشخط، سن کتابت و نام کاتب ندارد۔

خطبات

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۴۳	اسپیچ در تہنیت شصت سالہ سلطنت ملکہ وکٹوریہ	سرسید احمد خاں	مضمون نام سے ظاہر ہے۔ ۲۰ جون ۱۸۹۷ء کو ملکہ وکٹوریہ کی سلطنت شصت (۶۰) سالہ کی خوشی منانے اور مدرسہ (حال مسلم یونیورسٹی) کے در و دیوار پر چراغاں کرنے کیلئے چندہ کی اپیل کے سلسلہ میں جلسہ کیا گیا تھا۔ اس میں جو تقریر پڑھی گئی وہ کتابی شکل میں مرتب کی گئی ہے۔ اِس تقریر کا خلاصہ سلطنتِ برطانیہ کے استحکام اور بقاء و دوام کی خواہش

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
			سمجھنا چاہئے، ۱۶ صفحات پر نظریہ مندرج ہے۔
۴۴	اسپیچ نواب عماد الملک کانفرنس میرٹھ	عماد الدولہ مولوی سید حسین بلگرامی	سنہ ۱۸۹۶ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس یازدہم میرٹھ کی صدارت کرتے ہوئے نواب عماد الملک نے جو خطبۂ صدارت پڑھا تھا اسے کتابی شکل دیدی گئی ہے۔ اس خطبہ میں نواب صاحب نے مسلمانوں کو ہندوستان کی دوسری قوموں کے ساتھ اشتراک کرنے اور ان کی ترقی کو ملکی ترقی سمجھنے کی پُر زور الفاظ میں اپیل کی ہے۔ ساتھ ہی برٹش گورنمنٹ کے ساتھ ہر موقعہ پر وفاداری کا ثبوت پیش کرنا فرائض میں سے قرار دیا ہے۔ قوم کو کالج اور کانفرنس کی مالی اور اخلاقی امداد کی طرف توجہ دلائی ہے۔ مروجہ تعلیم کی ضمنی طور پر مذمت بھی کی ہے۔ الفاظ پُرشکوہ اور عبارت لیاقت سے استعمال کی گئی ہے۔ صاف اور جلی خط میں ۴۱ صفحات پر مشتمل ہے

صرف

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۴۵	فرائد الصرف	..	جلی قلم خوشخط ہے، ۲۰۹ صفحات ہیں۔ مضمون نام سے ظاہر ہے کتاب مبتدیوں کے لئے بہت مفید ہے۔ مصنف و کاتب کا نام اور سن کتابت درج نہیں۔ البتہ کتاب کی پشت پر مصنف کا نام مولوی سید نادر الدین پروفیسر معقولات و مددگار اول مدرس دارالعلوم سرکاری لکھا ہوا ہے۔

بلاغت

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۴۶	ترجمہ حدائق البلاغت	..	منشی لچھمن پرشاد مدرس سوم مدرسہ سرکار نے جولائی سنہ ۱۸۴۲ء میں

کیفیت	نام مصنف	نام کتاب	شمارہ
نقل کرائی ہے۔ میر شمس الدین فقیر المتوفی ۱۷۶۷ء کی فارسی کتاب خدائق البلاغت کا ترجمہ ہے۔ مسٹر بوترس پرنسپل مدارس شاہجہاں آباد (دہلی) نے مولانا امام بخش صہبائی مدرس اول فارسی سے ترجمہ خدائق البلاغت کی خواہش ظاہر کی۔ صہبائی نے مترجم کو اس پر مامور کیا۔ مترجم نے مفید معلومات اور اُردو اشعار کا جابجا اضافہ بھی کر دیا ہے ۱۲۵۸ھ ۱۸۴۲ء میں ترجمہ کیا گیا۔ افسوس مترجم نے اپنا نام نہیں لکھا۔ نسخہ خدائق البلاغت فارسی قلمی بھی بقلم میر نواب موزوں محررہ ۱۲۶۳ھ لنٹن لائبریری میں موجود ہے۔			

عروض

کیفیت	نام مصنف	نام کتاب	شمارہ
عروض میں مفید رسالہ ہے۔ آخر میں فن تاریخ گوئی پر بھی کافی معلومات ہیں۔ شروع میں شاہزادہ وکٹر ولی عہد برطانیہ کی آمد لکھنؤ ۱۸۹۰ء پر قطعہ تاریخ ہے ایسی ! قسمت مری شہزادہٗ وکٹر آئے ۱۸ ۶ ۹۰	مولوی سلامت اللہ	رسالہ عروض	۴۷

قواعد

کیفیت	نام مصنف	نام کتاب	شمارہ
۱۶۰ صفحات کی کتاب ہے۔ خط مائل بقرار اور صاف ہے۔ مضمون نام سے ظاہر ہے، اس کو سمجھ کر دیکھا جائے تو استاد کا کام دے سکتی ہے۔ عبرانی زبان پر انسان اس کی مدد سے کافی عبور حاصل کر سکتا ہے۔ زبان سلیس استعمال کی گئی ہے۔	..	قواعد زبان عبرانی	۴۸

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۴۹	اصول سیاستِ مدن	رائے بہادر پنڈت دھرم نرائن دہلوی	رائے بہادر صاحب نے نہایت فصیح اور سلیس اُردو میں مسٹر جون سٹورارٹ مل کی کتاب کے مقالۂ اولیٰ کا ترجمہ کیا ہے۔ تیرہ بابوں اور ۴۶۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ خط پختہ صاف اور بہتر ہے بحث نام سے ظاہر ہے "محنت اور کفایت ذریعہ ہے سعادت کا" اس کا خلاصہ ہے۔ مترجم کی قابلیت اور زبان دانی برادرانِ وطن کے لئے لائق توجہ ہے۔ عربی، فارسی الفاظ کا استعمال، موضوع کی وسعت معلومات پر دال ہے۔ اپریل ۱۸۶۸ء میں بعد اختتام سرسید احمد خاں مرحوم کو پیش کی گئی ہے۔ ڈھائی سال میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

زراعت

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۵۰	چھوارے کی پیداوار ہندستان میں	ڈاکٹر بونیو سول سرجن اٹاوہ	مصنف نے اس درخت کے اگانے اور پھلوں کی حفاظت کا طریقہ اور اُن کے فوائد تفصیل سے بیان کئے ہیں ۵ صفر ۱۳۱۸ھ مطابق ۴ جون ۱۹۰۰ء کو اس کی کتابت ہوئی ہے خط معمولی ہے۔ ۴۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ خشک آب وہوا اس کے لئے بہت مفید ہے۔ کم محنت سے زیادہ فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ سید عبدالنبی نے نقل کیا ہے۔

حساب

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۵۱	اصولِ حساب	..	مضمون نام سے ظاہر ہے۔ ۳۳۳ صفحات پر مشتمل ہے۔

قصص

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۵۲	باغ وبہار	میر امن دہلوی	خط معمولی خام، میر امن دہلوی نے مسٹر جان گلکرسٹ کی

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
			فرمائش پر قصہ چہار درویش مولفہ حضرت امیر خسرو کا ترجمہ ۱۸۰۱ء ۱۲۱۵ھ میں شروع کرکے ۱۲۱۷ھ ۱۸۰۲ء میں ختم کیا۔ تاریخی نام "باغ و بہار" رکھا۔ ڈیڑھ سو سال قبل ترجمہ ہوا ہے مگر موجودہ مروجہ زبان کی کافی جھلک پائی جاتی ہے۔ کاغذ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سو سال قبل کا لکھا ہوا نسخہ ہے۔ نام کاتب و سن کتابت درج نہیں۔

ہیئت

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۵۳	رسالہ علم ہیئت	پنڈت رادہا کشن	۱۸۶۲ء میں پنڈت رادہا کشن نے انگریزی سے اردو میں حسب حکم مسٹر ایچ لیپوردین انڈر سیکریٹری گورنمنٹ ہند، ترجمہ کیا ہے۔ افلاک، کواکب، ثوابت، سیارات اور بروج کا تفصیلی بیان ہے۔ جدید تحقیقات اور مفید معلومات سے مملو ہے، ۲۹۹ صفحات ہیں۔ خط معمولی مگر صاف ہے۔ زبان صاف اور سلیس ہے۔
۵۴	شمسی حسابات	مولوی نظام الدین حسن بی۔ اے	مولوی صاحب نے معیار وقت بلدہ لکھنؤ تیار کیا تھا جو شائع ہوا۔ اسی سے بلدہ علی گڑھ کا معیار وقت ترتیب دے لیا گیا۔ اوقات افطار و سحر بھی بتا دیئے گئے۔ سال بھر کا، ہر مہینہ کا علیحدہ علیحدہ نقشہ ہے۔ یہ نقشہ ۱۹۱۵ء کا ہے۔
۵۵	قانون مسعودی (ترجمہ اردو)	شمس العلماء محمد ابن الدین عباسی۔ چڑیا کوٹی	قانون مسعودی کے مقالہ اول و ثانیہ کا ترجمہ ہے۔ ناقص الاول والآخر ہے۔ اس میں سنین و شہور عرب و فارس وغیرہم کے استخراج کے طریقے بھی بتائے گئے ہیں۔ مترجم کے ہاتھ کا مسودہ ہے۔ پہلے مقالے کے ۱۲۹ صفحات ہیں۔ کافی حصہ

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
			دوسرے مقالہ کا بھی ہے پھر مختلف مسودات ہیں۔
۵۶	قانون مسعودی (ترجمہ اُردو)	محمد المہدی الجعفری جونپوری	آٹھویں مقالہ کا ترجمہ ۱۳ر فروری ۱۹۴۱ء کو ختم کیا ہے۔ وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی سر شاہ محمد سلیمان کی ہدایت پر ترجمہ کیا گیا ہے۔ خط معمولی خام صاف، صفحات ۱۰۵۔
۵۷	قانون مسعودی (ترجمہ اُردو) ۲ جلد	مولوی یعقوب بخش راغب بدایونی	ڈاکٹر شاہ سر محمد سلیمان وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ہدایت پر مترجم نے ۱۵ر مئی ۱۹۴۰ء کو تیسرے مقالہ کا ترجمہ ختم کیا۔ اس کے بعد ۹ و ۱۰ و ۱۱ مقالوں کا ترجمہ بھی ۱۶ر دسمبر ۱۹۴۰ء تک ختم کیا۔ اصل مسودہ معلوم ہوتا ہے۔ خط معمولی شکستہ اور گنجلک ترجمہ کی دشواری پیش آنے کی وجہ سے ہر صفحہ پر قلم زدکی ہوئی سطریں اور عبارتیں پائی جاتی ہیں صفحات ۲۵۵ ترجمہ کی دشواری پیش آنے کی وجہ سے ہر صفحہ پر قلم زدکی ہوئی سطریں اور عبارتیں پائی جاتی ہیں۔ خط معمولی شکستہ گنجلک صفحات ۲۵۵۔ اصل کتاب عربی میں ابو الریحان البیرونی کی علم ہیئت میں معرکۃ الآراء تصنیف ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا محمد حبیب الرحمن خاں شروانی کے اس مکتوب سے کیجئے جو لٹن لائبریری کے قلمی نوادر کے رجسٹر پہ چسپاں ہے۔ "قانون مسعودی کا ایک نادر نسخہ لٹن لائبریری . . . تھا۔ قدیم خط نسخ میں لکھا ہوا۔ کاغذ چکنا ہلکا گلابی، ٹائٹل پیج پر شاہی مہریں تھیں۔ بہت پرانا لکھا ہوا نسخہ تھا۔ نواب اسحاق خاں مرحوم کی سیکریٹری شپ کے زمانہ میں گم ہوا۔ نواب صاحب نے مجھ کو لکھا تو جواب میں میں نے

کیفیت	نام مصنف	نام کتاب	شمارہ
یہ الفاظ لکھے :- "اگر نسخہ تلف ہوگیا تو علمی دنیا کا حادثہ ہے ۔ دوسری جگہ محفوظ ہے تو ہمارے کالج کا حادثہ ہے " حبیب الرحمٰن خاں شروانی خدا کا شکر ہے کہ لائبریری میں ایک قدیم نسخہ خط نستعلیق اوسط درجہ صاف میں لکھا ہوا موجود ہے ۔ کاغذ کرم خوردہ ، وصل شدہ مگر اچھی حالت میں ہے ۔ افسوس ہے کاتب اور سن کتابت کا پتہ نہیں چلتا ۔ اس کے علاوہ ایک مکمل نسخہ گیارہ جلدوں میں گم شدہ نسخہ کی نقل موجود ہے سیّد اوصاف علی مشہور خوشنویس علی گڑھ نے ۱۹۱۳ء میں خط نسخ میں نہایت خوشخط لکھا ہے ۔ کسی صاحب نے اپنی بدخطی کا جابجا مظاہرہ کرکے اس نسخہ کو بگاڑ دیا ہے ۔ افسوس ہے کہ کتابت کے بعد اصل سے مقابلہ نہ ہو سکا تھا کہ وہ نسخہ گم ہوگیا ۔ گم شدہ نسخہ کی تسوید سے ابو الفتح نصر بن محمد بن ہبتہ اللہ نے سلخ ربیع الآخر ۵۶۲ھ موافق روز آبان ماہ اسفندارمذ ۵۵۶ یزدجردی میں فراغت حاصل کی تھی ۔ یہ ترجمہ سید اوصاف علی کے تحریر کردہ نسخہ سے کیا گیا ہے ۔ ایک عکسی نسخہ بھی نامکمل حالت میں موجود ہے لنڈن لائبریری بڑی خوش نصیب ہے کہ کئی نسخے اس نادر الوجود کتاب کے اس کے پاس محفوظ ہیں ۔ سلطان مسعود بن محمود غزنوی کے عہد میں لکھی گئی ہے ۔ اسی وجہ سے اس کا نام قانون مسعودی رکھا گیا ہے ۔			

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
			متفرقات
۵۸	دستور العمل تھانہ داران	..	مضمون نام سے ظاہر ہے۔ چھوٹی تقطیع پر ۳۳۶ صفحات کی کتاب ہے۔ خط معمولی، سطریں ٹیڑھی۔ کاغذ وصل شدہ ہے۔
۵۹	کتاب المواضع	..	علاقہ پنیم پو۔ وغیرہ کے دیہات کا تذکرہ ہے۔ قصبہ پنڈرادل سے اس کی ابتدا ہے اور موضع علی پور پر خاتمہ۔ کچھ مواضع کے عنوانات قائم کر کے چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ مواضع کی مالی حالت، رقبۂ کاشت وغیرہ کا تفصیلی ذکر ہے۔ اکثر دیہات فرمانی ہیں بعض خرید کردہ۔
	کتاب عین الحکمۃ	بابو گوپال چند گھوش ماسٹر ریاضی مشن کمپل گورکھپور	۵۶ صفحات پر مشتمل، ان مضامین مختلف کا مجموعہ ہے جو جلسہ ہائے "مسٹر دی کلب" میں مختلف اوقات میں پڑھے گئے۔ عنوانات حسب ذیل ہیں:- (۱) انسان مجبور ہے یا مختار، (۲) جسم اور بعد کا بیان، (۳) راز داری، (۴) صداقت اور راستی، (۵) دوسرے کی نسبت رائے قائم کرنا، (۶) ہوا کا بیان، (۷) مادی جسم کا بیان۔ (۸) زمین کی اصل و ابتداء، (۹) ابطال بطلان ذات باری۔ (۱۰) علت اول کا بیان، (۱۱) مذہب اور فلسفہ، (۱۲) خدا خلقت میں کس طرح موجود ہے، (۱۳) حصول اور شغلہ، (۱۴) عدم اور وجود کا بیان، (۱۵) سقراط کا حال، (۱۶) سقراط اور ڈکارٹس کی رائے، (۱۷) کپل اور شانک شاستر، (۱۸) عنصر کا بیان، (۱۹) شانک فلسفہ بیان علت اول، (۲۰) از روئے شانک فلسفہ روح کا وجود اور اس کی خاصیت، (۲۱) خلقت کا ہونا لازم تھا بجواب شانک شاستر، خط اور زبان دونوں پاکیزہ ہیں۔

شمارہ	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۶۱	مسل بابت مولوی عبداللہ انصاری	—	مولوی عبداللہ انصاری ناظم دینیات مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی موقوفی سے متعلق ہے۔ اس میں ایک خط حضرت استاذ العلماء مولانا محمد لطف اللہ صاحب ممبر کمیٹی کا بھی ہے جس میں مولانا عبداللہ کی تعریف اور ان پر اعتماد کا اظہار ہے۔ ۱۳۲۱ھ کا لکھا ہوا ہے۔ زبان بالکل آج کل کی مروجہ ہے۔ ۴۶ سال پہلے یہی زبان استعمال کی گئی ہے۔ ایک لفظ بھی ایسا مستعمل نہیں ہے جو اب متروک ہو۔
۶۲	مسل محکمہ بندوبست ریاست بھوپال	—	مضمون نام سے ظاہر ہے۔
۶۳	"	—	" " " بابت ۱۵-۱۳۱۴ھ
۶۴	"	—	" " " بابت ۱۳-۱۳۰۷ھ

عبدالشاہد خاں شروانی

تاریخی نوادر

سندھ قدیم میں ہندو مسلم تعلقات

(از جناب پنڈت بشیر الدین صاحب ایم اے اسلامیہ کالج شاہجہاں پور)
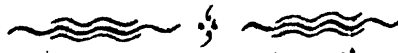
عہد عباسیہ میں سندھ فتح ہونے کے ۲۵، ۳۰ برس بعد ہی جب کہ بنو امیہ نہایت شان و شوکت کے ساتھ دمشق میں حکمراں تھے، سندھ کے اصلی باشندے پایہ تخت تک پہنچ کر سیاست میں بھی حصہ لینے لگے تھے۔ فوجی خدمت کے لئے تو سندھ کے بعض علاقے بہت ہی موزوں تھے چنانچہ قیقان کے جاٹ فوج میں بہت بھرتی ہوئے اور ۱۲۲ھ میں جب زید بن علی بن حسینؓ بن علیؓ کا واقعہ پیش آیا تو سرکاری فوج میں تین سو جوان قیقانی (سندھی) بھی تھے۔ جنھوں نے جناب موصوف کا محاصرہ کیا تھا اور پھر جناب موصوف کا وہ غلام[1] بھی سندھی تھا جس نے آن جناب کی قبر کا پتہ بتلایا۔" اسی طرح ۱۲۶ھ میں جب بنو امیہ کا گیارھواں خلیفہ ولید بن یزید بن عبد الملک قتل کیا گیا تو قاتلوں میں ایک شخص سندھی بھی تھا جس کا نام ابن زیاد بن ابی کیشہ ہے[2]

۱۶۹ھ میں جب حسین ابن علی بن حسن بن حسن مثنیٰ بن حسنؓ بن علیؓ بن ابی طالب نے

---

[1] قبر بتانے کے سلسلہ میں ایک دوسری روایت بھی مشہور ہے کہ جب زید بن علی زخموں سے چور رات کے وقت میدان جنگ سے پلٹے تو ان کی پیشانی میں ایک تیر پیوست تھا بہت تلاش کے بعد کسی گاؤں سے تیر نکالنے کے لئے حجام لایا گیا۔ اس سے زیدیوں نے اخفائے راز کا عہد لے کر تیر نکلوایا، ادھر اس نے تیر نکالا ادھر ان کی روح نفس عنصری سے نکل گئی۔ اس کے بعد کفن دفن میں وہ حجام برابر کا شریک رہا صبح کو اس نے یوسف بن عمر ثقفی (والی بصرہ) سالار فوج سے جاکر سارا حال کہدیا اور قبر کا نشان بتا دیا جو ایک راج بہے (نہر) میں بنائی گئی تھی اور جس کے اوپر پانی رواں تھا (مروج الذہب و معادن الجوہر صفحہ ۴۷) بہت ممکن ہے کہ اس نشان دہی میں سندھی غلام نے بھی برابر کا حصہ لیا ہو اس لئے یہ دونوں روائتیں اپنی جگہ پر صحیح ہو سکتی ہیں۔ (مؤلف)

[2] تاریخ سندھ صفحہ ۱۴۳ از سید ابو ظفر صاحب ندوی۔

خلیفہ ہادی کے تخت نشین ہونے پر مدینہ میں خروج کیا تو بعض ترک اور سندھی غلاموں نے حسین کا ساتھ دیا۔ یہ سندھی غلام برہمن نژاد تھے جو عبداللہ اُشتر کے مقتول ہونے پر ان کے لڑکے اور بیوی کے ہمراہ قید ہو کر بصرہ و بغداد ہوتے ہوئے مدینہ منوّرہ پہونچے تھے کیونکہ خلیفہ منصور نے ان سب کو رہنے کے لئے مدینہ منوّرہ بھیجدیا تھا۔ حسینؓ بن علی کی مکّہ معظمہ میں آکر بماہ ذیقعدہ ۱۶۹ھ عباسی لشکر سے آخری لڑائی ہوئی جس میں وہ شہید ہوگئے ان کے بعض ساتھی مارے گئے اور بعض کسی نہ کسی طرح بچ گئے۔ ان میں سے بعض سندھی بھی فرار ہو کر کسی نہ کسی طرح سندھ پہونچنے میں کامیاب ہوگئے۔ انہیں لوگوں کی اولاد ہے جو اپنے آپ کو حسینی برہمن کہتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے کربلا کے میدان میں حضرت امام حسین علیہ السلام کا ساتھ دیا تھا۔ کربلا کے میدان میں ان کا موجود ہونا تو سراسر غلط اور بے بنیاد ہے البتہ حسین بن علی بن حسنؓ مثلث کو امام عالی مقام سیّدنا امام حسینؓ کی جگہ سمجھ لیا گیا ہے۔ یہ حسینی برہمن آج بھی سندھ و پنجاب میں پائے جاتے ہیں اور ہندو مسلمانوں کے قدیمی ہمدردانہ تعلقات کا زندہ ثبوت ہیں [۵۱]

سندھ کے علمی تعلقات تو خلیفہ منصور ہی کے زمانہ سے بغداد سے قائم ہو چکے تھے اور خلیفہ ہارون رشید کے زمانہ میں تو اسے اور بھی ترقی ہوئی، ویسے بھی سندھ کے نومسلم دربار خلافت میں باریاب ہو کر اہم سیاسی امور میں حصّہ لینے لگے تھے چنانچہ خلیفہ امین الرشید بن ہارون رشید کے زمانہ میں ایک سندھی النسل "سندھی بن شاہک" وزارت کے عہدہ تک پہونچا۔ یہ خلیفہ کے مزاج میں بہت دخیل تھا [۵۲]

سندھی فوجوں کا عرب میں ہونا تو ۱۲۲ھ سے ثابت ہے جب کہ انھوں نے حضرت زیدؓ بن علی کو محصور کرنے میں حصّہ لیا۔ ۲۰۰ھ کے بعد یعنی خلیفہ معتصم کے زمانہ میں ان کی جماعت عرب کے اندر بہت طاقت پکڑ گئی اور بصرہ و واسط کے درمیان ان کا اتنا غلبہ ہو گیا کہ خلیفۂ وقت کو ان کی طاقت منتشر کرنے کی طرف خاص توجہ کرنی پڑی۔ چنانچہ مسعودی کے بقول "خلیفہ معتصم نے ان کو خراسان کے راستہ سے خانقین اور جلولا کے ملکوں میں اور شامی سرحد

---

[۵۱] بحوالہ تاریخ آئینہ حقیقت نما ج ۱ ص ۱۱۹، ۱۲۰

[۵۲] بتنبیہ واشراف ص ۲۳۸ و ص ۲۳۹ از مسعودی

کی طرف سے عین زر بہ کے ملک میں خارج کر دیا[۱]" اسی طرح اس کو ہندوستانیوں کے بحری جہازوں کو گرفتار کر کے جن میں ہندوستان کی طاقت ور فوج بھری ہوئی تھی اور ان کے قدم فارس اور عمان کے ساحلی مقامات پر پورے طور سے جم گئے تھے اِدھر اُدھر منتشر کرنا پڑا[۲]

سماجی تعلقات

مسلم فاتحین اور بالخصوص عرب جہاں بھی گئے اس ملک کو مستقلاً اپنا وطن بنا لیا۔ چنانچہ سندھ کو فتح کرنے کے بعد وہ وہیں رہ پڑے اور اپنی ہمسایہ ہندو و بدھ اقوام کے لئے اچھے دوست اور اچھے معلم ثابت ہوئے۔ آپس کے میل جول و نیز سیاسی تعلقات کی وجہ سے سب سے گہرا اثر ایک دوسرے کی زبان پر پڑا چنانچہ مسلمانوں نے سندھی اور ہندوؤں نے عربی زبان سیکھی[۳]۔ اس محبت و دوستی وہم آغوشی کا اثر آج بھی سندھی زبان کے رسم الخط اور خود سندھی زبان میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ سندھی زبان میں ماں کو اُمّو اور عربی میں اُم کہتے ہیں۔ سندھی زبان میں باپ کو اَبّو اور عربی میں اَبّ بولتے ہیں۔ بیوی کو سندھی میں صاجان اور عربی میں صاحبہ، سندھی میں بات کو گھال اور عربی میں قال کہتے ہیں۔ غرض اسی طرح ہزارہا الفاظ ہیں جو موجودہ سندھی زبان میں عربی کے بولے جاتے ہیں۔

ابنِ حوقل جب ہندوستان آیا ہے تو ہندو مسلمانوں کو ایک ساتھ رہتے ہوئے کم و بیش ڈھائی سو سال ہو چکے تھے۔ اس مدّت میں دونوں کے تمدّنوں کی آویزش سے ایک نئے تمدّن کی بنیاد پڑ چکی تھی جس کو ہم ہندی عربی تمدّن کہہ سکتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے تمدّن سے اس حد تک متاثر نہیں ہوئے جتنا کہ ہندوؤں نے ان کے تمدّن کے اثر کو قبول کیا تھا اور یہ ایک نفسیاتی قانون تھا جس کے ماتحت ایسا ہونا لازمی امر تھا کیونکہ مسلمان اوّل تو فاتح جماعت سے تعلق رکھتے تھے جس کا اثر سندھی مفتوحین پر پڑنا ایک بدیہی بات ہے۔ دوسرے مسلمانوں کا تمدّن اپنے زمانہ کا بہترین تمدّن تھا اور ان کی

---

[۱] تنبیہ و اشراف ص۲۴۸ و ص۲۴۹ از مسعودی

[۲] کتاب التنبیہ و اشراف ص۲۴۸

[۳] تاریخ سندھ ص۲۳۳ از سید ابوظفر صاحب ندوی۔

بہتر اور برتر معاشرت اس زمانہ کے لئے قابلِ تقلید تھی یہی وجہ ہے کہ نہ صرف سندھ بلکہ دنیا کے ہر گوشہ میں ان کی عفت وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ بہرحال سندھ میں ایک مدت تک ایک ساتھ رہنے سہنے کی وجہ سے دونوں میں اتحاد و یگانگت کے ساتھ ساتھ یکسانیت بھی پیدا ہو چلی تھی اور لباس و وضع قطع کے لحاظ سے دونوں ایک تھے چنانچہ ابن حوقل لکھتا ہے کہ یہاں (یعنی سندھ و ملتان میں) ہندو مسلمانوں کا لباس ایک ہے، بال بھی ایک ہی طرح رکھتے ہیں۔ ان کا لباس ازار اور کرتا ہے کیوں کہ اِن ملکوں میں گرمی سخت پڑتی ہے .... مگر تاجروں کا لباس قمیص اور چادر ہے جس طرح عراق اور فارس والوں کا ہے[۵۱]" اس کے علاوہ " یہاں کے مسلمان امراء ہندوؤں کی طرح کان میں سوراخ کراتے تھے[۵۲]" اور زیور پہننے لگے تھے۔ یہ غالباً ہندوؤں سے شادی بیاہ کا اثر تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ملتان و منصورہ صدہا قبائل کا منبع و مرکز رہے ہیں اور ان سے تعلق رکھنے والے سب کے سب عربی النسل سمجھے جاتے ہیں، یہ سب یقیناً عربی باپوں اور ہندی ماؤں کی اولاد ہیں۔ یہ عربی قومیں غزنوی دورِ حکومت میں پنجاب اور اس کے بعد تمام شمالی ہند میں پھیل گئیں۔ چنانچہ پنجاب کے 'اعوان' کشمیر کے 'کھلے' اور 'ببے' اور انہیں کی طرح 'ارائیں' اور 'ملتانی' بھی انہیں لوگوں میں سے ہیں، انہوں نے اپنے پیشوں کی وجہ سے اب اپنی حیثیت کو بہت کچھ گھٹا اور مٹا دیا ہے۔

مختصر یہ کہ عرب اپنی تلوار کے سایہ میں جس محبت و مدارات کو اپنے ساتھ لائے تھے وہ ہرگز ضائع نہیں ہوئی۔ ان میں سے ایک ایک شخص غالباً ایک ایک قوم کا مورث اعلیٰ بنا، اور ان قوموں نے ہندو مسلم تعلقات کو پائیدار و استوار بنانے میں وہ کام کیا کہ آج تک باوجود سخت کوششوں کے ہندو مسلم تعلقات کے جوڑ بند جدا کرنا بے حد دشوار ثابت ہو رہا ہے۔

تجارتی تعلقات

ہندو مسلمانوں کے برادرانہ تعلقات کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے میں عرب و سندھ کے تاجرانہ تعلقات کو بھی بڑا دخل ہے

---

۵۱ سفرنامہ ابن حوقل بحوالہ تاریخ سندھ ص۲۳۳

۵۲ احسن التقاسیم بشاری مقدسی۔ بحوالہ تاریخ سندھ ص۲۴۶

اس وقت تاریخی شواہد کی کمی کی وجہ سے یقین کے ساتھ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن گمان غالب ضرور ہے کہ عربی تاجروں نے جس طرح دنیا کے اور ممالک کی غیر مسلم آبادیوں کو متاثر کیا اور اس اثر کی وجہ سے وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوتی گئیں[1]۔ اسی طرح سندھ کے غیر مسلموں کو بھی اپنی راست بازی، ذہانت و لیاقت اور بہتر تہذیب سے متاثر کر کے اسلام کی طرف مائل کیا ہوگا۔

سندھ مسلمانوں کا مفتوحہ ملک تھا اس لئے ان کو تجارت کے لئے کاٹھیاواڑ، گجرات، مالابار، مدراس و لنکا وغیرہ کی بہ نسبت سندھ میں زیادہ آسانیاں میسر تھیں۔ اس کے علاوہ سندھ میں ان کی تجارت کو فروغ پانے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اور جگہ ان کی تجارت صرف بندرگاہ اور پایہ تخت تک محدود رہتی تھی۔ ان کا لایا ہوا مال ملکی تاجر اُن سے لے کر اندرون ملک میں پھیلاتے تھے لیکن سندھ میں عرب تاجر خود اپنا مال لے کر اِدھر اُدھر آتے جاتے رہتے تھے اور اس طرح بہت زیادہ نفع اٹھاتے تھے۔ تجارت کے لئے خشکی و تری کے دونوں راستے ان پر کشادہ تھے۔ سندھ کا علاقہ خشکی کے ذریعہ خراسان و ایران سے ملا ہوا ہے اور یہ آج کل کی طرح دونوں اسلامی ملک تھے انہیں ملکوں میں ہو کر سندھ کا تجارتی مال وسط ایشیا اور روس تک پہونچتا تھا۔ ابوزید سیرافی نے سندھ کے تجارتی راستوں[2] کا جو حال تحریر کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان تاجر سندھ کے ہر

---

[1] "پریچنگ آف اسلام" ص ۸۴، ۸۳ از ٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ۔

[2] خراسان جانے کے لئے ہند اور سندھ کے راستے قندھار پر مل جاتے ہیں اور وہاں سے خراسان جاتے ہیں خشکی سے عرب تاجروں کا قافلہ عراق سے کرمان ہوتا ہوا یا تو تیز مکران کی بندرگاہ میں پہنچتا تھا اور وہاں سے مکران کے پایہ تخت کیز (کیچ) چلا جاتا اور پھر وہاں سے چل کر جھبور یا پنج گور پہنچ جاتا اور جو شخص بندرگاہ یا پایہ تخت نہ جانا چاہے تو وہ کرمان سے کسر کند، پھلی پورہ، راسک وغیرہ ہوتے ہوئے پنج گور آجاتا، یہاں سے قزدار اور پھر کیز کانان (قلات) ہو کر قندھار جاتا۔ یہ مکران سے طوران کا راستہ ہوا جس کا پایہ تخت قزدار تھا۔ جو قافلہ بدھ کے ملک میں جانا چاہتا وہ قزدار سے گنداوی (قنداویل) چلا جاتا اور وہاں سے سیبی اور شال (کوئٹہ) ہوتا ہوا گندھار کی طرف نکل جاتا۔ اگر یہی قافلہ سندھ جانا چاہتا تو گنداوی سے سیوستان ہو کر منصورہ اور وہاں سے ملتان پہنچتا۔ (باقی بر صفحہ ۱۱۲)

گوشہ میں پھیلے ہوئے تھے اور اگر اُن کا جی چاہتا تھا تو بیرونِ سندھ بھی کنوج تک کا چکر لگا آتے تھے۔ خشکی کی طرح سمندر میں بھی عرب تاجر ہر جگہ چھائے ہوئے تھے وہ بغداد سے اٹھتے اور چین تک چلے جاتے تھے۔ سندھ چوں کہ نزدیک تر ملک تھا اِس لئے اس جگہ آمد و رفت زیادہ تھی۔

عرب تاجروں کی طرح سندھ اور ہند کے تاجر بھی دریائی سفر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ بھی بہ سلسلۂ تجارت بیرونِ ہند پھیلے ہوئے تھے چنانچہ ابوزید سیرافی لکھتا ہے کہ "لنکا، مالدیپ، جاوا، اور دوسرے جزائر میں ہندوؤں کی کافی آبادی ہے[۵۱]" اور جب ہندو تاجر عراق کے بندرگاہوں میں آتے ہیں تو عرب ان کی دعوتیں کیا کرتے ہیں[۵۲]" اس کے بعد ان کے الگ الگ کھانے کا طریقہ بتایا ہے۔ بزرگ بن شہریار نے عجائب الہند میں ہندو تاجروں کے لئے لفظ بایا استعمال کیا ہے اور لکھا ہے کہ "وہ عراق، بحرین، عمان، سوڈان اور مصر وغیرہ میں آباد ہیں اور بے تکلف عربی بولتے ہیں[۵۳]"

علمی تعلقات مناظرہ و مکالمہ خلفاء عباسیہ کا عہد شروع ہی سے تصنیف و تالیف اور تراجم کے لئے مشہور رہا ہے۔ اِس سلسلہ میں دنیا کے مختلف گوشوں سے حکماء و فضلاء نہایت قدر و منزلت کے ساتھ بغداد بلائے گئے

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ گزشتہ) جو قافلہ مکران سے براہ راست سندھ جانا چاہے تو وہ تیز سے کیز آتا اور کیزبت کلوان، ارمائیل، قنبلی کے راستہ دیبل آجاتا اور یہاں سے یزدن، مسوریی، بہرج، سیوستان ہو کر گنداوی جاتا اور چودریا کو عبور کرنا چاہے تو دیبل سے یزدن، منابوری اور یہاں سے دریائے سندھ کو عبور کر کے منصورہ پایۂ تخت پہونچتے پھر یہاں سے ملٹری، کالڑی، الزی اور ملتان تک چلے جاتے اس کے بعد کسی کا جی چاہتا تو کنوج کا بھی چکر لگا آتا ..... اگر کوئی قافلہ ہندستان جانا چاہتا ہے تو وہ منصورہ سے برہمن آباد، بابنہ، قامہل، سندان ہوتے ہوئے کھمبات چلا جاتا۔

(بحوالہ تاریخ سندھ ص۳۶-۳۳۵ از سید ابوظفر صاحب ندوی)۔

۵۱ ابوزید سیرافی ص۹۷

۵۲ ابوزید سیرافی ص۱۴۶

۵۳ عجائب الہند ص۱۶۵-۱۶۷ از بزرگ بن شہریار۔

اوران کی کماحقہٗ خدمت و عزت کی گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربی ادب مختلف قسم کے علوم و فنون سے تھوڑے ہی عرصہ میں مالامال ہوگیا۔ اس علمی قدردانی سے دو فائدے ہوئے اوّلاً یہ کہ دنیا کے تمام حکماء کو یکجا ہوکر اسلام کے مطالعہ کا موقعہ ملا اور دوسرے یہ کہ حکمت و فلسفہ نے مذہبی عقائد اور اعمال کو عقل کی کسوٹی پر کسنے کا موقع بہم پہونچا کر مذہبی رواداری کا دروازہ کھول دیا۔

سندھ میں بھی مذہبی مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہندوؤں اور بودھوں نے اپنی اپنی سمجھ اور قابلیت کے مطابق مناظرہ اسلامی پہ آمادہ ہو کر اعتراض کیے اور ان کے تسلی بخش جواب پا کر اسلام کی صداقت کا اقرار کیا۔ یہ گویا ہندوؤں اور بودھوں کے مسلمان ہونے کا نیا باب تھا۔

اب تک یعنی خلفاء بنو امیہ کے عہد میں جو سندھی اسلام پر ایمان لائے تھے ان کو اسلام کے محض عملی نمونہ نے اپنی طرف کھینچا تھا لیکن اب یہ صورت دوسری تھی چنانچہ جہم بن صفوان سے جو علم کلام کے بانی واصل بن عطا کا شاگرد اور فرقہ جہمیہ کا بانی ہے۔ سندھ کے بودھوں نے وجود باری تعالیٰ کے مسئلہ پر بحث کی۔ بودھ مذہب والے ہستی باری تعالیٰ کے قائل نہ تھے۔ اس مباحثہ میں جہم اپنے حریفوں کو خاموش نہ کر سکا تب بودھوں نے اپنے اعتراضات لکھ کر واصل کے پاس بصرہ روانہ کیے۔ وہاں سے جو جوابات لکھ کر آئے انہیں جہم نے جب بودھوں کو سنایا تو انہوں نے کہا کہ جس شخص نے یہ جوابات لکھ کر بھیجے ہیں ہم کو اس کا پتہ بتاؤ تاکہ ہم خود اس سے گفتگو کر سکیں۔ آخر یہ بودھ علماء بصرہ پہونچے۔ واصل سے گفتگو کی اور اسلام کی صداقت کے دلائل سن کر ایمان لے آئے۔[1]

اسی طرح ہارون رشید کے زمانہ میں اس ملک کے ایک بودھ راجہ نے اسلام کی حقانیت کے دلائل سن کر اپنا میلان طبع اسلام کی طرف ظاہر کیا۔ درباری پنڈتوں نے اسلام کے خلاف دلائل پیش کر کے راجہ کے خیالات کو پھیرنا چاہا تو اس نے ہارون رشید کو لکھا کہ کوئی ایسا شخص بھیجئے جو دلائل نقلی سے بحث کر سکے۔ چنانچہ ہارون الرشید نے معمر یا ابن خلدہ نامی ایک متکلم کو روانہ کیا۔ اب اس کے آگے دو روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ

---

[1] الملل والنحل بحوالہ "ہند و عرب کے تعلقات" آئینۂ حقیقت نما جلد اوّل ص ۱۲۵

اس متکلم سے اِن پنڈتوں میں جو سب سے بڑا تھا وہ کسی موقع پر مباحثہ کرکے ہار چکا تھا اور دوسری روایت یہ ہے کہ اس پنڈت نے اپنا ایک آدمی بھیج کر اس متکلم کے بغداد سے روانہ ہونے سے پہلے ہی اس کی قابلیت کا پتہ لگایا تو معلوم ہوا کہ وہ عقلیات کا بڑا فاضل ہے۔ اِس لئے دونوں روائتوں میں پھر اِس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ اس پنڈت نے اس کے مقابلہ میں اپنے کو کمزور سمجھ کر قبل اس کے کہ وہ متکلم راجہ کے دربار میں پہونچے اسے راستے ہی میں زہر دلوا دیا[۱]۔ مروج الذہب مسعودی جلد اوّل صفحہ ۲۵۴ میں کھمبایت کے ایک مناظر راجہ کا ذکر ہے جو مسلمانوں سے مناظرہ کیا کرتا تھا۔

تحصیل علم کا شوق سندھ کے بہت سے نومسلموں نے مکّہ و مدینہ کا سفر کیا اور تحصیل علم کے شوق میں وہاں برسوں رہے اور ان میں سے بعض وہیں رہ پڑے۔ چنانچہ فن مغازی وسیر کے امام ابومعشر نجیح سندھی نے عرب ہی کو اپنا وطن بنالیا اور جب سنہ ۱۷۰ھ / ۷۸۶ء میں فوت ہوئے تو خلیفہ ہارون الرشید نے اُن کے جنازہ کی نماز پڑھائی۔ اسی طرح رجاء نامی ایک بزرگ تھے جو تاریخ میں رجاء السندھی القرائینی کے نام سے مشہور ہیں یہ علم حدیث کے استاد اور سندھی نژاد تھے اور بھی بہت سے ایسے حضرات ہیں جنہوں نے سندھ سے باہر جاکر علم کی تحصیل کی جس طرح علم حاصل کرنے کے لئے سندھ سے باہر کا سفر کیا گیا۔ اسی طرح باہر سے بھی تحصیل علم کے لئے لوگ ہندوستان میں آئے۔ چنانچہ محمد بن اسمٰعیل تنوخی تیسری صدی ہجری میں آیا۔ اِس کا زیادہ حال معلوم نہیں البتہ ابوریحان بیرونی سے دنیا واقف ہے اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان علمی سفارت کا کام انجام دیا ہے اس نے ایک کو دوسرے کے علوم سے آگاہ کرنے کے لئے بہت سی کتابیں عربی سے سنسکرت میں (ہندوؤں کے لئے) اور سنسکرت سے عربی میں (مسلمانوں کے لئے) لکھیں اُس کی بعض کتابیں مندرجہ ذیل ہیں :-

(ہندوؤں کے لئے)

(۱) جوتشیوں کے سوالات کا جواب۔ (۲) کشمیر کے پنڈتوں کے دس سوالات کا جواب اور اُن کے شبہات کا حل۔ (۳) اصطرلاب پر ایک رسالہ۔ (۴) بطلیموس کی مجسطی کا ترجمہ۔

---

[۱] آئینہ حقیقت نما صفحہ ۱۲۶، ہند و عرب کے تعلقات صفحہ ۲۳۸، فتوح البلدان بلاذری صفحہ ۴۴۶

(۵) اقلیدس کے مقالے (۶) علم ہیئت پر ایک کتاب۔

(مسلمانوں کے لئے)

(۱) کتاب الہند (ہندوؤں کے عقائد اور علوم و فنون کی تحقیقات پر)۔ (۲) برہم گپت کی پانی ساسی ذہانت کا عربی میں ترجمہ۔ (۳) برہم گپت کی برہم سدھانت کا ترجمہ۔ (۴) سورج گرہن اور چاند گرہن پر ہندی تحقیقات۔ (۵) ہندی اربعہ متناسبہ۔ (۶) سانکھیہ کا ترجمہ۔ (۷) پتنجلی کا ترجمہ۔ (۸) لگھو جاتکم کا ترجمہ۔

اِن دو طرح کی کتابوں کے علاوہ تیسرے قسم کی کتابیں بھی ہیں مثلاً " سدھانت پر تنقیدی نظر" یعنی جوامع الموجود بخواطر الہنود۔ یہ پانچسو صفحات کی تنقیدی کتاب ہے۔ اسیطرح قانونِ مسعودی بھی البیرونی کی نہایت ہی قابلِ قدر تصنیف ہے۔

ویسے تو کئی ایک ہندو راجہ ہیں جو اسلام کی حقانیت و صداقت پر دلائل سُن کر ایمان لائے لیکن ۲۷۰ھ میں الرور (الور) کے راجہ مہروک بن رائک نے با قاعدہ کلام پاک کی سندھی زبان میں تفسیر پڑھی تھی اُس نے منصورہ کے حاکم عبداللہ بن عمر ہباری سے درخواست کرکے ایک مسلمان عالم کو جو متعدد زبانوں سے واقفیت رکھتا تھا اپنے دربار میں بلوایا اور اُس کو تین سال تک اپنے یہاں رکھا۔ ۲۷۳ھ میں جب وہ عالم عبداللہ ہباری سے ملا تو راجہ کے متعلق سوال کرنے پر اُس نے کہا کہ :-

" جس وقت میں وہاں سے آرہا تھا تو راجہ سچے دل سے مسلمان تھا لیکن سلطنت چھن جانے کے خوف سے اِس کا اظہار نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے منجملہ اور واقعات کے ایک واقعہ یہ بھی بیان کیا کہ اس نے سندھی زبان میں قرآن کی تفسیر لکھنے کی فرمائش کی، وہ روزآنہ اُس کو تھوڑا تھوڑا کرکے تفسیر سناتا جاتا تھا .... جب سورۃ یٰسین کی آیت "من یحیی العظام وھی رمیم" کی تفسیر بیان کی تو وہ اس وقت جواہرات سے مرصع سونے کے ایک تخت پر بیٹھا تھا .... وہ فوراً تخت پر سے اُتر پڑا اور زمین پر چند قدم چل کر اپنا گال زمین پر رکھدیا حالاں کہ زمین پانی چھڑکنے کی وجہ سے اُس وقت تر تھی۔ وہ یہاں تک رویا کہ اُس کا رخسار گرد آلود ہوگیا، پھر اس نے کہا کہ بے شک یہی رب معبود ہے جو ازلی و ابدی ہے۔ اس کے بعد اُس نے اپنے لئے ایک مکان تیار کرایا جہاں تنہائی میں وہ خدا کی عبادت کیا کرتا اور وقت پر نماز پڑھتا مگر لوگوں پر یہ اظہار کیا کرتا کہ وہ وہاں جاکر سلطنت کے اہم معاملات پر

غور کیا کرتا ہے"۔[۵۱]

ذہنی انقلاب سیاسی، تجارتی، معاشرتی اور علمی تعلقات کا لازمی نتیجہ ذہنی انقلاب ہے۔ جس زمانہ میں مسلمان سندھ کے اندر داخل ہوئے تھے یہاں کے ہندوؤں اور بودھوں میں بُت پرستی کا عام رواج تھا۔ ذات باری تعالیٰ کا تصور معدوم ہونے کی وجہ سے اعلیٰ و ادنیٰ پتھر کی مورتیوں اور بتوں کو حاجت روا سمجھا جا رہا تھا لیکن مسلمانوں کے ساتھ دن رات کے میل جول کی وجہ سے اُن کے دلوں میں خدا کی وحدانیت کا عقیدہ راسخ ہونے لگا اور بتوں کی قدر و منزلت نظروں سے گرنے لگی۔ چنانچہ ۲۲۲ھ / ۸۳۷ء کے قریب کشمیر و کابل اور ملتان کے درمیان عُسیفان کے راجہ نے اپنے ایک عزیز بیٹے کی شفایابی کے لئے اپنی حکومت کے سب سے بڑے مندر کے سب سے بڑے بُت کے سامنے التجا کی۔ پوجاریوں نے راجہ کو یقین دلایا کہ بُت نے دُعا قبول کر لی ہے لڑکا صحت یاب ہو جائے گا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد لڑکا مرگیا۔ راجہ پنڈتوں کی کذب بیانی سے اتنا متاثر ہوا کہ اُس نے بُت خانہ کو مسمار کرادیا اور اس کے پجاریوں کو بھی زندہ نہ چھوڑا۔ پھر اپنی حکومت میں چند پھرتے پھراتے مسلمان سوداگروں سے اسلام کی صداقت کے دلائل سُن کر مسلمان ہوگیا۔[۵۲] یہ واقعہ خلیفہ معتصم کے زمانہ کا ہے۔

اسلام سے پیشتر سندھ میں عدل و انصاف کا یہ معیار تھا کہ مجرموں کی شناخت کے لئے اُن کو جلتی ہوئی آگ میں سے گذرنا پڑتا تھا، اگر آگ میں جل گیا تو مجرم اور بچ گیا تو بے گناہ تصور کیا جاتا تھا۔ کبھی لوہے کا گولا انگارے کی مانند سُرخ کر کے مجرم کے ہاتھ پر رکھا جاتا تھا۔ کبھی گہرے پانی میں مشتبہ شخص کو اتنی دیر تک ڈبا رکھا جاتا تھا کہ ایک شخص تیر کمان میں رکھ کر چھوڑے اور دوسرا شخص اُس تیر کو جا کر اٹھا لائے۔ اس عرصہ میں اگر پانی کے اندر دم نکل گیا تو مجرم تھا اور زندہ نکل آیا تو بے گناہ۔ جادو ٹوٹکے کا عام رواج تھا، غیب کی باتیں اور شگون کی تاثیرات بتانے والوں کی گرم بازاری تھی۔ محرماتِ

---

۵۱ عجائب الہند صہ۳ از بزرگ بن شہریار بحوالہ تاریخ سندھ صہ۱۹۱ سید ابو ظفر صاحب ندوی۔

۵۲ فتوح البلدان صہ۴۴۶ از بلاذری

ابدی کے ساتھ شادی کرنے میں بھی تامل نہ تھا۔ چنانچہ [illegible] راجہ داہر نے پنڈتوں کے ایماء سے اپنی حقیقی بہن "مائی" کے ساتھ شادی کی[1]۔ بعض بعض مندروں میں بتوں کے اوپر انسانی بیانوں کی نرہ بانی کا بھی رواج تھا [illegible] مقدسی نے مندروں میں دیوداسیوں کی کثرت دیکھی۔ اُن کی بدکاری کا ایک حصہ [illegible] لیتا تھا[5]۔ لوگ اپنی لڑکی کی عزت بڑھانے کے لئے اس کو دیوداسیوں [illegible] کے مندر کی خدمت کے لئے وقف کر دیتے تھے۔

مسلمانوں نے سندھ میں آکر یہاں کے باشندوں کے دینی یا دنیوی توہمات میں قطعی دخل نہیں دیا۔ نہ ان کو ان کے مذہب کے تبدیل کرنے پر مجبور کیا لیکن انہوں نے اپنے عدل و انصاف اور اعلیٰ اخلاق کا جو نمونہ پیش کیا اُس کا یہ اثر ہوا کہ بہت سے مفید سبق حاصل کر کے اپنے اخلاق و معاشرت میں تبدیلیاں پیدا کیں۔ مسلمانوں سے دوستی بڑھائی، شادی و بیاہ اور سرکاری درباریں برابر مسلمانوں کے شریک رہے۔ وحشیانہ سزائیں اور وحشیانہ طریق انصاف موقوف ہوئے۔ توہمات کے بادل چھٹ گئے، اعلیٰ طبقہ اور اعلیٰ خیال کے لوگوں نے بخوشی اسلام قبول کیا۔ چنانچہ ۲۵۹ھ میں جب کہ سندھ کا تعلق بغداد کی مرکزی حکومت سے برائے نام باقی رہ گیا تھا ہندوستان (سندھ کے متصل سرحدی علاقہ) کا ایک راجہ اپنی خوشی سے مسلمان ہو گیا [illegible] نے سونے کی ایک زنجیر جو زمرد و یاقوت سے پچیکاری کی ہوئی تھی بطور نذر بیت اللہ الحرام میں کعبہ کے لئے بھیجی جس کے ساتھ سبز رنگ کا یاقوت (زمرد) بھی تھا۔ بغداد میں یہ چیز پہونچی تو خلیفہ معتمد علی اللہ کے سامنے پیش کی گئی اُس نے حکم دیا کہ اس کو کعبہ [illegible] آویزاں کیا جائے، [illegible] کی گئی[2]۔

راجہ جے سنگھ (بن) [illegible] کے مسلمان ہونے کا ذکر آچکا ہے۔ [illegible] اس کی اولاد بھی مسلمان ہو گئی جو آج بھی قوم ڈاہر کے نام سے مشہور ہے [illegible]

ابن ندیم بحوالہ تاریخ سندھ ص۱۹۲ از ابوظفر صاحب ندوی۔

بشاری مقدسی بحوالہ تاریخ سندھ ص۲۴۷، ابن رستہ [illegible] تاریخ سندھ ص۲۰۲

اعلام بیت اللہ الحرام ص۴۲ (حاشیہ) بحوالہ تاریخ سندھ ص۱۹۰ از سید ابوظفر صاحب ندوی۔

چاچڑ ہے جو اپنے آپ کو راجہ داہر کے وزیر کی اولاد بتاتے ہیں اور اسلام کے بڑے پابند اور سچے فدائی ہیں[1]

[1] "آئینۂ حقیقت نما" جلد اوّل ص۱۳۶

پنڈت بشیر الدین

موت کے فرشتے سے

(از سیّد لطیف حسین ادیبؔ دہلوی)
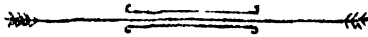
اُجڑی بستی کو بسا لوں تو چلوں
اشک آنکھوں سے بہا لوں تو چلوں

جاؤں کس منھ سے خدا کے آگے
عہدِ خفتہ کو جگا لوں تو چلوں

کیا ابھی شام گئی ہے کہ سحر
نقشِ ہستی کو مٹا لوں تو چلوں

شرکتِ غیر گوارا ہی نہیں
اپنا کعبہ میں بنا لوں تو چلوں

کارواں تک نہیں منزل میری
خود کو مقصود بنا لوں تو چلوں

گرمیٔ حسن پہ مٹنا ہے مجھے
تنکے آہوں کے جلا لوں تو چلوں

کعبہ بن جاؤں صنم خانہ میں
بُت کو سجدہ میں گرا لوں تو چلوں

فاش کردے نہ کہیں رازِ کفن
اپنی رسوائی چھپا لوں تو چلوں

رہ نہ جائے کوئی وحشی باقی
دامنِ گُل بھی سِلا لوں تو چلوں

بھپکیاں دیتے ہیں ابنائے زماں
ان شغالوں کو بھگا لوں تو چلوں

جھانکتے ہیں جو قفس سے بے کس
ان اسیروں کو چھڑا لوں تو چلوں

نہ چلوں ننگِ مسیحا بن کر
مردہ زندوں کو جِلا لوں تو چلوں

کس طرح ہوتی ہے تعمیرِ حیات
یہ سبق پھر سے پڑھا لوں تو چلوں

ہو نہ محشر میں بپا حشر ادیبؔ
داغِ سینہ کا چھپا لوں تو چلوں

نئی کتابیں

ادارۂ مصنف کی طرف سے جنرل قدوائی کی نظر میں

(الثورۃ الھندیہ)

"باغی ہندستان"

۴۷۶ صفحات کا یہ 'بغاوت نامہ' جو علامہ فضل حق خیر آبادی کے رجز یہ رسالہ اور نایاب ھائد غدریہ کے اصل متن، مرتب کے اُردو ترجمہ اور ایک آگاہی بخش پس منظر پر مشتمل ہے زاد ہندستان کے سامنے مولانا عبدالشاہد خاں صاحب شروانی نے پیش کیا ہے۔ یہ انقلاب سُرخ) ملبوس مجلد، مدینہ پریس بجنور سے شائع ہوا ہے۔ لکھائی چھپائی اچھی اور قیمت پانچ روپیہ ہے۔

آنریبل علامہ آزاد کا مقدمہ اور ان کا تجویز کردہ نام 'الثورۃ الہندیہ' کتاب سے اُن کی لچسپی کے شاہد اور اس کے مضامین کی اہمیت کے ضامن ہیں۔

عبدالشاہد خاں صاحب زاد اللہ علمہٗ و عملہٗ ایک دلیر اہل قلم ہیں جن کی جرارت و دانش نے "برداشت بیک دست قلم را و علم را" کا ابتدا ہی سے امتیاز حاصل کر لیا ہے۔ تحریر میں آمد کی بے باکی سے ایک خاص رنگ پیدا ہے اور جس اصول کے وہ حامی ہیں اُس کی علم برداری میں ان کا انہماک بقدر اخلاص ان کے جوان ساز آہنگ سے ہویدا ہے۔ کل کا مورخ ایک جلد میں ۱۸۵۷ء کے مجاہد کبیر کے ملفوظات اور ۱۹۴۷ء کے مذاکرات، استنباط و تعمق کے لئے یکجا پا کر سید الطاف علی صاحب سیکریٹری یوپی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا ممنون ہو گا جن کی تاثیر نے شروانی صاحب کے خامہ سیف زبان کو نوید روانی دی۔ اور اعوان و انصار کی تائید و ترغیب نے اس کتاب کی طیاری پر ان کو کمربستہ کیا،

خدا رحمت کند ایں عاشقان علم و حکمت را

علامہ خیر آبادی کے قصاید و رسالہ سے ان حالات کا بلا زحمت اندازہ کیا جا سکتا ہے

جنھوں نے اہلِ ہند کو غلامی کے بندھنوں میں جکڑا اوران کی پہلی آزادی کی تڑپ نے کس طرح اس جکڑ بند کو سخت تر بنایا۔ شروانی صاحب کا دیباچہ اور مختصر بائیوگرافیکل مضامین خود ان کے عہد کے حالات سے ملکر ایک تاریخی خاکہ اس تحریک کا مرتب کرادیتے ہیں جو یہاں "بغاوت" کہلاتی رہی ہے - اس دنیا میں جہاں کامراں لٹیرے شہنشاہ کہلائے اور کامیاب خام کار مفکر و فلسفی ٹھہرے، جہاں دعوتِ غاراں سے لیکر فتح مکہ تک، تکمیل دین سے لیکر وداعِ ظاہری تک، اُس وقت سے شہادتِ ذی النورینؓ تک، وہاں سے جنگِ جمل، جنگ صفین، واقعۂ کربلا، تخریب بغداد تک، اُس وقت سے ۱۸۵۷ء تک اور تب سے آج تک ہر ذی قوت نے کمزور حق پژوہ کو غدار اور باغی ہی گردانا ہے۔ اختلافِ رائے میں تشدد کا یہ پہلو ہمارے اندرونی اختلافات کی بناء اور بربادی کا اصلی سبب ہے جو رحمت کے حتمی مطمح نظر اور بنیادی اصول سے فکری اور عملی بیگانگی کا نتیجہ اور فقدانِ اخوت و رواداری کا اصلی باعث ہے، اس لئے کہ رحمت تمام صفاتِ حسنہ کی نفسیاتی بناء ہے جس کے بغیر ساری اصلاحی کوششیں بے اثر رہتی ہیں اور تمام مساعی نامربوط و سطحی۔ رحمتِ فطرت کی مانگ، آتما کی پکار، خدا کی مشیت اور اساسِ کائنات ہے۔ خلق، تبلیغ و ہدایت ابتدائیت، رحمت للعالمینی انتہائیت۔ ہندوستان کے صد سالہ جہادِ آزادی کی خونیں داستان کا یہ روح پرور اور افتخار انصرام پہلو محمدیت کے شیوع اور اُس کی ابدیت سامانی کی بے پایاں اور تعین شکن تنویر ہے ؎

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود　　رحمت اللعالمینی ہم بود

لیظھرہ دین الحق کلمۃ (تاکہ صحیح اصول زندگی پوری طرح واضح ہو) امرِ مشیت ہے محض تفویضِ نسب نہیں۔ یعنی مخلوق میں انسانیت کا بعمومیت قائم ہونا اور رحمت کا عالم میں جاری اور موثر ہونا وعدہ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ (اللہ اپنے نور کو پوری طرح عیاں کرے گا) کی تکمیل اور صداقتِ باہرہ کی حقیقی تفسیر ہے۔ جو علمبرداران حریت و مساواتِ انسانی کے کیرکٹر سے واضح ہوتی رہی۔ اسی قدر نہیں بلکہ وہ قطعی اقدار، و بلند معیار، اور اُن کے حصول کے لئے محکم اصولوں کے عیاں ہو جانے سے جو فطری اور آساں ہیں۔ فکری پس منظر اور حقیقی مطمح نظر کے ساتھ کردار عملی میں ایک ایسی ہمہ گیر جاں بخشی پیدا ہوئی کہ رحمتِ مختتمہ کی عالم آرائی ہر حجاب سے پوری شان کے ساتھ جلوہ فرما و تابش آموز رہی۔ .... اصول بدلے، مقاصد بدلے، نظریے بدلے، زندگیاں بدلیں، شعر و ادب بدلے اور یہ محمدیت ہی کی جاری و ساری

حیاتِ افروزی کا کرشمہ تھا کہ ۵۷ء کے زمانۂ انحطاط اور کھلی ہوئی بربادی کے خطرات کے مقابلہ میں اصول حُبّ الوطن المن الایمان (وطن کی محبت ایمان کا فیض ہے) کی روح افزائی ہر طرف کارفرما ہوئی اور اس آفتابِ صدق و رحمتؐ کے پرتو سے تمام ذرّے علیٰ قدرِ مراتب جگمگا اُٹھے۔ علامہ فضل حق خیرآبادی کے گیر کرکڑ کی۔ بلندی تھی کہ جب ثبوت کی کمی کی وجہ سے انکا سکوت ہی رہائی کے لئے کافی ہوسکتا تھا۔ عدالت میں اُنھوں نے خود اپنے فتوائے جہاد کی تصدیق و توثیق کی اور افضل الجہاد کلمۃ الحق عند السلطان الجابر (سب سے بڑا جہاد جابر حاکم کے سامنے حق بات کہنا ہے) کی سعادت کو تمام مفاد پر ترجیح دی ؎

گو سلامت محملِ شاہی کی ہمراہی میں ہے
لذّتِ دردِ جگر صدموں کی جانکاہی میں ہے

رسائل و قصائد کی عبارت یکساں بلامبالغہ سلاست و بلاغت کا معیاری نمونہ ہے، جس پر شروانی صاحب نے بے لوث تبصرہ فرمایا ہے۔ ابنائے زمانہ کا حال کس کمال سے بیان ہوتا ہے ؎

رجوتنا سا رجا من المحلو سحبا　　قد اقلعت بعد ابراق وارعاد

ترجمہ (میں نے چند لوگوں سے ان قحط زدہ اشخاص کی سی امید باندھی جو ایسے بادلوں سے جو گرج اور چمک کر چھٹ گئے ہوں امیدیں باندھ لیتے ہیں) صورت حزن و ملال کا ذکر کس قدر مکمل ہے ؎

یومی کلیلی وسرمد تقت　　النجوم فیہ کان شدّت باوتاد

ترجمہ (میرا دن رات کی طرح ہے اور میری رات کو دوام ہے۔ آسمان پر ستارے ایسے رُکے ہیں جیسے انھیں میخوں سے باندھ دیا گیا ہے)۔

لیکن کیف و ثبات، اخلاص و استحکام کا یہ عالم کہ ان تمام شدائد کے باوجود بنیانٌ مرصوص (سیسہ پلائی دیواروں کی طرح) مقام معۂ پر بہ سکون خاطر بے دغدغہ قائم ہیں ؎

کیف الولاء وھم اعادی من لہٗ　　خلق السماء والارض والانشاء

فیضی احسنت ازیں عشق کہ دوراں امروز
گرم دارد زتو ہنگامۂ رسوائی را

ترجمہ شگفتہ، سلیس اور کامیاب ہے جس کی سند خود آنریبل علامہ آزاد کا اعتراف ہے۔ قصائد کی بلند پائگی کا کیا پوچھنا۔ ابن خلدون نے اپنے اُستاد سے سوال کیا تھا کہ کیا وجہ ہے کہ جاہلیت کے شعراء کے کلام سے بعد کا کلام زیادہ بلند پایہ ہے اور اُن کی اجازت سے

خود جواب دیا تھا کہ "ہمارے سامنے قرآن و حدیث کے بلند معیار موجود ہیں جن سے وہ محروم تھے۔"
جن کی زندگی ہی قرآن و حدیث کے انوار میں سموئی گئی ہو ان کی صحتِ فکر اور کمالِ بیان کا کہنا ہی کیا۔ "ذرۂ آفتابِ تابانیم"۔

اس کتاب سے ایک اہم بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ ولی اللّٰہی دبستانِ خیال (اسکول آف تھاٹ) عملی اسلام کا علمبردار تھا اور آخرکار یہی اسپرٹ سارے ملک میں بلاتخصیص مذہب و ملت پھیل کر تطہیر فکر و اصلاح اعمال کے ساتھ آزادئ وطن کا باعث ہوئی۔ ہندوستانی اسلام یعنی وہ ہدایتِ حقہ جو رب العالمین نے بِلِسانِ قومہٖ (اسی قوم کی زبان میں) یہاں نازل فرمائی اور قرآنی اسلام جو بفحوائے اکملت لکم دینکم تمام مراسلات پر حاوی ہے۔ بنیاداً جُدا نہیں اور یہ قدغنیں بھی جو بما ختلفو فیہ کہی جاسکتی ہیں، اپنی بھیانک تفرقی کار یاں مشیت کے وحدتِ انصرام ہاتھوں وداد انجام ہوکر رہیں گی اور حقیقت کان الناس امۃ واحدۃ (تمام انسان ایک برادری ہیں) اپنی پوری امن آرائی کے ساتھ نافذ ہوگی۔ ع

اے خوشا آں روز کہ آئی و بصد ناز آئی

ان اکابر میں سے جن کے سوانح حیات شروع میں دئے گئے ہیں مولانا غلام معین الدین اجمیری مرحوم سے مجھے نیاز حاصل تھا جن کے درس میں میں نے حاضری دی ہے وہ ایک دلیر مجاہد اور ذی شعور سیاستداں تھے جن کے صدق و ایثار نے تحریک خلافت و آزادی وطن کو بیحد تقویت پہنچائی اور میرے لئے یہ اندازہ مشکل نہیں ہے کہ شروانی صاحب کے شعورِ ادبی کو یہ نوعیت کیسے حاصل ہوئی ؎

پروانہ وار ہستئ خود را نہ باختیم ۔۔۔ یا شمع آفتاب حریفانہ زیستیم

اس کتاب میں یہ درس بھی موجود ہے کہ باہمی عداوتوں اور اختلافات نے ہی ہندوستان کو غلام بنایا تھا اور آیندہ کے لئے صحیح راہ ذاتی صدق و حق رسی پر اصرار نہیں بلکہ "ایثار" ہے، تنقید نہیں بلکہ تائید ہے ..... ایثار یکجہتی کے لئے، اختلافات کو کم کرنیکے لئے، تائید ہمدستی کے لئے اور پارٹیوں کو بلا تکدر و تعصب مدغم کرنیکے لئے، کیونکہ اتحاد کی بنیادیں صرف دلوں کے اخلاص پر قائم کی جاسکتی ہیں اور آہنی دیواروں سے بھی زیادہ مستحکم فصیلیں باہمی اطمینان و اعتماد کے ہی اساس پر قائم رہ سکتی ہیں:۔ ع

گر یہ نہیں تو بیارے باقی کہانیاں ہیں

مجموعۂ نشری تقاریر

ناشر ادارۂ نشریات۔ حیدرآباد دکن۔ قیمت عہ

مولوی عبد الرحمن خاں صاحب، سابق پرنسپل جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کی نشری تقاریر کا یہ مجموعہ حیدرآباد کے معیارِ علم و ادب کی عظمت کا ایک دستاویزی ثبوت ہے۔ ریڈیو کا مصرف غلامی کے زمانہ میں صرف غم غلط کرنا تھا، جو زیادہ تر بے وقت کی راگنیوں اور مجنس نغموں سے ایک طوفانِ بے تمیزی کی صورت میں کم سوادوں کی بلند نشینی کا اثر تھا، لیکن حیدرآباد کا پروگرام جہاں اور حیثیتوں سے بہتر ہوتا رہا وہاں علمی اور ادبی مقالات کے لحاظ سے بھی بلند پایہ ہے۔

یہ تقریریں کافی محنت سے طیار کی گئی ہیں اور مضامین دلچسپ و مفید ہیں مثلاً سیاروں پر زندگی کے امکانات، دُم دار ستارے، اسلامی معاشیات، سائنس اور روزانہ زندگی، تاروں کی بستی پُراسرار روشنی وغیرہ۔

اس قسم کی تقریروں کی اشاعت یقیناً ایک موثر خدمت ہے اور یہ امید بیجا نہ ہوگی کہ اِس مثال کی نہ صرف اشاعت میں بلکہ نشریات میں بھی اِتباع کی جائے گی۔

لکھائی چھپائی اچھی ہے اور ان داموں گویا مفت ہے۔

اہلِ ہند نے فلکیات میں جو تحقیقاتیں کی تھیں وہ خود اپنی جگہ پر حیرت انگیز ہیں لیکن ان سے عدم واقفیت کے باعث گفتگو صرف یوروپین تنقیحات پر رہ جاتی ہے، اس طرح دوسرے سائنٹفک مسائل پر بھی اہلِ ہند کی آگاہی کے بارے میں ہمیشہ تنگ نظری برتی گئی ہے۔ خدمت علم کا جذبہ اس کا مقتضی ہے کہ اِن مسائل پر گفتگوئیں نشر کی جائیں۔ اور واقفیت کی افزائش کے لئے عبارت کی سادگی اور بیان کی دل پذیری میں مولوی عبد الرحمن خاں صاحب کی اتباع کی جائے۔

جنرلِ قدوائی

پروفیسر محمد طاہر فاروقی صاحب آگرہ

"کرامت نامہ ملا۔ جلسہ کی شرکت سے زیادہ اہم یہ بات ہے کہ دیدار کو عرصہ سے آنکھیں ترس گئیں۔ احباب و اقربا سے بُعدِ مکانی ہوتا جارہا ہے۔ جو ہیں اُن کا دم غنیمت ہے۔ کیا ہونیوالا ہے خدا جانے۔ اُسی کا سہارا ہے اور بس۔ 'مصنف' ملا اور پھر آپ کا خط۔ نشاطِ تازہ حاصل ہوئی۔ وہاں آنیکا ارادہ ہے۔ جلدی موقع نکالوں گا۔ اب ذرا کاموں کا بوجھ ہلکا ہوا ہے۔ ورنہ گزشتہ چار پانچ ماہ میں تو پِس گیا۔ 'مصنف' میرے نام ابد تک آتا رہے گا۔ چندہ قرضِ حَسَنَہ ہے۔ ادا کیا جائے گا۔ جلدی۔ یہ 'بزمِ مصنف' بھی خوب شے ہے سل۔ احمد صاحب کا خط خوب چھاپا۔ دعوت نقد و نظر ہے۔ قیاس آرائیوں کا موقع ملا۔ آپ کو بھی نئے نئے شگوفے چھوڑنے آتے ہیں۔ 'مصنف' پر کون تبصرہ کرے! ۔ خدا کرے آپ اور بھی بہتر مواقع علمی و ادبی خدمات کے پائیں۔ جزاک اللہ۔ آخر میں یہ بھی سُن لیجئے کہ اگر آپ نے یہ خط چھاپا تو بس........"

مفتی صاحب سے ملاقات ہو جاتی ہے اب وہ مائل بہ تجارت ہیں۔ سنت ادا کر رہے ہیں۔ خواجہ احمد صاحب فاروقی دو ماہ سے ہمارے کالج میں آگئے ہیں۔ یہیں قیام فرما ہیں۔ دُعا کیجئے کہ میں وہاں تک آنیکا موقع نکالوں۔ ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ 'مصنف' نے بیگم الطاف سے بھی تو واقفیت پیدا کرادی ہے۔ اس لئے سلام لکھنے کا حق پہونچتا ہے۔

سیٹھ الحاج ابراہیم ہارُون جعفر صاحب کراچی

میں کل ہی ولایت سے کئی ماہ کے دَورہ کے بعد کراچی واپس آیا ہوں اور غالباً ایک ہفتہ یہاں قیام رہے گا۔

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب مرحوم کے انتقال نے تمام ہندوستان میں ماتم بپا کر دیا ہے درحقیقت مسلمانوں کو یہ ایسا زبردست نقصان پہونچا ہے جس کی تلافی ناممکن ہے۔ میں نے ولایت میں اُن سے ملنے کی بہت کوشش کی۔ ستمبر کے آخر میں ہوٹل پر اُن سے ٹیلیفون میں میری بات چیت ہوئی تھی۔ اور انھوں نے کہا تھا کہ میں پیرس جارہا ہوں واپسی پر ملاقات ہوگی۔ اِس کے بعد ۴ ر اکتوبر تک روزانہ میں ملاقات کے لئے جاتا رہا مگر ملاقات نہ ہوسکی۔ اُس کے بعد مجھے باہر جانا پڑا۔ بہرحال مجھے اُن سے وہاں ملاقات نہ ہونے کا افسوس رہا۔ اور اب اِس حادثۂ فاجعہ سے سخت

ملال اور افسوس ہے۔ اور میں ڈاکٹر صاحب کیلئے دعاءِ مغفرت کرتا ہوں۔
میں نے آج ایک خط ڈاکٹر صاحب کے فرزند مسٹر ذکاء الدین احمد کو بھی لکھا ہے مگر میری یہ خواہش ہے کہ آپ میری طرف سے ڈاکٹر صاحب کے تمام خاندان سے اظہارِ تعزیت فرمادیں —
اُمید کہ آپ بخیر ہوں گے۔ کارِ لائقہ سے یاد فرماتے رہیں۔

ڈاکٹر عبدالغفور صاحب بسمل پیلی بھیت

الطاف نامہ صادر ہوا۔ اور 'مصنف' کے دو پرچے بھی موصول ہوئے۔ اِس لُطفِ خاص کا شکریہ قبول فرمائیے۔
مبلغ دس روپیہ ذریعہ منی آرڈر ارسال خدمت ہیں۔ یہ "مصنف" کا نذرانہ ہے۔ آیندہ خدمت کی اور کوشش کروں گا۔ میری ایک نظم کا یہ شعر ہے :-

حُسن کی سرکار میں پُر اضطراب آیا ہوں میں!
ھدیۂ دردِ پرستش نذر کو لایا ہوں میں!

آپنے اپریل کے 'مصنف' میں (مکتوباتِ فرنگ کا مضمون جہاں ختم ہوتا ہے) گویا جہاں آبادی کی ایک رُباعی شائع کی ہے۔ اس سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ آپ گویا جہاں آبادی کے کلام کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ ایک سال سے زیادہ عرصہ ہوا کہ اسلامیہ ہائی اسکول پیلی بھیت کے ایک علمی و ادبی جلسہ میں میں نے گویا جہاں آبادی کے کلام پر "تبصرہ و تعارف" کے زیرِ عنوان ایک مضمون پڑھا تھا۔ علم دوست حضرات نے اُسے پسند فرمایا تھا۔ وہ مضمون ارسال کر رہا ہوں۔

نورالحسن صاحب ہاشمی ایم۔ اے (لکھنؤ) ایم، اے، پی، ایچ، ڈی (علیگ)

رسالہ آپ کا کل یونیورسٹی کے پتے پر ملا۔ آپکی عنایت کا ممنون ہوں۔ نئے سال کا چندہ آج ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ آجکل جبکہ خلفشار، سراسیمگی اور بیچارگی کا عالم ہے، ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی ہے، آپ کا استقلال کے ساتھ اپنے رسالہ کو نکالتے رہنا اور چپ چاپ اپنا کام کرتے رہنا ایک کرامت سے کم نہیں، خدا کرے علی گڑھ میں قطب بنے آپ ہمیشہ چمکتے اور دمکتے رہیں۔

ایک امر دریافت طلب ہے ۱۹۳۹ء میں میں نے رسالہ اردو (انجمن ترقی اردو) میں ایک صاحب کے ایک قدیم اردو روزنامچہ کو تلخیص کرکے "اردو میں سب سے پہلی ڈائری" کے عنوان سے شائع کروائی تھی جو بہ اقساط ۱۹۴۰ء کی جنوری تک نکلتی رہی۔ اب میں نے اُس میں ترمیم اور اضافہ کر دیا۔ چاہتا ہوں کہ وہ کتابی صورت میں شائع ہو جائے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ اپنے رسالہ پر

اِس ڈھنگ سے اُسے بہ اقساط شائع کرنا شروع کریں کہ صفحات کی ترتیب بھی قائم رہے اور آخر میں وہ کتاب بھی مکمل ہو جائے۔ ڈائری مذکور دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی ہے ۱۸۶۶ء سے دسمبر ۱۹۱۱ء تک کے حالات روزانہ لکھے گئے ہیں اور ہر ملک کے ہیں اور ہندوستان کے تو خصوصاً ہر قسم کے حالات سیاسی۔ معاشی۔ سماجی اُس میں درج ہیں۔ غرضکہ اپنے زمانہ کی یہ ایک دلچسپ ڈائری بھی اور ایک اہم تاریخ بھی۔ کتاب غالباً دو سو (۲۰۰) صفحات میں آجائے گی۔

بنام ڈاکٹر بشیر احمد صاحب ملک ملتان

وہ دن جو گزرے بے حد مصروفیت کے تھے۔ "یک انار و صد بیمار" کا مصداق بنا رہا۔ اُمید ہے کہ آپ کامل خیریت سے اور خوش ہونگے ایامِ گزشتہ میں بہیمیت اور درندگی کے وہ منظر پیشِ نظر ہے کہ الامان الحفیظ! انسانی خُون سے وہ ہولی کھیلی گئی کہ زمین لالہ زار بن گئی۔ اور انسانی بے شرمی اور بے حیائی کے وہ سین پیشِ نظر ہے کہ اُن کے بیان سے بھی لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ ہندوستانی انسان نے جنگلی حیوانوں سے بدرجہا زیادہ اپنی وحشت اور بربریت کا ثبوت پیش کیا۔ انسانی اخلاق۔ شرافت اور مُروّت کا دیوالہ نکل گیا۔ فرقہ وارانہ کشمکش نے انسانوں سے انسانیت کے جوہر چھین لئے اور اپنی حیوانیت کے ذلیل ترین گڑھے میں ڈھکیل دیا۔ کاش ہمارے ملک کی آنکھیں کھلیں اور وہ بھی ترقی کی راہ میں اقوامِ عالم کے دوش بدوش ہو سکیں اور ہمارا پیارا مُلک حُسنِ اخلاق۔ شرافت اور شائستگی کی بلندیوں کی طرف اُڑ سکے! اور یوں "ہمارے ملک کی" بلند انسانیت پستی کے قعرِ مذلّت سے اُٹھ کر آسمانی فضا میں سانس لے سکے! اور "ہمارا پیارا ملک" بھی انسانیت کے اعلیٰ ترین کھوئے ہوئے بیش قیمت موتیوں کو جنھیں وہ کُتّے کی طرح اپنے پاؤں کے نیچے رُوند چکا ہے۔ پھر سے اُنھیں کیچڑ کی دلدل سے نکالے۔ خدا ہماری مدد کرے۔ تاکہ ہم اپنی کھوئی میراث پر قبضہ کر سکیں۔ اور اس اپنی بگڑی دُنیا کو ازسرِ نو تعمیر کریں۔ ہماری موجودہ نسل نے شرم و حیا کے پردے چاک کر دئے! اور ہم شرم اور رُسوائی کے مارے دُنیا کی اقوام کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ کاش کہ ندامت کے آنسوؤں سے اس سیاہی کو ہم دھو سکیں۔ اور گزشتہ را صلوٰۃ کے مصداق اب آگے کو ہم ایک دوسرے کو تعاون اور شراکت کا ہاتھ دے سکیں۔ ع

بڑا مزہ اُس ملاپ میں ہے کہ صلح ہو جائے جنگ ہو کر

اپنے مُفصّل حالات سے آگاہ کریں۔ "مصنف ۱۹ اگست ۱۹۴۷ء" کے بعد کوئی پرچہ موصول نہیں ہوا۔ مصنف کے پرچے میرا رُوحانی وظیفہ ہیں ان سے محروم نہ رکھا کریں۔

خان بہادر میجر مرزا ابوجعفر صاحب

آپ نے تو اس کڑے وزن سے مجھے اپنا وعدہ یاد دلایا ہے کہ گویا میں مکر چکا ہوں۔ یا عنقریب مکرنے والا ہوں۔ اے حضرت۔ میاں اگر مجرم ہوں تو اقراری مجرم ہوں۔ ہانکے پکارے کہتا ہوں کہ بیشک میں نے وعدہ کیا تھا اب رہا یہ معاملہ کہ پھر رقم ارسالِ خدمت کیوں نہ کی؟ تو اس میں آپ کا میرا برابر کا قصور ہے۔ میرا یہ کہ روپئے روانہ نہیں کئے۔ اور آپ کا یہ کہ تقاضا نہیں فرمایا۔ اتنے عرصہ پبلک سے سروکار رہنے کے باوجود آپ معصوم کے معصوم رہے! میاں۔ بغیر مطالبہ کے کہیں چندہ وصول ہوتا ہے؟ اب میں آپ کو سہل راستہ بتائے دیتا ہوں۔ اگر ۱۰ر فروری تک آپ کو میرا منی آڈر مل جائے تو فہوالمقصود۔ ورنہ آپ وی پی کر دیجیے گا۔ ہچکچائیگا نہیں ——— میرے سے نادہندوں کا علاج یہی ہے۔

عالیجناب حضرت نواب صاحب صدر یار جنگ بہادر کی خدمت میں سلام و نیاز۔

سید مطلبی صاحب فریدآبادی دہلی

آپ کے توسط سے ادیب بریلوی سلمہٗ کی نظم پہنچی۔ نظم بہت اچھی ہے ان عزیز سے اتنی بات فرما دیں کہ اس کائنات میں جب سے انسان میں تونگر و غریب دو طبقے پیدا ہوئے ہیں گلے نہیں ملائے جا سکے اور اس آرزو کی ایک ہی شکل ہو سکتی ہے کہ تونگر تونگر رہے نہ غریب غریب۔ ہزاروں سال سے غریب کو یہی فریب دیا جاتا رہا ہے کہ تونگر و غریب بھائی بھائی ہیں۔ ایک حقیقی ماں جائے بھائیوں میں جب یہ تفریق پیدا ہوتی ہے تو پھر وہ اُن تک کو گلے نہیں ملنے دیتی۔ اِس لئے ہم بھی اپنے ناظرین کو چونکہ اس مغالطے میں رکھنے کا جرم نہ کر سکتے تھے، اس لئے ان کی نظم تونگر و غریب کے بجائے "غریب سے غریب" لکھ کر چھپنے دی جا رہی ہے۔ اِس مداخلت کو آں عزیز یقیناً معاف کریں گے۔ باقی اُمید ہے کہ وہ اپنے کلام سے ہمیشہ نیا دَور کو ممنون بھی فرماتے رہیں گے۔

آمنہ ولی صاحبہ رازِ ترقی "علیگڑھ"

'مصنف' انجمن مصنفین کی جانب سے تقریباً چار پانچ سال سے نکل رہا ہے، اس مختصر عرصہ میں جو اس رسالے نے ترقی کی وہ ضرور قابلِ ستائش ہے۔ اِس کے اندر تمام مضامین اساتذہ اور علیگڑھ کے کہنہ مشق ادباء کے ہوتے ہیں۔

آل احمد صاحب سرور اکبرآبادی

دسمبر کے مصنف میں "غلط زاویے" پڑھ کر معلوم ہوا کہ آپ کا "پس چہ باید کرد؟" صحیح زاویہ نہ تھا سستے چھوٹے۔ ورنہ پاسپورٹ وغیرہ کی زحمتیں سامنے تھیں۔ آپ نے بڑی سہولت پیدا کر دی۔ اِس کا شکریہ قبول فرمائیے۔

نیشنل پرنٹرس بک ڈپو!
اس بک ڈپو میں اُن تمام قیمتی اور نایاب کتابوں کو فراہم کیا گیا ہے جو "علی گڑھ
یونیورسٹی بک ڈپو" اور "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس
بک ڈپو" سے اب تک شائع ہوئی ہیں۔ کتابوں کی قیمتیں واجبی رکھی گئی
ہیں۔ کتب فروش صاحبان کو مزید رعایت دی جائے گی۔
"نیشنل پرنٹرس بک ڈپو" نے خود اپنی مطبوعات بالخصوص
بچوں کی کتابوں کا سلسلہ بھی شروع کیا ہے۔ نیز دہلی۔ اعظم گڑھ۔ حیدر آباد
لاہور۔ کراچی۔ بمبئی اور کلکتہ کے مشہور علمی اور تعلیمی اداروں اور
پبلشروں کی اردو۔ ہندی اور انگریزی کی ہر قسم کی کتابیں جمع
کی جا رہی ہیں۔ ضرورت مند اور اہل علم حضرات حسب ضرورت کتابیں
طلب فرمائیں۔ پابندی وقت کے ساتھ ہر ایک فرمائش کی تعمیل کی جائے گی۔
فہرست مفت طلب فرمائیے!
المشتہر
مفتی محمد انتظام اللہ شہابی منیجر
"نیشنل پرنٹرس بک ڈپو" یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ

دھنک

بچّوں کا باتصویر ہندی۔ اُردو رسالہ!

برشگال میں ابر و آفتاب کی بازیگری آسمان پر قوس قزح کا کیسا خوشنما منظر پیدا کرتی ہے اور بچے **دھنک** کو دیکھ کر کیسی خوشیاں مناتے اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔

علمی و تعلیمی لائن میں انکی اس خوشی و لطف اندوزی اور ساتھ ساتھ نفع خیزی کے لئے آسمانِ علم و ادب پر عنقریب ایسی ہی خوشنما **دھنک** علیگڑھ سے رُونما ہونے والی ہے۔

دھنک میں بچوں کی ذہنی تربیت، علمی ترقی اور تعلیمی دلچسپی کے رنگارنگ سامان نہایت سلیقہ سے مہیا کرنے کا انتظام کیا گیا ہے۔

مضامین کے تنوع، زبان کی سلاست، اندازِ تحریر کی دلنشینی اور بچوں کی نفسیات کے تقاضوں اور ضرورتوں کی سائنٹفک طریقوں پر تکمیل کے لحاظ سے **دھنک** نہایت بلند مقام کا مالک ہوگا۔

معنوی خوبیوں کے ساتھ ظاہری حسن و خوبصورتی کے اعتبار سے بھی **دھنک** اسم بامسمّٰی ہوگا۔ سرورق بلاک کا ۳ رنگی جاذبِ نظر اور مضامین مصوّر ہوں گے۔

اس کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہوگی کہ اس کا ہر مضمون دوہرے رسم الخط میں ہوگا۔ ایک طرف ایک کالم میں اُردو، دوسرے میں ہندی۔ اس سے بچوں کو ہندی سیکھنے اور سمجھنے میں بہت آسانی ہوگی اور وہ بچے جو صرف ہندی پڑھتے ہیں اُردو سے بھی نامانوس نہیں رہیں گے

رسالہ ماہوار ہوگا اور ہر انگریزی مہینے کی یکم کو شائع ہوگا۔ نیز ۴۸ صفحات پر مشتمل

چندہ سالانہ صرف پانچ روپے۔ ششماہی تین روپے آٹھ آنے

ملنے کا پتہ

منیجر رسالہ "دھنک" نیشنل پرنٹرس کمپنی سوسائٹی گارڈن علی گڑھ یوپی